''چہارسُو''

...... صلیب اور سائبان۔۔پروفیسر سید یونس شآرر ......

پروفیسر سید یونس شآرر صرف ایک شاعر اور ادیب ہی نہیں بلکہ ایک انقلابی ذہن اور غور و فکر کے ساتھ ساتھ انسانیت اور خلوص و محبت کے پیکر ہیں۔ ان کی سادگی اور ہر ایک کو عزت و احترام سے پیش آنا بہت ہی کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ میں نے ان کے انقلابی غور و فکر اور بے باک اور بے خوف پر اپنے احساسات کو ایک مقالہ کی شکل میں پیش کیا جو ۸۔جنوری ۲۰۰۷ء میں امریکہ کے معروف اخبار ''اردو ٹائمز'' نیویارک میں شائع ہوا جو اس کتاب میں شامل کیا گیا۔اس مقالہ کے بعد یہ کوشش رہی کہ اس انقلابی غور و فکر کی ذہنیت رکھنے والے انسان کو اجاگر کروں تا کہ یہ زمانہ اور دور میں ادب برائے زندگی کی حقیت عیاں ہو جائے۔ ۲۰۰۷ء کے بعد یہ کوشش جاری رہی مگر زمانے کے ساتھ اس کوشش میں تاخیر ہوتی رہی۔ خالق نے آخر یہ موقع عطا کیا اور پروفیسر سید یونس شآرر کی اجازت سے ان کی ادب برائے زندگی کو عیاں کرنے میں تقویت ملی۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی

اشاعت:۲۰۱۹ء، دستیابی: بلو اسٹار پرنٹنگ پریس، کرناٹک۔

...... سفر میری آنکھوں کا ......

شکیلہ رفیق کے اس انکشاف کے بعد کہ ان کی شاعری کا مجموعہ آ رہا ہے، ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ ان کے کلام کی تلاش میں گھنٹوں انٹرنیٹ پر بھٹکتا رہا۔ پھر شکیلہ نے خود میری مشکل آسان کر دی اور واٹس اَپ پر اپنی کچھ نظمیں اور غزلیں بھیجی ہیں ''پت جھڑ کے بعد'' شکیلہ ایک خوبصورت نظم ہے ، مجھے ایسا لگا جیسے میں انگریزی شاعری کے رومانوی دور میں لکھی گئی کوئی نظم پڑھ رہا ہوں۔فری ورس میں لکھی کوئی اس نظم اور ''تنہائی'' نامی نظم کو جوڑ کر پڑھا جائے تو شکیلہ ایک خلوت پسند رومانی شخصیت کے روپ میں دکھائی دیتی ہیں۔ ورڈز ورتھ کے بقول شاعری احساس کے بے ساختہ اظہار کا دوسرا نام ہے۔شکیلہ کی نظموں میں یہی بے ساختہ پن پایا جاتا ہے بلکہ کہیں کہیں تو ان کی تکنیک شعور کی رو سے جاملتی ہے۔ایک بے ساختہ بہاؤ، چونکہ شکیلہ بنیادی طور پر ایک کامیاب اور مانی جانی افسانہ نگار ہیں اس لیے قصہ گوئی کی یہ خصوصیت ان کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ اپنی ذات کے بے جان اور سکوت پرور ہلچل سے اپنی نظمیں تیاری کرتی ہیں۔ان کی کچھ نظموں کے انگریزی اور علاقائی زبانوں میں تراجم بھی ہوئے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شکیلہ کی شاعری بھی ان کے افسانوں کی طرح قابل توجہ ہے۔ میں شکیلہ رفیق کو ان کی شاعری کے اولین مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔

جاوید صبا

اشاعت:۲۰۱۹ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی، الحمد پبلی کیشنز، کراچی۔

...... مربعوں کی دائرہ کہانی ......

''عورت حقیقت سے زیادہ ایک منظر یا واقعہ ہے۔۔۔اگر اسے دیکھنے والی آنکھ پتھر کی ہے تو عورت کا وجود نمائش سے زیادہ نہیں۔۔۔ یہ پتھر کی آنکھ رکھنے والا مرد ہے جو تہذیبوں کی صدیاں گزر جانے کے باوجود عورت کو گھر کی چہار دیواری میں آرام اور سکوں کی وادیوں میں دیکھنے کا متلاشی ہے۔۔۔ جبکہ یہ سکون آج کی عورت کے لیے گھٹن بھی ہے، ظلم و ستم کا ایک نیا باب بھی جہاں اس کی آزادی گروی رکھی ہے۔۔۔مشہور شاعرہ ادا جعفری نے لکھا کہ برصغیر میں مرد کے پندار برتری نے عورت کو علم و آگہی کے قابل ہی نہیں سمجھا، مدتوں عورت احساس محرومی سے بھی محروم رہی۔۔۔احساس محرومی سے بھی محروم رہنے والی یہی عورت سیمیں کرن کے افسانوی سفر میں تلاش و دریافت اور تحقیق کا اصل موضوع ہے۔سیمیں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اپنے افسانوی سفر میں وہ پختہ اور بالغ سیاسی شعور کی انگلیاں تھام کر بڑی ہوئی ہیں۔وہ سماجی و سیاسی موضوعات پر کالم بھی لکھتی ہیں اور جب روح زیادہ مضطرب ہوتی ہے تو وادی پر خار یعنی افسانوں کو وسیلہ اظہار بنا لیتی ہیں۔کئی ایسے پہلو ہیں جہاں ان کی تحریر پاکستان کی دیگر خاتون افسانہ نگاروں سے مختلف نظر آتی ہے۔

مشرف عالم ذوقی

اشاعت: ۲۰۲۰، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: فکشن ہاؤس، لاہور

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۹،شمارہ:مارچ،اپریل ۲۰۲۰ء

رابطہ:1-537/D، گلی نمبر18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون:(92+)-51-8730633-8730433

موبائل:(92+)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

قرطاسِ اعزاز

صبا کی مدحتیں

افسانے

خطِ عنبریں

افسانے

عکسِ جمال

زہریلا انسان

ابرِ نو بہار

خاکہ

دُلار کے دھندے

آئینۂ فن

نشانِ راہ

بساطِ بشاشت

ایک صدی کا قصہ

رس رابطے

☆

جب وہ بچھڑا تھا رات باقی تھی
کٹ گئی عمر رات باقی ہے
قرطاسِ اعزاز
عذرا اصغر
کے نام

عمر کی صلیب

شبہ طراز ———— (لاہور)

پیدائشی نام: مبارک شاہی بیگم
(دادی نے رکھا تھا چونکہ والد کو اس موقع پر سرکاری ترقی ملی تھی)

اصل نام: عذرا مبارک (شادی کے بعد عذرا اصغر)

پیدائش: ۲۲ دسمبر ۱۹۴۰ء۔ محلّہ، حوض قاضی۔ دہلی، بھارت

تعلیم: بی۔اے آنرز

پہلی کہانی: فروری ۱۹۶۲ء۔ پندرہ روزہ ''نیا پیام'' لاہور

پہلا ناول: ''دل کے رشتے'' باراول ۱۹۷۰ء۔ نسیم بک ڈپو، انارکلی، لاہور
''دل کے رشتے'' باردوئم ۱۹۹۰ء۔ مقبول اکیڈیمی، اردو بازار، لاہور

دوسرا ناول: ''مسافتوں کی تھکن'' ۲۰۰۷ء۔ عزیز پبلیشرز، اردو بازار، لاہور

افسانوی مجموعے:

۱۔ ''پت جھڑ کا آخری پتہ'' باراول ۱۹۸۰ء۔ عزیز پبلیشرز، اردو بازار، لاہور
''پت جھڑ کا آخری پتہ'' باردوئم ۱۹۸۹ء۔ مقبول اکیڈیمی، اردو بازار، لاہور

۲۔ ''بیسویں صدی کی لڑکی'' ۱۹۸۹ء۔ مقبول اکیڈیمی۔ اردو بازار، لاہور

۳۔ ''تنہا برگد کا دکھ'' ۱۹۹۰ء۔ مقبول اکیڈیمی۔ اردو بازار، لاہور

۴۔ ''گدلا سمندر'' ۱۹۹۹ء۔ تجدید اشاعت گھر، لاہور

۵۔ ''یادوں کی طاق پر رکھی کہانیاں'' ۲۰۱۲ء۔ دستاویز، لاہور

۶۔ ''کھڑکی میں بیٹھا وقت'' ۲۰۱۴ء۔ دستاویز، لاہور

۷۔ ''موتیے دیاں کلیاں'' (پنجابی)۔ ۲۰۱۸ء۔ پلاک۔ لاہور

یادنگاری:

''تیری آنکھوں کے ساتھ مَیں''۔

زیرِ طبع:

''لفظوں کا کھلیان'' (مضامین کا مجموعہ)
''ادھوری ڈائری'' (ڈائری کے اوراق پر مبنی کتاب)

تالیف:

''مشرق و مغرب کے سیاسی افکار'' ۱۹۸۶ء۔ عزیز پبلیشرز، اردو بازار، لاہور

ڈرامے:

ریڈیو پاکستان لاہور سے جشنِ تمثیل میں نشر ہوا۔ اول انعام یافتہ ۱۹۸۳ء

ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے جشنِ تمثیل میں دو عدد ڈرامے نشر ہوئے۔ اول انعام یافتہ ۱۹۹۶ء

پی ٹی وی کے لئے افسانہ ''ہیڈ کواٹر'' کو ڈرامائی تشکیل دی گئی۔ سن یاد نہیں، ڈرامائی تشکیل مستنصر حسین تارڑ نے کی۔

متفرقات

اردو افسانے، پنجابی افسانے، فرخندہ لودھی کے پنجابی افسانوں کے اردو تراجم، انشایئے، خاکے، مضامین، شخصی و تنقیدی تبصرے، مذہبی مضامین، نظمیں، ہائیکو اور ماہیے لکھے جو مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوئے اور ہورہے ہیں۔

کالم نگاری

روزنامہ امروز، روزنامہ مشرق، روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ خبریں لاہور، روزنامہ اوصاف اسلام آباد۔ ہفت روزہ نکھار، راولپنڈی۔ ہفت روزہ ''آنند''، حضرو۔ ہفت روزہ ''تیسرا رُخ'' حضرو۔ ریڈیو پاکستان اسلام آباد اور روزنامہ مغربی پاکستان میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

فن و شخصیت

۱۔ افسانوں کے گورمکھی، چینی اور سندھی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ چائنا یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔

۲۔ فن و شخصیت پر ایم۔اے اردو کا مقالہ۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، قائدِ اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد۔
مقالہ نگار۔ آنسہ انجم مبین۔

۳۔ تجدیدِ نو کا توضیحی اشاریہ، جولائی ۱۹۸۹ء تا نومبر ۱۹۹۷ء، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، قائدِ اعظم یونیورسٹی اسلام آباد۔ مقالہ ایم۔اے اردو۔ مقالہ نگار آنسہ ثمینہ مرید

۴۔ بہت سے معروف ناقدین کے توضیحی، شخصی اور تنقیدی مضامین۔ انٹرویوز۔

۵۔ گوشہء عذرا اصغر، نیشنل آرکائیوز پاکستان، اسلام آباد

ادارتی خدمات:

ماہنامہ ''نور و نار'' لاہور ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۱ء
ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۵ء
ذاتی مجلّہ ماہنامہ ''تجدیدِ نو'' ۱۹۸۹ء تا ۲۰۰۲ء
سہ ماہی ''تجدیدِ نو'' ۲۰۰۶ء تا حال
صدر بزمِ تجدید۔ اسلام آباد، لاہور، کراچی

اعزاز:

ادبی خدمات پر ماہنامہ تخلیق کا ''تخلیق ایوارڈ'' ۲۰۱۷ء

☆

خاکہ

''اردوادب کا بازیگر''

عذرااصغر

''جب کچھ نہیں تھا تب بھی وہ تھا۔ جب کچھ نہیں ہوگا وہ تب بھی ہوگا۔''

''ساری حمد وثنااس کے لیے جوسزاوارِحمد وثنا ہے۔سب تعریفیں اس کے لیے جوخالقِ کائنات ہے۔صدشکرکہ اس نے ہمیں اپنی بہترترین مخلوق بنایا۔''

میں اپنی زندگی کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ جب میں نہیں تھی۔اس دنیامیں آنے کا ابھی میرا شائبہ بھی نہیں تھا۔ممتازمفتی تب بھی تھا۔ نہ یہ کہ تھا بلکہ لکھ رہا تھا، کہانیاں بُن رہا تھا اور ملک کے بڑے بڑے پرچوں میں چھپ رہا تھا۔اب جبکہ میں اس دنیامیں موجود ہوں، ممتازمفتی کا طوطی بول رہا ہے۔ ہرطرف اس کے نام اوراس کام کی گونج ہے۔ میں یقین رکھتی ہوں کہ میں جب نہیں ہوں گی ممتازمفتی کے نام کی جھنکارتب بھی سنائی دے رہی ہوگی۔ اگر چہ اس کا جسدِ خاکی اس دنیا سے اٹھ چکا ہے مگر اس کا نام اوراس کا کام باقی رہنے والا ہے وہ باقی رہے گا۔

ممتازمفتی صوفی تھے یانہیں مگرصوفی منش یقیناً تھے۔ان کی طبیعت میں فقیری تھی،سادگی تھی،انکسارتھا۔ممتازمفتی جتنے بڑےادیب تھےاس سے کئی گنابڑے انسان تھے۔ایساانسان کہیں صدیوں میں ایک آدھ ہی پیدا ہوتا ہے۔وہ اپنا آپ جتنا کھول کھول کر دوسروں کے سامنے رکھتے تھے اتنا ہی دوسرے ان کے قدموں تلے پلکیں بچھاتے جاتے تھے۔ وہ سب کے دوست تھے۔سب کے قریب تھے۔سب کے دلوں میں بستے تھے۔سب کی دھڑکنوں میں دھڑکتے تھے۔مفتی جی بناڈگڈگی بجائے بندرنچاتے تھے۔وہ جدھرجاتے مجمع ان کے پیچھے چلتا جاتا۔ممتازمفتی کی دوستی اورتعلق داری کا پیمانہ محبت تھی۔دولت،اسٹیٹس ہرقسم کا گلیمران کی نظرمیں ہیچ تھا۔وہ بلا تخصیص سب سے ملتے تھے۔ان کے ہاں نہ عمر کی تخصیص تھی نہ تذکیروتانیث کی اورنہ معاشرتی اسٹیٹس کی۔وہ سب سے یکساں رویہ رکھتے تھے۔کبھی کسی کوکسی پرفوقیت نہیں دیتے تھے۔جوسامنے آتا اسے محبت سے گلے لگاتے اورحال احوال پوچھتے۔میں نے اکثرشوہروں سے اپنی ادیب بی بیوں کوتنبیہ کرتے سنا تھا۔

''خبردارجوتم مفتی جی کے گلے لگیں۔''

لیکن مفتی جی کے گلے لگانے میں اگرکسی کو بزرگانہ شفقت نظرنہیں آتی تھی توانہیں آج کے نوجوانوں کیا ادھیڑعمروں جیسی بھوکی،ننگی وارفتگی بھی دکھائی نہیں دی ہوگی۔بس ایک مخلصانہ اپنائیت تھی۔ برابرکی سطح پرملنا جلنا تھا۔ان کے ہاتھ اورنگاہ کبھی بھٹکے نہ تھے۔

جب نوجوان ممتازمفتی اپنے افسانوں کا فسوں دھیرے دھیرے انجانے طورپرہندوستان کے چہاراطراف بکھیر رہا تھا تب ہندوستان کی راجدھانی کے ایک گوشے میں اس بچی کا ورود ہوا جس کی زندگی کا قافلہ جب۱۹۶۲ء۔۶۳ء کے پڑاؤپرپہنچا تو اس بچی کہ نام جس کا عذرااصغرٹھہرا تھا اورکہانی کے میدان میں قدم دھرچکی تھی۔ ممتازمفتی کے ساتھ ملکی وغیرملکی (بھارتی) رسائل وجرائد میں چھپ رہی تھی۔کسی بھی نوآموزلکھنے والے کے لیے یہ مقام قابلِ فخروانبساط ہوتا ہے۔میرے لیے بھی تھا کہ ان دنوں ممتازمفتی، قدرت اللہ شہاب، ضمیراحمد، ابوالفضل صدیقی، رحمٰن مذنب اورمشتاق احمد یوسفی کے ساتھ میرے افسانے بھی خصوصیت سے بھارتی جرائد''چترا ویکلی'' بمبئی اور''بیسویں صدی'' دہلی میں چھپ رہے تھے۔اس فخر کے باوجود میں ممتازمفتی سے مرعوب تھی، متاثرتھی اور خائف بھی۔جانے کیسے ہوں گے؟ مغرورسے، لئے دیئےقسم کے آدمی۔افسانے پڑھنے کے علاوہ ممتازمفتی سے کوئی رابطہ نہ تھا،کوئی تعارف نہ تھا۔''تخلیق'' کی ایڈیٹرشپ کے دوران ڈرتے ڈرتے میں نے خط لکھ کران سے افسانہ مانگا۔ بیشک میں ایک نہایت معقول ادبی مجلّے کی ایڈیٹرتھی اورادیبوں کوخطوط لکھ کران سےان کی نگارشات طلب کرنا میرے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔لیکن ممتازمفتی کو خط لکھتے ہوئے ایک گھبراہٹ سی طاری تھی۔پھرخودکوتسلی دیتے ہوئے سوچا۔

''چلو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا یہی نا کہ جواب نہ دیں گے۔ مجھے کم ازکم ان کےغروراوربدمزاجی کا اندازہ توہوگا۔''

لیکن میرے خدشات کے برعکس جلدان کا جواب بمع افسانہ آ گیا۔ میرے لیے خط کی عبارت کافی حیران کن تھی۔ان کی یہ پہلی چٹ آج بھی میری فائل میں موجود ہوگی۔لکھا تھا:

''عذرا۔

تو نے افسانہ مانگا تھا۔بھیج رہا ہوں۔ دیکھ لے اچھا لگے تو چھاپ لے۔ممتازمفتی''

میرے لیے یہ طرزِتخاطب عجیب ہی تھا۔ میں نے غالب کے خط پڑھ رکھے تھے اوراس سے پہلے طالبِ علمی کے ابتدائی عرصے میں''اردو خط و کتابت''،''خط لکھنا سیکھئے'' جیسی کتابیں بھی۔ غالب کے خطوط نے خط نویسی کو ایک منفرد جہت عطا کی تھی۔مگرممتازمفتی توبےتکلفی اورسادگی کی انتہا تک جا پہنچے تھے۔وہ جیسے بولتے تھے ویسے ہی لکھتے تھے۔ جس طرح ان کے خط لکھنے کا اپنا ایک انوکھا اندازتھا اسی طرح ان کاتعریف کرنے کا بھی ایک طریقہ تھا۔ جسے سن کرآدمی خوش ہومگر بلش نہ ہو۔دل رکھنے کوکی گئی تعریف بھی سچ لگےلیکن اتراہٹ نہ ہو۔بس ایک نارمل سی بات۔جیسےکوئی کہہ دے:

''آج موسم کتنا سہانہ ہے''

''اف! یہ منظرکیا خوبصورت ہے۔''

میں اسلام آباد آئی توانجانے میں ہی بس آہستہ آہستہ مفتی جی سے

قربت بڑھنے لگی۔ ''تجدید'' کے معاملات میں اکثر ان سے مشورہ مانگ لیتی۔ کسی کے بارے میں جاننا چاہتی تو پوچھ لیتی۔ وہ اتنی اپنائیت اور سیاق وسباق کے ساتھ بات سمجھاتے کہ مرضی کے خلاف ہوتے ہوئے بھی تسلی ہو جاتی۔ ایک دفعہ ''تجدید'' کا اداریہ لکھتے ہوئے متنازعہ سا موضوع زیرِ غور تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اس موضوع پر لکھنا چاہیے یا نہیں۔ میری طبیعت کا نڈر پن لکھنے پر اکساتا تھا اور مصلحت قلم پکڑتی تھی۔ میں فطرتاً مصلحت پسند ہوں بھی نہیں۔ کبھی کبھی مجبوراً بننا پڑ جاتا ہے۔ میں نے مفتی جی کو فون کیا۔ ساری بات سن کر انہوں نے بڑے رسان سے موضوع کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انتہائی شفقت سے زمانے کے اونچ نیچ سمجھائے اور نہ یہ کہ زیرِ غور موضوع پر نہ لکھنے کا مشورہ دیا بلکہ سختی سے منع کیا۔ مفتی جی اس لیے مجھے ہمیشہ سے زیادہ اچھے لگے۔ زیادہ قریب، زیادہ شفیق۔ میں کتنے ہی دن ان کی اپنائیت پر پھولی پھولی پھرتی رہی۔

مجھے بات کرتے ہوئے یا سنتے ہوئے سلام کرنے کی عادت ہے۔ میں مذہبی ہوں یا نہیں لیکن کچھ باتیں سختی سے میرے عقائد میں شامل ہیں۔ مفتی جی یک دم بات کرنے کے عادی ہیں۔ ان کے خیال میں سلام وغیرہ قسم کی چیز رسمی باتیں تھیں۔ مفتی جی رسومات وروایات شکنی کے قائل تھے۔ جب میں انہیں فون ملا کر السلام علیکم کہتی تو لگتا جیسے انہیں کوفت سی محسوس ہوئی ہے مگر جواباً بامرِ مجبوری ہی سہی وعلیکم السلام ضرور کہتے۔ خود فون کرتے تو اپنے انداز سے بات شروع کرتے۔

''عذرا کل آ سکے تو فلاں جگہ آ جانا۔۔۔ فلاں تقریب ہے۔۔۔'' یا

''میرے گھر ''رابطے'' کا اجلاس ہے۔ تو آنا۔۔۔'' وغیرہ۔

ایک دفعہ میں نے کہا ''مفتی جی آپ کا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں'' بولے ''آ جا'' میں نے پوچھا ''کب؟'' کہا ''جب تیرا جی چاہے۔'' اس دن ٹیپ آن کئے میں کئی گھنٹے مفتی جی کے ساتھ خزاں رسیدہ، ٹُنڈ مُنڈ درختوں تلے بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ وہ اپنی جوانی کے قصّے سنا رہے تھے۔ اپنے کچّے عشق کی وارفتگیاں اور بچپن کی شوخیاں، اپنے ساز گار رونا ساز گار حالات سے پردے اٹھا رہے تھے۔ مفتی جی پردے ڈالنے کے عادی بھی کب تھے۔ گفتگو ٹیپ ہو رہی تھی درمیان درمیان میں مجھ سے میرے بارے میں پوچھتے جاتے۔ ایک دم میں نے کہا۔

''مفتی جی جانے کیوں میرا جی چاہا ہے کہ آپ میرا بھی ایک خاکہ لکھیں۔ حالانکہ کسی کو ایسا کچھ کہنا یا فرمائش کرنا میرے مزاج کے خلاف ہے مگر آپ سے فرمائش کر رہی ہوں۔''

بولے۔ ''تیرا خاکہ نہیں لکھا جا سکتا۔''

میں نے پوچھا ''کیوں بھلا؟'' کہنے لگے:

''تیرے اندر ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں۔ نہ کوئی چپ پٹا عشق نہ اور کوئی ایسی ویسی بات۔ بس شرافت ہی شرافت۔ شائستگی کی ماری ہوئی۔ تو تو بابا گوڈے گوڈے باپ کے عشق کے شیرے میں لت پت ہے۔ ہر بڈھا جوان تجھے باپ سمان دکھتا ہے۔ اسی کا عکس نظر آتا ہے تجھے سب طرف۔ تیرا خاکہ نہیں لکھا جا سکتا۔''

لمحہ بھر کو مجھے اپنے اوپر بڑا ترس آیا۔

وقت کافی گزر گیا اور سائے پھیلنے لگے تو ہم نے کرسیاں دھوپ میں کھسکا لیں۔ مفتی جی بولے۔

''کُڑیئے! پیاس ویاس لگے تو دروازہ ہے۔ اندر جا کے پانی پی لینا۔ میں نے تجھے چائے وائے کو نہیں پوچھنا۔''

مجھے واقعی پیاس لگ رہی تھی۔ میں اندر گئی اور پانی پی آئی۔ میرے ساتھ ہی مفتی جی کی بیگم باہر نکل آئیں۔ مفتی جی سے کہا ''کھانا کھا لیں'' مفتی جی چائے کو نہیں پوچھتے تو رسماً کھانے کو کیوں پوچھیں گے اور پھر گھر پر میرا انتظار بھی ہو رہا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے اجازت چاہی۔ مفتی جی چپ رہے۔ جیسے کہہ رہے ہوں ''اچھا تو پھر جا'' مگر ان کی بیگم تیزی سے بولیں۔ ''نہیں نہیں! آپ ایسے کس طرح جا سکتی ہیں۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے آپ کھانا کھا کر جائیں گی''

میں نے کہا ''مفتی جی کہتے ہیں آنے والوں کو پانی کو بھی نہیں پوچھتا''

وہ بولیں ''یہ نہ پوچھیں مگر ہم تو مہمان کو ایسے نہیں جانے دیں گے''

مفتی جی اپنی بے ساختہ ہنسی ہنسے اور بولے۔

''میں تو ہُن وی نئیں روکدا۔ ایہنے تیری خاطر داری کیتی اے۔ روٹی کھانی ہے تو کھالے نئیں تے جا۔۔۔''

میں نے کہا ''تب تو میں ضرور کھاؤں گی۔''

اس روز مفتی جی اور ان کی بیگم کے ساتھ میں کھانا کھاتی اور باتیں کرتی رہی۔ اور وہ دن مفتی جی کی سالگرہ کا دن تھا۔ دن ڈھل چکا تھا اب رات ہو چلی تھی اور پیدائش کا اصل دن گیارہ ستمبر بھی کب کا گزر چکا اب اٹھائیس اکتوبر گزرتا جا رہا تھا۔ پریس کلب کے ہال میں مہمان جمع تھے یا یوں کہیے کہ میزبان اور استقبال کرنے والے مداحین، مہمانِ خصوصی مفتی جی کا انتظار تھا۔ مفتی جی بیمار تھے۔ میزبانوں اور مدعین کے دل میں تشویش تھی۔ چہروں پر انتظار کے رنگ تھے اور دلوں میں دعائیں۔ دھڑکنیں تیز تھیں معاً ہلچل ہوئی ''مفتی جی آ گئے۔ مفتی جی آ گئے۔'' مفتی جی ہال میں داخل ہوئے تو منتظرین سروقد اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اپنی سدا بہار مسکراہٹ کے ساتھ کئی سہاروں کے درمیان اور تالیوں کی گونج میں چلے آ رہے تھے۔ کیمرے ٹھکا ٹھک ہوئے۔ روشنیاں جلنے بجھنے لگیں۔ مفتی کے پہلو میں ڈاکٹر ابدال بیلا سہارا دئے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بیلا انجکشن لگا کر یہاں تک لائے ہیں اور ان کے پاس مزید انجکشن اور ادویات بھی موجود ہیں۔ اپنی کامیابی پر ڈاکٹر ابدال بیلا کا چہرہ فخر وانبساط کی کیفیت سے تمتما رہا تھا اور ہم سب مفتی جی سے ایسے مل رہے تھے جیسے برسوں بعد ان سے ملاقات ہو رہی ہو۔ یا یہ آخری ملاقات ہو۔ جیسے مفتی جی کسی لمبے سفر پر جا رہے ہوں۔ سب ان کی ایک جھلک دیکھ لینے کو بے قرار تھے۔

''ارے بھئی سامنے سے ہٹو۔''

باقی صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

اردو ادب میں بے شمار ایسے ادیب شاعر گزرے ہیں جن کی آمد بڑی دھوم دھام اور گھن گرج سے ہوئی مگر قلمی اوصاف کی قلّت و کمیابی کے باعث اُن کی روانگی کا کسی کو علم تک نہ ہوا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بلا کسی شور شرابے یا ہنگامہ بھرپا کیے بغیر ادبی برادری میں داخل ہوئے اور دھیمی آنچ پر قلمی ہانڈی چڑھا کر نتائج کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

محترمہ عذرا اصغر کا شمار انہی صبر طلب اور نفس مطمئنہ کے حامل قلمکاروں کی صف میں نمایاں طور پر ہوتا ہے۔ محترمہ عذرا اصغر نے صلے اور ستائش کی دوڑ میں شامل ہونے کے بجائے معیار اور مقدار کو مطمع نظر بنائے رکھا جس کے سبب اردو ادب میں اُن کی شناخت ایک سنجیدہ اور بُردبار ادیبہ کے طور پر نمایاں تر ہوگئی۔

آج کی نشست میں ہم نے چھ دہائیوں پر مشتمل محترمہ عذرا اصغر کے تخلیقی، تحقیقی اور علمی کارناموں کو یکجا کر کے ایک مربوط دستاویز پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس کی مدد سے محترمہ کے قاری، ناقد اور محقق کو ہر طرح کی سہولت و آسانی دستیاب رہے۔ ہماری کامیابی یا ناکامی ہمیشہ کی مانند اس بار بھی آپ کی رائے سے مشروط ہے۔

گلزار جاوید

☆ بزرگوں کو یاد کرنے کا اس سے بہتر موقعہ مشکل سے ہاتھ لگے گا کیوں نہ گفتگو کا سلسلہ اُنہیں سے شروع کیا جائے؟

☆☆ میرے بچپن کا تمام عرصہ بزرگوں کے ساتھ گزرا۔ میرے دادا، دادی بہت شفیق ہستیاں تھیں۔ میں گھر میں تنہا بچی تھی۔ شاید اس لیے میرے لاڈ بہت اٹھتے تھے۔ وہ لوگ اب بھی مجھے یاد آتے ہیں۔ انہیں کلام مجید پڑھ کر بخشتی رہتی ہوں۔ اس سے بہتر طریقہ یا ذریعہ ان کے پیار کا صلہ دینے کا اور کیا ہوسکتا ہے؟

☆ چٹکتی چاندنی اور مہکتی کلیوں کے بارے بہت سنا ہے۔ آپ ہمیں ٹھمکتے بچپن کی یادوں میں شریک کیجیے؟

☆☆ ہمارے گھر کا زنان خانہ بہت بڑا تھا۔ تین اطراف میں دالان تھے جن کے ستونوں پر گلابی اور سفید رنگ کے گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ چوتھی سمت ڈیوڑھی تھی۔ صحن کے بیچ و بیچ ایک کشادہ قطعہ پودوں کے لیے مخصوص تھا جسے چمن کہا جاتا تھا۔ چمن میں امرود اور فالسے کے پیڑ تھے۔ مہندی، چنبلی، موتیا اور دیگر پھول دار پودے تھے۔ پھول پھلداری کا شوق دادی کو تھا وہی چمن کی نگہداشت کرتی تھیں اور تمام کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھیں۔ مردانہ حویلی زنان خانے سے زیادہ کشادہ تھی۔ حویلی میں قسم قسم کے پیڑ تھے پھل دار درخت تھے۔ مجھے صرف بیروں سے دلچسپی تھی۔ تین چار قسم کی بیریاں تھیں۔ میرے کئی افسانوں میں ان گھروں کا ذکر ہے۔

☆ مکتب، مدرسہ، سکول، کالج سے جڑی یادیں اور باتیں کرنے کا اس سے بہتر موقعہ کیا ہوسکتا ہے؟

☆☆ میرے استاد دادا ابّا تھے۔ وہ مجھ سے پابندیٔ وقت کے ساتھ تختی لکھواتے، املا لکھواتے اور سلیٹ پر حساب سمجھاتے اور اردو پڑھاتے تھے۔ چنانچہ بہت بچپن میں ہی میں تیسری جماعت کی قابلیت حاصل کر چکی تھی۔ مجھے مولانا اسماعیل کی نظمیں بہت پسند تھیں۔ بعض اب تک یاد ہیں۔ ہمارے قصبے میں شاید لڑکیوں کا کوئی اسکول تھا ہی نہیں۔ میری پھوپھیاں بھی گھر کی لکھی پڑھی ہوئی تھیں۔ البتہ جب ننھیال جاتی تو ایک مدرسے میں جانا شروع کر دیتی۔ جو ایک رشتے کے ماموں نے اپنی بیٹھک کے چبوترے پر بنایا ہوا تھا۔ میں صبح کو اپنی ٹاٹ کی بوری اور اماں کے ہاتھ کا سلا ہو بستہ اٹھا کر ماموں شمس الحسن کے مدرسے میں جاتی تھی۔ قرآن شریف اماں پڑھاتی تھیں اور ننھیال میں خالہ۔ میں وہاں بڑے گھر کی بچی سمجھی جاتی تھی۔ میرے نانا، نانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بس ایک ماموں تھے اور بیوہ خالہ۔ خالہ اصول کی بڑی پابند اور سخت مزاج تھیں۔ انہوں نے مجھے نماز سکھائی اپنے ساتھ پابندی سے نماز پڑھواتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ میرے سب بزرگوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

☆ ہجرت کے حوالے سے آپ کی یادوں میں کیا کچھ باقی بچا ہے؟

☆☆ سن کونسا تھا یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ میں اپنی پھوپھی کے گھر گئی ہوئی تھی مچھلی شہر۔ وہاں پھوپھا جان ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے بچوں کو ماسٹر صاحب ٹیوشن پڑھانے آتے تھے وہ ہندو تھے۔ میں بھی ان سے پڑھنے لگی تھی۔ ایک دن باہر سے کوئی جلوس گزر رہا تھا۔ نعروں کی آواز سن کے ماسٹر صاحب دیکھنے کو نکلے مگر پھر واپس نہیں آئے۔ اس کے بعد میں اور اماں بڑی بہن کے گھر آ گئے۔ آپا کی شادی میرے چھٹپن میں ہوگئی تھی۔ وہ مجھ سے چودہ سال بڑی تھیں اور شادی کے وقت ساتویں کلاس میں پڑھتی تھیں۔ ان کی ایک چھوٹی سی بچی تھی ارجمند شاہین۔ شہروں میں ہنگامے جاری تھے۔ دیہات نسبتاً محفوظ تھے۔ البتہ آس پاس کے علاقوں سے

بلّے کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔خوف و ہراس تھا۔خبر یہ بھی آئی تھی کہ بلوائیوں کو سبز پوش نظر آتی ہے تو بھاگ جاتے ہیں۔ہمارے اور دیگر گھروں میں مردرات کو باری باری پہرہ دیتے تھے۔عورتوں سے کہا گیا تھا کہ خطرہ ہو تو بچیوں کو کنوئیں میں پھینک کر خود بھی کود جانا۔بچیوں میں،میں اور ارجمند ہی تھے مجھے رات کو اس خوف سے نیند نہیں آتی تھی۔کنواں آپا کے گھر میں تھا۔آپا اور دولہا بھائی کے ساتھ ہی ہم نے ہجرت کی۔میرے دونوں بھائی،والد اور سوتیلی ماں پہلے ہی پاکستان آچکے تھے اور لائل پور(اب فیصل آباد)میں والد نے مکان بھی الاٹ کروالیا تھا۔

☆ پاکستان آمد اور قیام کے حوالے سے معصوم بچی کے احساسات، گزرتے وقت کے ساتھ پیش آمد تجربات کا احوال بھی نئے لکھنے والوں کو بہت کچھ مہیا کرسکتا ہے؟

☆☆ پاکستان میں آنے کے بعد ہمارا پہلا قیام لاہور والٹن میں ہوا خالہ زاد بہن کے گھر۔بہنوئی ایئر فورس میں ملازم تھے۔ہم لوگ بائی ایئر آئے تھے۔پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو۔ہم کھتولی سے بس میں دہلی طرح پہنچے تھے۔بھارت میں یوم آزادی منایا جارہا تھا۔ہم لوگوں کا سفر خوف کے عالم میں گزرا تھا۔دوروز بعد ہم لائل پور آگئے۔نیا ملک اور نئے شہر مجھے بہت اچھے لگے۔گلی میں گزرتے سبزی والے آواز لگاتے۔گونگلو،بتاؤ،گنڈے،تھوم نئے لفظ بہت مزے کے لگتے۔نوکر سے ان کا مطلب پوچھتی۔چاقو کو کاچو اور قینچی کو کینچی کہنے پر ڈانٹ پڑتی تو میں جواز پیش کرتی کہ ق بولتے ہوئے حلق درد کرتا ہے۔بھائی کے ایک دوست نے ہمیں کھانے پر بلایا تو پرات میں چاول آئے سب نے ہاتھ سے پرات میں کھانا شروع کردیا۔بڑا عجیب لگا لیکن کھانا پڑا۔رفتہ رفتہ پنجاب کا ماحول بدلتا گیا۔ہم نے بہت کچھ پنجابیوں سے سیکھا اور بہت کچھ پنجابیوں نے نئے آنے والوں سے حاصل کیا۔ہمارے ہاں گھر میں کپڑے دھونا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر یہاں عام بات تھی۔ہم یعنی مہاجر لوکل لوگوں سے گھل مل گئے۔پنجاب نے ہمیں خوش آمدید کہا۔میں نے تو پنجابی لڑکی کو اپنی بہو بنایا اور اب وہ اردو کے ایسے ایسے محاورے استعمال کرتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

☆ اصغر مہدی صاحب سے ملاقات اور شادی کا مختصر احوال بھی گفتگو کو دلچسپ بنانے میں مددگار ہوسکتا ہے؟

☆☆ نکاح سے پہلے تک مجھے اصغر مہدی کا نام تک معلوم نہیں تھا جبکہ والد صاحب نے تحریری طور پر مجھ سے اجازت لی تھی۔بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ مجھے صرف مطلع کیا تھا۔ابّا نے لکھا تھا کہ میں نے تمہارا رشتہ طے کردیا ہے امید ہے تم مداخلت نہیں کروگی؟ میرے گھر والے جانے کیوں مجھ سے خائف رہتے تھے حالانکہ مجھے کوئی پسند بھی ہوتا تو میں ابّا کا فیصلہ رد نہ کرتی۔شاید میں کچھ باغی طبیعت کی مالک تھی۔میرے ایک تایا انڈیا سے آئے وہ کانگرسی تھے اور اسمبلی کے ممبر تھے۔کرنل بشیر حسین زیدی۔ان سے گھر والے بڑے مرعوب تھے۔مجھے تاکید کی گئی کہ ان کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کروں مگر مجھ سے رہا نہیں گیا۔تایا ابّا بڑی خوش دلی سے مجھے جواب دیتے رہے۔ابّا کو مخاطب کر کے کہا''بھائی!بچی ماشاء اللہ بہت ذہین ہے اسے اچھی تعلیم دلوانا۔بعد میں میں نے ضد کی کہ میں میٹرک کرنا چاہتی ہوں مگر مجھے پڑھنے نہیں دیا گیا۔جبکہ مجھے اپنی کوشش سے انگلش کی بھی شدھ بدھ ہوگئی تھی۔

☆ کہانی کی پہلی کسک آپ نے کب اور کس طور محسوس کی نیز فوری ردِ عمل کس طرح کا تھا؟

☆☆ بچپن میں امّاں سے کہانی سن کر سوتی تھی۔کورس کی کتابوں میں بھی کہانیاں پڑھی تھیں۔امّاں جو کہانی سناتی تھیں وہ شہزادیوں اور پریوں کی ہوتی تھیں۔اچھی لگنے کے باوجود مجھے غیر حقیقی لگتی تھیں۔لہٰذا میں نے کہانی لکھی جو والدین سے متعلق تھی۔بار بار وہ کہانی لکھتی اور پھاڑ دیتی تھی۔بڑی ہوئی تو میرے نام ماہنامہ''زیب النساء''جاری کرا دیا گیا۔بھائی ادبی کتابیں لاتے تھے۔گھر میں شمع دہلی اور بیسویں صدی دہلی رسالے آتے تھے جنہیں میں بھی پڑھ لیتی تھی۔البتہ منٹو اور عصمت چغتائی کے پڑھنے پر پابندی تھی۔مجھے سب سے پہلے شفیق الرحمٰن اور کرشن چندر نے متاثر کیا۔نسیم حجازی اور ایم اسلم کو بھی پڑھا۔''چشم لیلیٰ''غالباً ایم اسلم کی تھی مجھے بہت پسند تھی۔اس میں بڑے اچھے مناظر کی نقشہ کشی تھی۔چنانچہ میں نے اچھی بھلی کہانی لکھی ااور اسے ریڈیو کے نیچے چھپا دیا۔وہ بھائی نے دیکھ لی۔مذاق بھی اڑا اور ڈانٹ بھی پڑی۔لیکن میں افسانہ لکھتی رہی اور قلمی دوست نوشابہ کو ہارون آباد پوسٹ کردیتی۔نوشابہ ہارون آباد میں ٹیچر تھی۔میری دوسری قلمی دوست مہربانو تھی وہ بنگالی تھی اور خواجہ شہاب الدین کے بیٹے سے بیاہی تھی۔مہربانو سے میں اپنی شادی کے بعد ملی جب وہ کراچی میں رہتی تھی۔بڑی محبِ وطن لڑکی تھی۔

☆ کہا جاتا ہے کہ میلان آپ کا شاعری کی جانب تھا مگر اصغر مہدی صاحب نے قطعی طور پر ایک نیام میں دو تلواریں رکھنے سے معذرت کر لی تھی؟

☆☆ شاعری سے مجھے صرف اتنا لگاؤ تھا اور ہے کہ جو شعر اچھا لگتا ہے اسے ڈائری میں نوٹ کر لیتی ہوں۔ایک پرانی اور خستہ حال ڈائری مجھے اب ملی تو میں نے شعراء کے مختصر تعارف کے ساتھ کتاب مرتب کی جو زیرِ طبع ہے۔نام ہے ''ادھوری ڈائری''شعر کہنے کی اہلیت میں اپنے اندر محسوس ہی نہیں کرتی۔البتہ اسلام آباد کے دوران قیام میں جب میں ماہنامہ''تجدید''نکالتی تھی تو خاور اعجاز کی ہائیکو کی کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے محسوس ہوا کہ یہ تو میں بھی لکھ سکتی ہوں۔کچھ ہائیکو لکھے اور ڈاکٹر بشیر سیفی کو دکھائے۔انہوں نے تعریف کی۔شمع خالد نے ریڈیو مشاعرے میں بھی پڑھوائے۔جمیل ملک صاحب نے لکھتے رہنے کی تاکید کی۔جاپانی ایمبیسی کے مشاعروں میں بھی شرکت کی بعض رسائل میں ہائیکو اور ماہیے چھپے بھی۔مگر میرا رجحان بن نہیں سکا۔لاہور آ کر ایک ہائیکو مشاعرے کی صدارت بھی کی۔اب پاکستان میں ہائیکو کا چرچہ بھی نہیں رہا۔جبکہ محسن بھوپالی مرحوم، وضاحت نسیم،خاور اعجاز اور شبہ طراز کی ہائیکو کی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔

شاعری کے معاملے میں اصغر صاحب نے صرف مشورۃً کہا تھا کہ جو کام تم کر رہی ہو وہی کرتی رہو۔

☆ سنا ہے! ابتدائی ایام میں کہانی لکھ کر آپ اصغر صاحب کو سونپ دیتی تھی جس کی نوک پلک درست کرنے کے بعد اصغر صاحب اشاعت کے لیے ارسال کرتے تھے؟

☆☆ الحمدوللہ افسانہ نویسی میں میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ کہانی لکھ کر اصغر کو سناتی ضرور تھی جیسے وہ غزل کہہ کر مجھے سناتے تھے۔ یوں اصغر اچھی نثر لکھ لیتے تھے۔ ریڈیو کے لیے فیچر بھی لکھتے رہے ہیں۔

☆ کئی شقی القلب تو مہدی صاحب کو آپ کا گھوسٹ رائٹر بھی کہا کرتے تھے؟

☆☆ کہنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ حقیقت خود ہی روشن ہو جاتی ہے۔ اگر یہ سچ تھا تو اب کون لکھ کر دیتا ہے؟

☆ پروفیسر مشکور حسین یاد نے خواتین بلخصوص شادی شدہ کے حوالے سے جن خدشات کا اظہار کیا ہے اُس کی روشنی میں آپ کے تجربات واحساسات نوارداِن قلم کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں؟

☆☆ مشکور صاحب کے نظریات کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ خواتین کو تو قدم قدم پر احتیاط درپیش ہوتی ہے۔

☆ افسانوی شعور آپ کا منٹو، عصمت اور واجدہ تبسم کے سائے میں بلوغت کو پہنچا۔ راستہ آپ نے توبتہ النصوح کا اپنا لیا؟

☆☆ مجھے شفیق الرحمٰن کا اسلوب اور کرشن چندر پسند ہیں۔ یوں جن جن قلمکاروں کو انسان پڑھتا ہے ان سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ جہاں تک اسلوب اپنانے کی بات ہے وہ میں نے کسی کا نہیں اپنایا۔ میرا اپنا ایک اسلوب ہے واجدہ تبسم نے مجھے کبھی اپیل نہیں کیا۔ عصمت اور منٹو کو بہت بعد میں جا کر پڑھا اور سراہا بھی۔ مگر ان کے پیٹرن پر لکھنا کبھی پسند نہیں کیا۔

☆ ہر آدمی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی سے متاثر ہو کر ہی کچھ بنا کرتا ہے۔ آپ کی دسترس میں حسین اُسلوب کا پیالہ کب اور کس طور آیا؟

☆☆ جواب شاید دیا جا چکا ہے تاہم یہ واضح کر دوں کہ اسلوب وقت کے ساتھ ساتھ ترقی پاتا چلا جاتا ہے اور رجحان وقت کے ساتھ بدلتا بھی ہے۔ کچھ لوگ جنسیات پر لکھنا پسند کرتے ہیں۔ کچھ تشدد آمیز کہانیاں لکھتے ہیں۔ میں نے عموماً بنتی، مٹتی قدر کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی میرا نصب العین اور مطمع نظر ہے۔ البتہ نصیحت آمیز کہانی میں نے نہیں لکھی۔ کسی تحریر سے کوئی سبق حاصل کر لے تو اس کی مرضی مگر میری شعوری کوشش نہیں ہے۔

☆ وہ کون سی تشنہ خواہشات ہیں جن کے پورا نہ ہونے پر آپ انسانوں سے نا اُمید ہو بیٹھی؟

☆☆ باپ کی محبت نہ پا سکنا۔

☆ خاتون کسی عمر، کیفیت اور مزاج کی ہو، ان دیکھے محبوب کا پیکر تراشنا اور اُس کو خوابوں میں بسائے رکھنا، تیسری دنیا تک کیوں محدود ہے؟

☆☆ تیسری دنیا کی خواتین کو وہ آزادی حاصل نہیں رہی جو یورپ کی عورت کے پاس ہے۔ اس لیے مشرق کی عورت صرف خواب ہی دیکھ سکتی ہے اور وہ دیکھتی ہے جس کی تعبیر کبھی نہیں ملتی۔ لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے اور کھلے ماحول کے گھرانوں میں لڑکی کی پسند کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ مگر یہ کم کم ہی ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو مجھے اپنے مسائل سے ہی فرصت نہیں رہی بس باپ کا پیکر تراشتی رہی۔ جب میں ایف اے کا امتحان دے رہی تھی تو جو ماسٹر تھے جب وہ اپنے ہاتھ سے کتاب پر لکھتے تھے تو مجھے ابّا کے ہاتھوں کی شبیہہ لگتے تھے اور میں ڈسٹرب ہو جایا کرتی تھی۔ میرا یہ المیہ ابھی تک ہے۔ ان کے بعد میں نے ٹیوشن پڑھنا ہی چھوڑ دی۔ یہاں بتاتی چلوں کہ میں نے شادی کے بعد فاضل اردو کا امتحان پاس کیا جب میں دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ میٹرک اور ایف اے بچوں کے ساتھ کیا۔ بی اے ایک پوتے کی دادی بننے کے بعد کیا۔ ایم اے میں داخلہ لینا چاہتی تھی اوپن یونیورسٹی میں مگر نظیر صدیقی صاحب نے مشورہ دیا کہ صرف مطالعہ وسیع کریں۔ جاب نہیں کرنا تو ایم اے کر کے کیا کریں گی۔ اوپن یونیورسٹی میں اس وقت ایم اے ہوتا بھی نہیں تھا۔ میرے اوپر ایم اے اور ایم فل کے تین تھیسسز ہو چکے ہیں۔ اللہ کا کرم ہے۔

☆ آپ کی کہانیوں کے ہیرو اکثر ہوس کار اور بدکار کیوں ہوتے ہیں؟

☆☆ مشاہدہ یہی کہتا ہے۔ ایک قلمکار عورت کے باطن میں جھانک سکتی ہے تو وہ مرد کے باطن کا مطالعہ کیوں نہیں کر سکتی؟ میرے گھر میں باپ تھا، بھائی تھے بہنوں کے شوہر تھے۔ ملنے جلنے والے مرد بھی تھے۔ میں نے سب کے کردار پر غور کیا اور اس کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

☆ آپ کے ہاں عاشق کو بھائی سے مماثل بتلانے والے ملبہ کس کے سر ڈالنا چاہتے ہیں؟

☆☆ یہ شاید عورت کی مجبوری ہے۔ منگیتر یا من پسند کزن زندگی کا ساتھی نہ بن سکے تو وہ خیال سے جاتا تو نہیں ہے۔ بچوں سے ماموں کہہ کر ہی تعارف کرایا جا سکتا ہے۔ اس طرح رشتہ مضبوط رہتا ہے۔ میں یہی سمجھ پائی ہوں۔ ایسا ہی میں نے لکھا بھی ہے۔

☆ بقول ڈاکٹر انور سدید قد آور خواتین افسانہ نگاروں کی موجودگی میں اپنی شناخت بنانے کے لیے آپ کو بہت محنت کرنا پڑی۔ کچھ تفصیل اُن دنوں کی بیان کرنا پسند کریں گی؟

☆☆ میں خاموشی سے لکھتی رہی۔ معروف پرچوں میں چھپتی رہی۔ کسی کے کندھے پر بندوق چلانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ناقدین نے کبھی گھاس نہیں ڈالی، اہمیت ہی نہیں دی۔ چنانچہ میری پہچان بہت دیر سے بنی لیکن میں مطمئن ہوں اور اپنے قارئین کی شکرگزار ہوں۔

☆ لفظ تخلیق کا کرب وضاحت طلب ہے۔ یہ کب، کہاں اور کن لوگوں کو اٹھتا ہے کم از کم اپنے حوالے سے نشان دہی فرما دیجیے کہ اُس کرب میں کیفیت کس طرح کی ہوتی ہے اور نجات کیونکر ملتی ہے؟

☆☆ جب کوئی بات، کوئی واقعہ توجہ کھینچتا ہے تو ذہن میں ایک کہانی جنم لیتی ہے۔ اسے جب تک تحریر نہ کر لیا جائے طبیعت بے چین اور دل بےکل رہتا ہے۔ بعض لوگ کہانی کا تانا بانا تصور کی بنیاد پر بُنتے ہیں اور کئی کئی دن میں کہانی مکمل کرتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں افسانہ ایک ہی نشست میں لکھتی ہوں۔ اگر کسی وجہ سے افسانہ ادھورا چھوڑ کر اٹھنا پڑ جائے تو وہ ہمیشہ ادھورا ہی رہتا ہے۔ میں اصغر کو دفتر اور بچوں کو اسکول بھیج کر کہانی لکھا کرتی تھی۔ اب تو خیر وقت ہی وقت ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ روٹیاں پکانے کے دوران کوئی پلاٹ ذہن میں کوند گیا تو کام چھوڑ کر افسانہ لکھا ''سپیرا'' میرا ایسے ہی وقت کا لکھا ہوا افسانہ ہے۔

☆ آپ کے ہاں بے آب دھرتی کا ذکر بھی شد و مد سے نظر آتا ہے جس کی نشان دہی ہو جائے تو کیا کہنے؟

☆☆ کہہ نہیں سکتی کہ بے آب دھرتی کا ذکر میرے کن کن افسانوں میں آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔ لیکن اگر پڑھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا ہے تو واضح ہو کہ یہ میری شعوری کوشش ہرگز نہیں ہے۔ پلاٹ یقیناً اس کا متقاضی ہوگا۔ اس کی وضاحت تو ناقدین ہی کر سکتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر انور سدید نے تجرید اور علامت کو فیشن گردانا ہے۔ آپ کی رائے اور پوزیشن اس حوالے سے ریکارڈ پر آنا ضروری ہے؟

☆☆ مجھے ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اتفاق ہے۔ تجریدی افسانہ میرے خیال میں قاری کو چونکانے کا ایک ذریعہ ہے۔ جیسے فحش یا سیکس پر تحریر شدہ افسانے۔ ایسے افسانے قلم کار کو جلد شہرت عطا کر دیتے ہیں۔ تجرید کا ایک دور چلا تھا اور نہ سمجھ میں آنے والے افسانہ نگاروں نے جلد قاری کی توجہ حاصل کر لی۔ خاص طور پر خواتین کے فحش افسانے قارئین کو بہت پسند آئے ہیں۔ تجرید کے دور میں بھی میں اپنے راستے پر ہی چلتی رہی ہوں۔ کسی افسانے کے پلاٹ کا اگر تقاضہ بھی ہوا تو میں نے گول مول اور شائستگی کے ساتھ اس کو تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔ نازیبا الفاظ سے اجتناب برتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں جنس یعنی سیکس سے پرہیز جبری ہے یا اختیاری؟

☆☆ مجھے سیکس سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ کرنے کو اور بہت سے شوق اور کام ہیں۔ میں نے تھوڑا بہت فلسفے کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ مجھے فلاسفرز میں لیوکریشی کا نظریہ بہت پسند آیا۔ چنانچہ اس کی پیروی میں اپنا نکتۂ نظر اور بھی پختہ اور مضبوط ہو گیا۔ میرے خیال میں محبت کا سیکس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ محبت ایک اچھوتا اور کومل جذبہ ہے جو حساس دلوں میں پھوٹتا ہے۔ ہمیں پھولوں سے، قدرتی مناظر سے بھی محبت ہوتی ہے نا۔

☆ ''دوزخ'' کے بیان میں اندر اور باہر کا حوالہ قاری کو متذبذب کرتا دکھائی دیتا ہے؟

☆☆ یہ سوال وضاحت طلب ہے۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ جنت اور دوزخ پر سارے مذاہب کا اعتقاد ہے۔ میں نے اگر ایسا کچھ بیان کیا ہے تو ظاہر ہے میں مسلمان ہوں اور اس حیثیت میں میرا یقین ہے کہ برے اعمال کے بدلے میں خدا کے ہاں دوزخ ہی ملے گی۔ اس میں تذبذب کس بات کا؟

☆ ایک تاثر آپ کے ہاں تلاش کا بھی ہے کچھ بتلایئے تو سہی آپ کی تلاش کا سرا کہاں جا کر ملتا ہے؟

☆☆ ساری زندگی باپ کے پیار کو کھوجتی رہی ہوں۔ آپ کا سوال مجھ سے اندر کی کہانی اگلوا رہا ہے گلزار بھائی۔ تو سنئے! میں تین سال کی تھی جب باپ کی محبت مجھ سے چھن گئی۔ ان کی زندگی میں ایک بازاری عورت داخل ہو گئی اور انہوں نے اس سے عقد کر لیا۔ امّاں نے اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کیا اور میری انگلی پکڑ کر اپنے سسرال آ گئیں۔ دونوں بھائی ابّا کے پاس رہ گئے اور یوں ہم بکھر گئے۔ میں ہر آدمی میں باپ کی شبیہہ محسوس کرتی ہوں۔ اس کمی کو اصغر مہدی نے کسی حد تک پورا کیا۔ وہ بہت محبت کرنے والے شفیق انسان تھے۔ لیکن بھیّا یہ عجیب بات ہے کہ ابّا جی کی اس زیادتی کے باوجود ان سے امّاں سے بھی زیادہ محبت تھی اور ہے۔ جب میں شعور کو پہنچی تو محسوس کیا کہ امّاں نے اپنا گھر چھوڑ کر غلطی کی تھی۔ ابّا نے انہیں نکالا تو نہیں تھا۔ یہ امّاں کا اپنا فیصلہ تھا جو میری نفسیات بگاڑ گیا اور میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی۔

☆ آپ کو رنگوں، خوشبو، چاہت اور بہاروں کی افسانہ نگار بتلا کر رومان کی نشان دہی کی جا رہی ہے جبکہ آپ کے ہاں اس جذبہ لطیف سے ممکن حد تک پہلوتہی کی جاتی ہے؟

☆☆ میرے عزیز! قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونا بھی تو رومان ہے۔ میں جب ایسے مناظر دیکھتی ہوں تو نثار ہو ہو جاتی ہوں۔ طلوعِ صبح، غروبِ آفتاب، بہتے دریا، فلک بوس پہاڑ، جھلملاتے تارے، گرتے جھرنے، پھوٹتے چشمے، کھلتے پھول کیا کچھ رومان پرور ہے۔ جہاں تک چاہت کا سوال ہے تو میں ہر اس آدمی سے بلا تخصیص محبت کرتی ہوں جو میرے حلقۂ احباب میں شامل ہو جائے۔ یا ذرا بھی شناسائی ہو جائے۔

☆ آپ کے ہاں مفلسی کو رشتوں کی کمزوری سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پیسے کی زیادتی بالخصوص غیر قانونی ذرائع سے کمائے ہوئے کی نسبت کوئی احتجاج نظر نہیں آتا؟

☆☆ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں۔ علماء کو تو میں نے ایسے لوگوں کی کمائی میں برکت کی دعا کرتے بھی سنا ہے۔ میرے کئی افسانے اس موضوع پر ہیں۔

☆ الطاف آپا نے آپ کے افسانوں کو سیدھا سادا کہہ کر کسی خامی کی نشان دہی کی ہے یا اس کو آپ کا وصف گردانا ہے؟

☆☆ یہ الطاف آپا کی رائے ہے جنہوں نے میرے چند افسانے پڑھے۔ وہ خود سیدھے سبھاؤ کے افسانے لکھتی تھیں۔ شائستہ اور مہذب پیرائے میں۔ مشہور ادیبہ ہیں دنیا مانتی ہے ۔ میرے کچھ افسانے علامتی بھی ہیں جیسے ''گدلا سمندر''۔ ''کفن کے تھیلے'' وغیرہ۔ خیر اس کا فیصلہ تو وہ قاری کر سکتے ہیں جنہوں نے مجموعی طور پر مجھے پڑھا ہو یا پھر نقاد بتا سکتے ہیں۔ میرے افسانے سندھی، گورکھی، انگریزی اور چینی زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ چائنہ کی بیجنگ یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں۔

☆ خاتون ہونے کے باوجود آپ کے افسانوں میں مرد کرداروں کے مسائل کن تجربات کی بنا پر بیان ہوئے ہیں؟

☆☆ اس ضمن میں مشاہدہ ہے۔ عورت تو مظلوم ہے سو ہے مگر کئی جگہ مرد بھی مظلوم ہے۔ میرا خیال ہے میں نے اس امر سے پہلو تہی نہیں کی۔ مرد شکّی مزاج ہوتا ہے عموماً مگر عورت اس سے بڑھ کر شکّی واقع ہوئی ہے۔ ان آنکھوں نے شک کی بنا پر کئی گھر ٹوٹتے دیکھے ہیں۔ زندگی کی گاڑی ہمواری کے ساتھ اعتماد پر چلتی ہے دونوں طرف سے اگر ہو۔

☆ عورتوں کی آزادی کے حوالے سے بھی آپ نے آواز بلند کی ہے مگر آج کے مرد کی بدحالی کو سرے سے فراموش کر دیا ہے؟

☆☆ ایسا تو ہر گز نہیں ہوا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے کا مرد خودمختار ہے جبکہ عورت مجبور ہے۔ کہیں بیٹی کے ناتے، کہیں بہن اور ماں کے ناتے۔ کبھی وہ بہو ہے کبھی بیوی کے روپ میں ہے۔ وہ زیادہ مجبوریوں میں گھری ہوئی ہستی ہے۔ مجھے دیکھئے! میں پڑھنا چاہتی تھی کچھ بننا چاہتی تھی مگر۔۔۔!

☆ آپ کے ناولوں کی فضا کو تھامس ہارڈی کے مشابہہ کہنے والے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ نہیں کر رہے؟

☆☆ یہ تو وہی لوگ جانیں۔ میں نے غیر ملکی لٹریچر کا بہت کم مطالعہ کیا ہے وہ بھی تراجم کے توسط سے۔ ویسے بات یہ ہے کہ دنیا کے ہر خطے کے انسان کی فطرت کچھ مذہبی اور معاشرتی فرق کے ساتھ یکساں ہے۔ لہٰذا تحریر میں بھی مماثلت ہو جانا تعجب خیز امر نہیں ہے۔

☆ کچھ لوگ تو اس باب میں چارلس ڈکنز کے چراغ سے چراغ روشن کرنے کی بات بھی کرتے ہیں؟

☆☆ اس سوال کا جواب تقریباً دیا جا چکا ہے۔ انسان کسی ملک وملت کا ہو اس کے احساسات ومسائل تو کسی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ جن کا ذکر وہ اپنی تخلیقات میں کرتا ہے صرف معاشرتی قدروں کا فرق ہوتا ہے۔

☆ ''تخلیق'' کی ادارت کس سبب آپ کے حصے میں آئی اور کس طور آپ کے فنی سفر میں معاون بنی؟

☆☆ جب اظہر جاوید صاحب نے مجھے ''تخلیق'' میں شمولیت کی دعوت دی تو میری بھابی میرے گھر بیٹھی تھیں میں انکار کر رہی تھی۔ بھابی نے کہا بھئی ایک شریف آدمی مسلسل اصرار کر رہا ہے تمہیں کیا تکلیف ہے۔ اصغر نے بھی مجھے منع نہیں کیا۔ اس وقت اظہر صاحب کے خاندان کے ساتھ میرے خاندان کے تعلقات بن چکے تھے۔ میں اس سے پہلے تاشی ظہیر کی خوشدامنہ کا ماہنامہ ''نورونار'' ایک سال تک نکالتی رہی تھی اور عالم سید صاحب کے ہفت روزہ ''شب تاب'' میں بھی شامل رہ چکی تھی۔ لہٰذا سب کے مشورے پر میں نے ''تخلیق'' کی ایڈیٹرشپ منظور کر لی۔ اپنے حصے کا کام مثلاً مسودے جانچنا، پروف پڑھنا، قلمکاروں کو خط لکھ کر ان کی نگارشات منگوانا، سب کام میں گھر میں کرتی تھی۔ سنیچر والے دن میں اور اصغر اکٹھے دفتر جایا کرتے تھے۔ اصغر بھی غزلیں وغیرہ دیکھنے میں اظہر صاحب کی مدد کرتے تھے۔ البتہ جس دن پرچہ پیسٹ ہوتا تھا اس روز ہم دونوں کے علاوہ کاتب صاحب، زمان کنجاہی اور امینہ عنبرین بھی موجود ہوتے تھے۔ زمان کنجاہی برفی لے کر آتے تھے۔ امینہ عنبرین کے سپرد چائے ہوتی تھی۔ کٹا کٹ (کھانا) انار کلی سے آتا تھا۔ خاصا ہنگامہ خیر دن گزرتا تھا۔

☆ اظہر جاوید مرحوم کو احباب آپ کی کامیابی کا کریڈٹ کس بنا پر دیا کرتے ہیں؟

☆☆ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو عورتوں کو گھر داری کے علاوہ کسی کام کا اہل نہیں سمجھتے اور ناقص العقل گردانتے ہیں۔ یوں ہر پل انسان کچھ نیا سیکھ رہا ہوتا ہے۔ میں نے بھی ''تخلیق'' سے بہت کچھ سیکھا۔ واقفیت بڑھی نئے لوگوں سے ملنے جلنے کا قرینہ آیا۔ اس کا مجھے اعتراف ہے۔

☆ کچھ تجربات واحساسات ''تجدید نو'' کے حوالے سے بیان فرمائیے؟

☆☆ سن ۸۴ء میں اصغر صاحب کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا اور میں اسلام آباد منتقل ہو گئی۔ بور ہونے کی بجائے میں نے ریڈیو اسلام آباد جوائن کر لیا اور ایک سال تک ہفتہ وار کالم پڑھتی رہی۔ اخبار میں بھی کالم لکھتی تھی۔ پھر کراچی کے ایک بزرگ شاعر جناوفا براہی نے مجھے لکھا کہ بیٹا تجربہ تمہارے پاس ہے تم اپنا رسالہ کیوں نہیں نکال لیتیں؟ چنانچہ میں نے ''تجدید'' کا ڈیکلریشن اپلائی کیا اور پرچے کی تیاری شروع کر دی۔ ابتداء میں بیشتر ادبا اور شعراء کو خط تحریر کیے۔ سب سے پہلے الطاف آپا کا افسانہ موصول ہوا جس سے مجھے بہت تقویت ملی۔ ''تجدید'' میں میری معاون شبہ طراز تھیں۔ پرچہ لاہور سے چھپتا تھا۔ کتابت اسلام آباد میں ہوتی تھی۔ آخر آخر میں اس کی پیسٹنگ بھی ہم خود کرنے لگے تھے بلکہ شبہ طراز تو بہت ماہر ہو گئی تھیں۔ کہنے والے تو کہتے تھے بلکہ متجسس تھے کہ پرچے میں کس مرد کا ہاتھ ہے۔ بائیس برس تک پرچہ شائع ہوتا رہا۔ میں کراچی آ گئی تو شبہ طراز نے تین چار سال تنہا پرچہ چلایا۔ تب باہر کا کام یعنی پریس لانا لے جانا ضیغم عباس کرتے تھے۔

☆ گروپ اور دھڑے بندی نے اردو ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ آپ کی رائے اس لیے اہم ہے کہ آپ پاکستان کے ایک نامور ادبی جتھے کا حصہ رہی ہیں؟

☆☆ جی جناب! گروپ بندی تو اردو ادب میں ہمیشہ رہی ہے لیکن اس

دور میں کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی۔نقصان تو ظاہر ہے ادب اور ادیبوں کو پہنچنا ہی تھا بس یہ بھی مفادات کا چکر تھا اور آپس کی لگائی بجھائی۔

☆ یہ بھی آپ کا کمال ہے کہ ایک گروپ کی باقاعدہ ممبر ہونے کے باوجود دوسرے گروپ سے آپ کے تعلقات نہ صرف استوار رہے بلکہ تواتر سے آپ اُن کے جریدے میں شائع بھی ہوتی رہیں؟

☆☆ جی نہیں۔ممبر تو میں کسی گروپ کی نہیں رہی۔ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید صاحب کا احترام تھا۔وہ کبھی کسی کے خلاف بات نہیں کرتے تھے۔بلند اخلاق اور مہذب لوگ تھے۔ان کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کچھ حاصل ہی کرتا تھا ''تخلیق'' میں ڈاکٹر انور سدید کا مضمون ''غالب کا خط عذرا اصغر کے نام'' مضمون حالاتِ حاضرہ پر ہوتا تھا۔اپنا نام خط میں آنے کی وجہ سے قاسمی صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے۔حتیٰ کہ میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیتے تھے اور میرے لیے مشہور کر دیا تھا کہ مخالف گروپ سے ہے۔میں اس سے پہلے ''فنون'' میں چھپی ہوں بعد میں تو وہ اپنے لکھاریوں کو ''تجدید'' میں چھپنے سے بھی منع کر دیتے تھے۔ مجھے شبنم شکیل صاحبہ نے یہ بات بتائی تھی اور اپنی بھیجی ہوئی نظم واپس مانگ لی تھی۔

☆ ایک بدعت اور چل نکلی ہے اساتذہ کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر چربہ اُڑانے کی۔ہر کوئی اپنے منظورِ نظر کو سر پر بٹھائے ہوئے ہے کہیں سے کوئی آواز، کوئی احتجاج کبھی نظر سے نہیں گزرا؟

☆☆ شاید یہ پچھلے زمانے میں بھی تھوڑا بہت ہوتا رہا ہے۔موجودہ دور میں یہ وبا زیادہ عام ہے۔بعض لوگ تو اپنے پرکھوں کی پرانی نگارشات اپنے نام سے چھپوا کر سینئر ادیب بن بیٹھے ہیں۔کچھ کرایے پر یعنی پیسے دے کر بعض سینئرز سے لکھوا کر ادب میں شامل ہو گئے ہیں۔میں کیا بہت سے لوگ اس طرح کے لوگوں کو جانتے ہیں۔یہاں تک ہو رہا ہے کہ اجرت پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ حاصل کر کے ''ڈاکٹر'' کہلوانے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ایسے شاعر اور شاعرات کو میں جانتی ہوں۔کوئی آواز اٹھائے بھی تو سنتا کون ہے؟

☆ ڈاکٹر وزیر آغا کے زمانے میں انشائیہ عروج پر تھا مگر آج کم کم نظر آتا ہے۔آپ بھی تو انشائیے لکھا کرتی تھیں۔آج کل صورتِ حال کیا ہے؟

☆☆ جی ہاں۔چھ سات انشائیے لکھے تھے۔کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی معیت میں آدمی بہت سے غیر معمولی کام کر گزرتا ہے۔اسلام آباد میں جمیل آذر صاحب ہوتے تھے، ڈاکٹر بشیر سیفی تھے۔ان لوگوں سے تحریک ملتی تھی۔کراچی سے سلیم آغا قزلباش سے ٹیلی فونک رابطہ تھا۔وہ تقاضا کرتے تھے۔اللہ بخشے اب وہ بھی نہیں رہے۔ماحول ہی بدل گیا۔بعض لوگ صنف تحریک کے طور پر چلاتے جیسے ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی تحریک چلائی تھی۔حیدر قریشی اور سیدہ حنا نے ماہیہ پر کام کیا۔بڑا شور و غوغا رہا۔حیدر قریشی جرمنی چلے گئے اور سیدہ حنا اللہ کے گھر سدھار گئیں۔ماہیہ کا زور ختم ہو گیا۔اس دوران میں نے بھی کچھ ماہیے لکھے تھے۔

☆ پچھلے دنوں آپ کی نظموں یا ہائیکو کا پنجابی زبان میں ترجمہ نظر سے گزرا یہ مہارت اور کمال آپ نے کب اور کہاں سے حاصل کی؟

☆☆ نظموں کا تو نہیں البتہ افسانوں کا مجموعہ ضرور چھپا ہے۔

☆ پنجابی افسانے۔۔۔؟

☆☆ گلزار بھائی! بات یہ ہے کہ مٹی کی محبت میں میں نے کچھ افسانے پنجابی زبان میں لکھے تھے۔کتاب چھپنے کی باری آئی تو ضخامت پوری کرنے کے لیے چند اردو افسانوں کا پنجابی میں ترجمہ کر کے اُس کتاب میں شامل کر دیے۔ غالباً آپ کا اشارہ اُسی کتاب کی جانب ہے۔

☆ پاکستان بے بہا قربانیوں اور اَن گنت ایمان و ایقان کی بدولت وجود میں آیا۔مشرقی پاکستان کے سانحے نے اس ایمان و ایقان کو کافی ضعف پہنچایا مگر اب نیو ورلڈ آرڈر کی بے رحمانہ کارروائیوں نے تیسری دنیا بالخصوص پاکستان کے لیے جس طرح دائرہ تنگ سے تنگ کرنا شروع کیا ہے اُس کی روشنی میں مستقبل کے حوالے سے کس طرح کی پیش بندی کی جانی چاہیے؟

☆☆ نیو ورلڈ آرڈر کا کیا رونا روئیں۔پاکستان کے اندر ہی مخالفین کو قرار نہیں آ رہا۔اقتدار چھن جانے کا غم کھائے جا رہا ہے اور وہ مفاد پرست ٹولہ گھس بیٹھئے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ہمیں زیادہ سے زیادہ ان کی بیخ کنی کرنا چاہیے۔انشاء اللہ یہ مفاد پرست، لٹیرے ناکام ہوں گے۔پاکستان کو کچھ نہیں ہوگا۔ضرور پاکستان پھلے پھولے گا۔

''Brave and Beautiful''

امریکی سائنسی ادارے اسپیس ایکس کی دعوت پر ۲۰۲۳ء میں چاند کی سیر پر جانے والے پہلے امیر ترین چوالیس سالہ جاپانی فیشن ڈیزائنر یساکو مائزاوا کو Brave and Beautiful خاتون ہمراہی کی تلاش ہے جس کی عمر بائیس سے پچیس کے درمیان ہونا لازمی ہے۔یساکو مائزاوا نے اپنی ویب سائٹ پر دنیا بھر سے خواہشمند خواتین سے درخواستیں طلب کی ہیں۔اس منصوبے کے تحت اسپیس ایکس دنیا کے مال دار ترین اشخاص کو بھاری معاوضے کے عوض چاند کی سیر پر لے کر جائے گا۔ ایک وقت میں دو مسافر اس شاندار ہوائی سفر سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔یساکو بھی اپنے سفر کا لطف دوبالا کرنے کی تگ و دو میں خوبصورت ہمراہی کی تلاش میں ہیں۔

ریڈیو کالم

"برسات کی بہاریں"

عذرا اصغر

سنتے ہیں پچھلے زمانے میں بہار بہت دھوم دھام سے آتی تھی تو اس کا سواگت بھی اس کے شایانِ شان اسی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ جب بادل اُمڈ گھمنڈ کے آتے، کالی کالی گھٹائیں چھاتیں اور پھر چھائی ہی رہتیں۔ ہفتوں ہفتوں گھٹا چھائی رہتی اور رم جھم کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی رم جھم اور کبھی چھما چھم بارش برستی۔ ننھی ننھی کنیاں پڑتیں اور موسم پر رنگینی چھا جاتی۔ طبیعتیں پر کیف ہو جاتیں۔ جمعرات کی جھڑی لگتی تو اگلی جمعرات ہی کو کھلتا۔ اہلِ دل برسات کا خیر مقدم بھی کھلے دل سے کرتے۔ پکوان بنتے، گھر گھر کڑھائیاں چڑھ جاتیں اور امبوا کی ڈالیوں پر جھولے پڑتے۔ حسینائیں، دوشیزائیں رنگ برنگے لباس پہن کر پینگیں بڑھاتیں اور مستقبل کے گیت گاتیں۔

"اماں میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا"

کیا زمانہ تھا کہ مہاوٹوں میں میکا اور بھیا کی یاد دل کو بیکل کر دیتی تھی۔ میکے کا گھر۔۔۔ ماں باپ کی دہلیز۔۔۔ سکھی سہلیاں۔۔۔ جھومتی گھٹاؤں سے شاعر اپنی خیالی محبوبہ کی زلفوں سے تشبیہہ دیتے۔ پھر جانے کیسی ہوا چلی۔ شاعر کی محبوبہ دنیا کے مسائل میں گم ہو گئی۔ امبوا کی ڈالیوں پر جھولے، میکے کا پُر سرور تصور سب حالات کی ستم ظریفی کی بے رحم لہروں میں بہہ گئے۔ کیلنڈروں کے صفحوں پر ساون کا مہینہ تو اب بھی آتا ہے مگر ساون نہیں آتا۔ گھٹائیں اٹھتی ہیں مگر جھوم کر نہیں۔ گھن گرج کے ساتھ، گرجتی، کڑکتی دندناتی آتی ہیں، غنیم کی سرکش فوجوں کی طرح ڈراتی اور بن برسے گزر جاتی ہیں۔ بقول شاعر:

"ادھر کڑکی، ادھر چمکی، اُدھر برسی"

نہیں گزری، گزر گئی بن برسے۔ ہفتوں تو کیا اب تو مہینوں بادل برسنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اب نہ گھٹاؤں میں وہ زور رہا اور نہ بادلوں میں شور۔ ہفتہ بھر نمازِ استسقا پڑھو تو بادل یوں نخوت کے ساتھ آ کے پل کے پل سوکھی دھرتی پر چھینٹا مار کر گزر جائے گا جیسے دولت مند بہت گڑگڑانے پر کسی بھیک منگے کی جھولی میں روٹی کا ٹکڑا یا اٹھنی، چونی کا سکہ پھینک دیتا ہے یا بادل جلال میں آ کر برسا تو ایسا برسا کہ جل تھل کر دیا۔ غریبوں کے جھونپڑے خس و خاشاک کی طرح بہا دیئے۔ متوسط لوگوں کے گھروں کے در و دیوار ہلا ڈالے۔ جب بادلوں کے تیور یوں بدلیں گے تو لوگوں کی طبیعتوں پر تو اثر پڑنا ہی ہوا۔ ساون کے آتے ہی دریا اپنے کناروں سے ابل پڑیں تو کونسی مٹیار ہو گی جو امبوا کی ڈال پر جھولا ڈالے بیٹھی اطمینان سے پینگیں بڑھا رہی ہو گی اور اماں سے بھیا کو بھیجنے کا تقاضہ کر رہی ہو گی۔ ہاں البتہ ساون یوں تباہیاں مچاتا آئے گا بچاری اپنے بھیا اور ماں باوا کی طرف سے پریشان ضرور ہو گی اور خیر سے رہنے کی دعائیں مانگے گی۔ اب کی برساتوں میں تو کڑھائیاں چڑھنے اور پکوان بننے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ مگر سارا الزام بچارے ساون کو ہی نہیں جاتا کچھ قصور ہمارا بھی ہے اور فتور نیتوں کا بھی ہے۔ اچھی بات یہی ہے کہ دوسروں کو الزام دینے سے پہلے اپنی غلطی تسلیم کر لی جائے۔

جس زمانے کے ساونوں میں پکوان بنتے تھے اور امبوا کی ڈالیوں پر جھولے پڑتے تھے سیلاب تو تب بھی آتے تھے۔ تباہیاں اس وقت بھی مچتی تھیں لیکن اس وقت کے لوگ قلبِ مطمئنہ کے مالک تھے، راضی بہ رضا کے قائل تھے، صبر کے عادی تھی، محنت سے عظمت پانا جانتے تھے، ایک دوسرے کے مددگار بنتے تھے۔ آج کا انسان عیش کوشی کا عادی ہے۔ ذرا سی مشکل میں گھبرا اٹھتا ہے۔ راضی برضا کا فارمولا کتابوں میں بند کر کے شیلفوں میں سجا دیا ہے۔ ہم سچی خوشی کے مفہوم سے ناآشنا لوگ ہیں۔ ہمارے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجی رہتی ہے۔ ہم دکھاوے کے خوگر ہیں۔ میٹریل اسٹک (Meterialistic) مادہ پرست۔ چنانچہ مادہ پرستی کے اس دور میں کیا ساون اور کیا اس کی بہاریں۔ ویسے ہر چیز کے کچھ لوازمات ہوتے ہیں کچھ اصول اور طریقے ہوتے ہیں۔ یہ سب نہ ہوں تو ہر چیز ادھوری اور نامکمل ہے۔ اب نہ حویلیاں رہیں اور نہ حویلیوں کے آنگنوں میں جھومتے گھنے آم کے پیڑ۔ بستیاں پھیل کے شہر بنیں تو باغات سمٹ کر دور چلے گئے۔ گھروں کے آنگن تنگ ہو گئے کہ ان میں آدمی سمائیں یا درخت؟ آم جو موسم میں ٹوکرے بھر بھر ملتے تھے گدھوں پر لدے بکتے تھے اب ترازو میں تُل کر ملنے لگے۔ گھروں کے رقبے کم ہوئے تو آم کے پیڑ کہاں لگیں گے اور آم کے درخت نہ ہوں گے تو امبوا کی ڈالی پر جھولے کیسے پڑیں کے اور ملہار کون گائے گا؟

پھر تو یہی ہوگا کہ کنواریاں ساون برسنے پر اپنے بیڈروم میں تنہا لیٹ کر پاپ میوزک سنیں گی اور بیاہیاں اپنے بچوں کو اسکول سے چھٹی کرا کے اے فار ایپل اور ایم فار مینگو پڑھائیں گی اور ساون برستا رہے گا۔ بادل گرجتے رہیں گے اور بجلیاں کڑکتی رہیں گی۔ یونہی بے مزا۔۔۔ بے سود۔۔۔!

فطرت

انسان پیدائشی طور پر کسی سے نفرت نہیں کرتا، نفرت کرنا اُسے سکھایا جاتا ہے، والدین سکھاتے ہیں، سکول کی کتابیں سکھاتی ہیں، میڈیا سکھاتا ہے۔ ورنہ انسان کی فطرت تو محبت کرنا ہے۔

نیلسن منڈیلا

اردو کی جدید افسانہ نگار

میرزا ادیب

(●)

اسے محض اتفاق سمجھئے کہ جب میں نے عذرا اصغر کی افسانوی تحریروں کا مطالعہ شروع کیا تو سب سے پہلے جو دو کہانیاں میری نظر سے گزریں، اُن کے عنوان بالترتیب یہ ہیں:۔

''پت جھڑ کا آخری پتا'' اور ''سہارا''۔

دونوں کہانیوں میں اس اعتبار سے ایک قسم کی معنوی مماثلت پائی جاتی ہے کہ ان کے مرکزی کردار حالات سے مجبور ہو کر سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اب یہ جداگانہ معاملہ ہے کہ ایک کردار کے حصے میں محرومی آتی ہے اور دوسرا کردار اپنے مقصد میں کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

''پت جھڑ کا آخری پتا'' بڑا دردناک افسانہ ہے۔ یہ ایک انسانی المیہ ہے۔ مصنفہ نے اس افسانے میں ایک ایسی لڑکی کی گریہ آور رودادِ محبت لکھی ہے جو اپنے گھر سے دور، بے کیف حالات کے سایوں میں ایک نوجوان کی محبت کو اپنے دل کی دھڑکن بنا لیتی ہے۔ یہ نوجوان اس کے تمام تصورات پر چھا جاتا ہے۔ اس کے تمام خوابوں کی روشنی اور حرارت بن جاتا ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ جب یہ لڑکی اس کی تلاش میں اس کے یہاں جاتی ہے تو دیکھتی ہے کہ اس کا محبوب ایک لڑکی کو مخاطب کر کے وہی الفاظ کہہ رہا ہے، جو کچھ مدت پیشتر وہ اسے کہہ چکا ہے۔ حقیقت کا انکشاف اس کے لیے اتنا بھیانک ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تمام زندگی پر خزاں کی سوگوار کیفیتیں پھیل جاتی ہیں۔ دوسری کہانی میں ایک اُداس اور غمگین چڑیا کو دکھایا گیا ہے جو ہم سفر کی موت کے بعد اپنے ننھے سے دھڑکتے دل کے ساتھ آشیانے میں اس طرح بیٹھی رہتی ہے کہ جیسے اب زندگی سے اس کا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ اس عالم میں ایک چڑا اس کے پاس آتا ہے اور یکا یک اسے محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی وہ روشنی جو مایوسی کی اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب چکی تھی، سورج کی پہلی کرن کی طرح اس کے دل و دماغ کو چھو رہی ہے اور پھر وہ دونوں، ایک دوسرے کا سہارا بن کر فضاؤں میں تیرنے لگتے ہیں۔!

ایک طرف انسانی رویہ ہے اور دوسری طرف ایک پرندے کا طریقِ فکر اور طریقِ عمل، دونوں میں نمایاں تضاد دکھایا گیا ہے۔ کیا مصنفہ کا یہ زاویۂ نگاہ تو نہیں ہے کہ وہ انسانوں سے نا اُمید ہو چکی ہے، اور اس لیے نا اُمید ہو چکی ہے کہ جو کچھ اُسے انسانی دنیا میں ملنا چاہیے تھا وہ پرندوں کی معصوم دنیا میں دیکھ رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ عذرا اصغر نے پہلے ''پت جھڑ کا آخری پتا، لکھا ہو اور اس کے بعد محسوس کیا ہو کہ انھیں ایک ایسی کہانی بھی لکھنی چاہیے جس کے ذریعے پرندے کے یہاں وہ چیز دکھانی چاہیے جو انسانوں کے ہاں اب نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے اس قسم کی شعوری کوشش سے کام نہیں لیا۔ کیونکہ ان کی کہانیوں میں زندگی کے روشن پہلو ہی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ دو کہانیاں آپس میں غیر مربوط ہونے کے باوصف عذرا اصغر کے اپنے ذہنی رویّے کی مظہر معلوم ہوتی ہیں۔

دونوں کہانیوں کے تقابلی مطالعے سے بظاہر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مصنفہ انسانوں کے متعلق جو رویہ روا رکھتی ہیں۔ وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے طنزیہ ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا رویہ اُن کی سوچ کی بنیاد نہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک مصنف اپنے تجربے کو اپنی صرف ایک تخلیق تک محدود نہیں رکھ سکتا۔ یہ تجربہ نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک اور تخلیق کی تعمیر و تشکیل میں بھی صرف ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ دو کہانیاں انسانی اور غیر انسانی رویوں کی نشان دہی کی بجائے ایک ہی تجربے کے دو مختلف رخ پیش کرتی ہیں۔

مصنفہ کا تجربہ ہے کہ دنیا میں وفا بھی ہے اور بے وفائی بھی، اور ان دو کہانیوں میں ایک تجربے کا تسلسل پایا جاتا ہے! یقیناً یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مصنفہ نے اپنے تجربے کے تسلسل کے لیے انسانی اور غیر انسانی کرداروں کا انتخاب کیوں کیا؟۔۔۔ تجربے کا ایک رُخ انسانی دنیا میں دکھایا اور دوسرے رخ کے لیے پرندوں کی طرف توجہ کی۔ یہ رخ بھی انسانی دنیا ہی میں دکھایا جا سکتا تھا۔۔۔!

عذرا اصغر کے تجربات و مشاہدات کی دنیا بڑی وسیع ہے۔ اس میں انسان بھی سانس لے رہے ہیں۔ پرندے بھی نظر آتے ہیں اور پت جھڑ کا آخری پتا بھی۔ یہ افسانہ نگار انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کی بہ دل و جان قائل ہے۔ اور ان اعلیٰ قدروں سے مایوس ہونے کے لیے مطلقاً تیار نہیں۔ چنانچہ ایک اعلیٰ انسانی قدر کو جب وہ انسانوں کے ہاں نہیں پاتی تو اس کی تلاش اسے پرندوں کی دنیا میں لے آتی ہے اور وہ چیز جو انسانی حسن و خوبی سمجھی جاتی ہے، اسے یہاں مل جاتی ہے۔ اسے تجربے کا تسلسل ہی نہیں مثبت قدروں سے محبت کا تقاضا بھی کہا جا سکتا ہے۔

پت جھڑ کا آخری پتا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، ایک انسانی المیہ ہے لیکن عذرا اصغر زندگی میں یاس و نا اُمیدی کے گہرے سایے تو دیکھتی ہیں اور ان سے متاثر بھی ہوتی ہیں۔ مگر ان کے ہاں یاس پرستی ہرگز نہیں۔ شام کے ہولناک سناٹے میں خزاں آلود ہوائیں اور تیزی سے چلنے لگتی ہیں۔'' یہ کیفیت لاکھ دردناک سہی پھر بھی ایسی نہیں جو زندگی سے اس کا سارا رس نچوڑ لے۔

عذرا اصغر زندگی میں خوبصورتی بھی پاتی ہیں اور بدصورتی بھی، بلندی بھی اور پستی بھی، روشنی بھی اور تاریکی بھی۔ ان کی نظر صرف ایک ہی رُخ کو اپنا مرکز نہیں بنا لیتی، صرف ایک پہلو کے گرد نہیں گھومتی۔ اُن کے تجربات میں بڑا تنوع۔ بڑی رنگا رنگی اور بڑی بوقلمیاں ہیں۔ وہ اپنے فن کے کینوس پر زندگی کے وہ سارے نقوش دکھانا چاہتی ہیں جو ان کے مشاہدے میں آئے ہیں۔ اس لیے میں

سمجھتا ہوں عذرا اصغر انسانی فطرت کو اس کے تمام رنگوں، تمام پہلوؤں میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ زندگی کے شہد کے ساتھ ساتھ زندگی کے زہر کا بھی بطورِ خاص خیال رکھتی ہیں۔

''پت جھڑ کا آخری پتا'' میں ایک محبت کرنے والی لڑکی کی کرب ناک کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔''سہارا'' میں اُمید کی روشنی ایک چڑیا اور چڑے کی سچی رفاقت میں ملتی ہے۔غم خوار، ہمارے معاشرے کا ایک ایسا کردار ہے جو منافقت کی علامت بن گیا ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے نہایت خوبصورتی سے ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو اوپر سے غم خوار معلوم ہوتا ہے، مگر اصل میں غالبؔ کے اس شعر کا عملی تفسیر کی نشان دہی کر رہا ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟

''تہمت میں ایک ایسا کردار ہمارے سامنے آتا ہے جس کا مشغلہ ہی تہمت تراشی ہے۔تہمت تراشنے میں اسے خوب لطف آتا ہے۔مگر اس امر سے بے پرواہے کہ فطرت مکافاتِ عمل سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔

بوا سلیمن اپنی بیٹی کی پاکیزگی اخلاق پر نازاں ہے۔وہ اپنی بیٹی کو مثالی کردار سمجھتی ہے مگر یہی مثالی کردار ایک روز ماں باپ کے چمکتے دمکتے ماتھے پر ذلت کا نشان بن جاتا ہے۔بوا سلیمن کی ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ باوجود اس امر کے کہ اس کی فرشتہ صفت بیٹی بھاگ گئی ہے۔وہ فریاد کناں ہے۔

''خدا کا قہر نازل ہو اس مستری کے لونڈے پر میری فرشتہ صفت معصوم بچی کو بہکا کر لے گیا۔''

بے ڈھب، ایک بھر پور طنز ہے۔کہ انسان تو اپنی طرف سے نیکی کرتا ہے۔اور اپنا تقدس برقرار رکھنا چاہتا ہے۔لیکن اُس کی نیک نیتی کے اضطراری عمل کو اس کی کمزوری سمجھ لیا جاتا ہے۔

''گھس بیٹھے'' میں مصنفہ نے مشرقی پاکستان کی ٹریجڈی کے پس منظر میں ایک ایسا کردار اُبھارا ہے جو اپنے وطن کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اگرچہ وطن کے دشمن سے اس کے ماضی کی کئی یادیں وابستہ ہیں، وہ اسے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔۔۔۔!

افسانہ نگار نے اس افسانے میں بلا کا کرب بھر دیا ہے۔یہ اردو کے اُن افسانوں میں شامل ہے جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

عذرا اصغر کا فن ابھی اس مقام سے دور ہے جب فکر کی پختگی اپنی تخلیقات کو فن کارانہ عظمت عطا کر دیتی ہے۔مگر جس تیز رفتاری سے وہ ارتقائی منازل طے کر رہی ہیں اسے دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس پرعزم افسانہ نگار کے اندر ایک بڑی افسانہ نگار پرورش پا رہی ہے اور مستقبل قریب میں ہمارے افسانوی ادب میں ایک بڑا خوبصورت اضافہ ہونے والا ہے۔عذرا اصغر کا مشاہدہ گہرا اور متنوع ہے۔ وہ انسانی فطرت کی رنگا نگی سے واقف ہیں۔جانتی ہیں کہ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں۔اس میں ایسے کرداروں کا میلہ لگا ہوا ہے جو طبعاً اور مزاجاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور انھیں اس بات کی بھی خبر ہے کہ انسان فطرتاً نہ نیک ہے اور نہ بد۔حالات اُسے نیک یا بد بنا دیتے ہیں۔

''پت جھڑ کا آخری پتا'' کی مصنفہ کی افسانوی تخلیقات بادِ بہاری کے وہ حیات آفریں جھونکے ہیں، جن کی آمد سے درختوں پودوں، اور پھولوں میں ایک نئی زندگی پورے جوش و خروش سے جاگ اٹھتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ افسانے ہمارے گلستانِ ادب کو بہارِ تازہ کی بشارت دے رہے ہیں۔

- بقیہ -

''مسافتوں کی تھکن''

کی قبریں ہیں جنھیں طالبان نے شہید کیا تھا۔۔۔۔طالبان نے انھیں شہید ہی نہیں کیا بلکہ شہادت کے بعد ان کے سر اور چہرے پتھروں سے کچل ڈالے تھے۔''

عذرا اصغر نے اپنے مطالعے اور ذوقِ شعر کو ناول کا حصہ بنا لیا۔اپنے مطالعے میں آنے والے منقولات اور اقوال جا بجا ناول میں بکھرے ہوئے ہیں۔

اس ملک کی بنیادی اساس کو جتنا نقصان ضیاء الحق نے پہنچایا اتنا کسی نے نہیں پہنچایا۔دہشت گردی اور ہیروئن اُسی کے عطا کردہ عذاب ہیں۔عذرا اصغر نے ٹھیک لکھا ہے۔

''گیارہ برسوں کے دور اقتدار میں ملک کا جغرافیہ، پالیسیاں، انسانی ذہن، سیاست، نظم و نسق سب کچھ درہم برہم کر کے دکھ دیا۔ملک میں انارکی پھیلا دی۔خوف و ہراس پیدا کر دیا۔''

لیکن فرحت علی سید کا یہ تجزیہ ہرگز درست نہیں کہ مجھے تو جنرل پرویز مشرف کا بولا لفظ سچا اور کھرا لگتا ہے۔''

جرنیل ذات کی حیثیت میں اچھے بُرے ہوتے ہیں لیکن حکومت چلانا اُن کے بس کا روگ نہیں۔۔۔۔پاکستان کی تاریخ اس کا زندہ ثبوت ہے۔ایک جرنیل نے دریا بیچ دیے۔دوسرے نے ملک توڑ دیا تیسرے نے قوم کو دنیا کی نظروں میں ذلیل کرا دیا اور چوتھے نے جمہوریت کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔

''مسافتوں کی تھکن'' ایک طویل افسانے کی طرح ہے جس میں ناول کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ اور یہ ایک قابلِ مطالعہ اور تاریخی دستاویز ہے۔

''ہم کہیں سُنا کرے کوئی''

مشکور حسین یاد

(•)

تنقید نگاری اُس وقت حماقت کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس وقت نقاد کی وہی بنیادی صفات جو اُس کی عزت و بقا کی ضامن ہیں اُس کے لیے مصیبت بن جائیں۔ میرا مطلب ہے نقاد کے لیے مخلص اور بے لاگ ہونا از بس ضروری ہے لیکن ایک غیر صحت مند معاشرے میں یہی دو اعلیٰ انسانی صفات علمی افراد کو تباہ اور ناکارہ کرنے کے لیے کافی ثابت ہوسکتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج کل ہمارے یہاں بے لاگ اور اخلاص سے مملو تبصرے شاذ ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ایسی تعارفی قسم کی تقریبات میں تو مدح سرائی کے علاوہ اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ادب میں نقد کا سرے سے قائل ہی نہیں ہوں۔ ادب کا سب سے بڑا نقاد تو اوّل خود ادیب ہوتا ہے اور دوسرا بڑا نقاد اُس کا قاری۔ اور یہ جو پیشہ ور نقاد قسم کی مخلوق خود رو گھاس کی طرح درمیان میں اُگ آتی ہے۔ اُس کی حیثیت میری نظر میں اُس قاضی سے ذرہ برابر زیادہ نہیں جس کے بارے میں مثل مشہور ہے۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ عموماً لوگ پیشہ ور نقاد اُس وقت بنتے ہیں جب اُنھیں اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ لکھنے لکھانے کی تخلیقی قوتوں سے محروم ہیں۔ پھر اُنھیں اپنی محرومی کا مداوا اِس کے سوا اور کہیں دکھائی نہیں دیتا کہ وہ کسی اُلٹی سیدھی علمیت کے بانس پر ٹنگ کر بیٹھ جائیں۔ اور وہاں بندروں کی طرح بیٹھ کر تخلیق کاروں کا مُنہ چڑائیں۔ ہمارے پیشہ ور نقادوں کے ساتھ تو ایک اور قباحت یہ بھی ہے کہ ان بے چاروں کے پاس علمیت اپنی نہیں۔ مانگے تانگے کے افکار و آراء کے بل بوتے پر سارا کام چل رہا ہے۔

غرض اِس تمہید سے میرے کہنے کا مطلب ہے کہ میں عذرا اصغر کے افسانوں پر ایک پیشہ ور نقاد کی حیثیت سے گفتگو نہیں کروں گا۔ اور اِس لیے آپ کو میری اِس گفتگو میں تنقید کے بندھے ٹکے اصول نظر نہیں آئیں گے اور نہ ہی مغرب کے قدیم و جدید نقادوں کے خیالات ---- اور نام ہائے نامی دکھائی دیں گے۔ میں تو ایک عام قاری کی حیثیت سے اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اِس سے قبل ایک اور بات عرض کرتا چلوں کہ ادب میں اگر تنقید تعریف و توصیف کی صورت میں ہو تو کیا قاری کیا مصنف اور کیا ادب، سب کے حق میں بہتر رہتا ہے۔ جہاں تک نقائص کا سوال ہے اُنھیں تخلیق کار پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ جو ادیب یا تخلیق کار اپنی تخلیق کو کڑی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا سمجھ لیجیے وہ بڑا تخلیق کار نہیں ہے۔

لہٰذا اب اگر میں یہ کہوں کہ جیسے ہی میں نے عذرا اصغر کی کتاب کے ابتدائی دو تین افسانے پڑھے تو مجھے یہ محسوس ہوا جیسے ہر افسانے میں ایک آنچ یا پانچ آنچوں کی کسر رہ گئی ہے۔ تو میرا یہ تاثر بالکل بکواس کہلانا چاہیے۔ اِس طرح اگر میں یہ کہوں کہ ہماری افسانہ نگار خاتون جب بھی سنجیدہ مسائل پر قلم اُٹھاتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ تکلف سے کام لے رہی ہیں۔ تو اسے کیوں نہ میری نہایت فضول بات سمجھی جائے؟ اول تو کسی فن میں ایک آنچ کی کسر رہنا اِس فن کے ارتقا پذیر ہونے کی دلیل ہے دوسرے یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میرے پڑھنے اور سمجھنے ہی میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہو۔ اسی طرح سنجیدہ مسائل کو پڑھتے وقت میرا یہ محسوس کرنا کہ لکھنے والا تکلف سے کام لے رہا ہے کہیں اِس بات کی غمازی تو نہیں کرتا کہ سنجیدہ مسائل کو پڑھتے وقت خود مشکور حسین یاد کے ذہن کی طنابیں کھنچنے لگتی ہیں۔

مطالعہ کے دوران مجھے یوں بھی لگا کہ محبت کے موضوع پر لکھتے وقت عذرا اصغر کا قلم ہزار سرپٹ دوڑنے کے باوجود ٹھہر کر لکھا جاتا ہے۔ کبھی چلتے چلتے گھوڑے کی طرح بدکتا بھی ہے اور آپ جانتے ہیں گھوڑا چلتے چلتے بدک جائے تو اُس پر سوار آسانی سے قائم نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ عذرا اصغر اپنے میاں اصغر مہدی سے یوں نہیں ڈرتیں پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ انھیں اصغر مہدی کا خیال بدکا رہا ہے۔ غالباً اِس کی وجہ بھی میری اپنی ذاتی ہے کیونکہ محبت کے موضوع پر کچھ لکھنا تو بڑی بات ہے میں نے اس موضوع پر کبھی کوئی بات بھی کی ہے تو اپنی بیوی کے خیال سے خود کو بُری طرح بدکتا ہوا پایا ہے۔ عذرا اصغر کے افسانوں کی ہیروئن عاشق اور بھائی میں بہت کم فرق محسوس کرتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ معاملہ گڈ مڈ ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بھی بدکنے والی بات نہیں ہے۔ یا یہ اس بات کا اظہار ہے کہ ہمارے معاشرے میں کُھل کر محبت کرنے کا کوئی سکوپ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں دوسری بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ عورت پھر عورت ہے ہمارے یہاں تو مرد کُھل کر محبت نہیں کرسکتا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں راقم الحروف نے کئی بار بلکہ سینکڑوں بار یہ ارادہ کیا کہ اس دفعہ تو جو ہو سو ہو عشق کرنا ہے اور ڈٹ کر کرنا ہے لیکن کبھی کچھ نہ ہوسکا اور آخر شادی پر آ کر تان ٹوٹی ---۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہم لوگ اپنی بیویوں سے بھی عشق نہیں لڑا سکتے۔ اُن کی طرف دیکھ کر آنکھ بھی ماریں تو بدمعاشوں اور لچوں کی فہرست میں شامل ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ مجھے یہ بات بھی بُری طرح کھٹکی کہ عذرا کے افسانوں کا ہیرو عموماً ہوس کار اور ہرجائی ہوتا ہے لیکن اِس کے باوجود ہیروئن اُس سے پیار کرتی ہے، اُس کی یاد کو عمر بھر سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ یقین کیجیے اگر میں افسانے لکھتا اور میرے افسانوں کا ہیرو اس طرح کا ہرجائی اور ہوس کار ہوتا تو اپنی ہیروئن سے یا اُس کے والد محترم سے یا اُس کے برادران گرامی قدر سے اُسے وہ جوتے لگواتا کہ بچوں کو چھٹی کا دودھ عمر بھر یاد آتا رہتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ بھی میری بھول ہے ہمارے معاشرے میں ابھی تک عورت اِس قدر مظلوم ہے کہ وہ غریب کسی جگہ بھی کوئی حوصلہ نہیں دکھا سکتی۔ رہا مرد کے ہرجائی ہونے کا سوال تو یہ اُس کی فطرت ہے۔ ہم کب

ہرجائی نہیں ہوتے کون ایسی طرحدار خاتون ہے جسے اپنی معشوقہ بنانے کو ہمارا دل نہ چاہا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی حسین کو دیکھنے کے بعد آئینے میں ہم نے اپنی صورت دیکھی تو ہم اپنے آپ کو عاشق کے بجائے منشی اُدھار چند شکار پوری زیادہ نظر آئے۔ خدارا انصاف سے کہیے کبھی ایک عاشق شخص چغد اور بے وقوف دکھائی دے سکتا ہے؟ عشق سے تو آدمی کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور اُس کے تمام حواس یوں بیدار ہوتے دکھائی دیتے ہیں کہ اس کی پوری ذات میں چراغاں سا ہو جاتا ہے۔ بہرحال اگر ہمیں اپنی سیرت اور صورت میں کوئی کام کی بات نظر آ جاتی تو آج ہم یقیناً ایک بہت بڑے عاشق کی حیثیت میں آپ کے سامنے کھڑے ہوتے۔

غالباً عذرا اصغر کی یہ پہلی کتاب ہے جسے میں نے ناک کی سیدھ میں ہو کر پڑھا ہے میرا مطلب ہے پہلے افسانے سے شروع ہو کر ۲۳ ویں افسانے تک۔ میں جیسے ہی افسانہ نمبرے پر پہنچا۔ اور اسے پڑھنا شروع کیا تو مجھے اِس بے ڈھب افسانے میں اپنے ڈھب کی بہت سی باتیں دکھائی دیں۔ پہلی اور بنیادی بات تو یہی ہے کہ قریب قریب ہر آدمی کو جوانی میں بہت سے حسین اور لذیذ مواقع حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی جوانی کی ٹیں میں نہ کسی مواقع کے حسن سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتا ہے اور نہ اُن کی لذت سے کما حقہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ عذرا اصغر کے اس افسانے بے ڈھب کا ہیرو ایک بلڈنگ میں ایک کمرا کوئی رسالہ نکالنے کے لیے کرایہ پر لیتا ہے۔ ابھی وہ اس کمرے کا تالا کھول رہا ہوتا ہے کہ اُسے اپنے عقب میں سے ایک نسوانی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کی بقول عذرا اصغر کے چکر مکر سی عورت ہے۔ وہ پہلے خود اِس آنے والے نوجوان کو اپنی طرف مائل کرتی ہے اور جب وہ اُس کی طرف مائل نہیں ہوتا تو پھر وہ عورت اپنی بیٹی زرینہ کو اُس کے پاس کمرے میں چھوڑ جاتی ہے۔ اور جب وہ زرینہ کو بھی دھکے مار کر کمرے سے باہر نکال دیتا ہے اور خود کمرے کو تالا لگا کر چلا جاتا ہے تو زرینہ کی ماں آ کر زرینہ کو کہتی ہے ''گشتی، حرامزادی ایک بابو کو قابو نہیں کر سکی اپنا آپ بیچ کر میں تیرے فیشن کب تک پورے کرتی رہوں گی۔'' اس پر زرینہ جواب دیتی ہے ''ماں وہ بابو مرد ہی کب ہے جس کے پاس تو مجھے چھوڑے جا رہی ہے''۔۔۔۔قصہ دراصل یہ ہے کہ جوانی کا زمانہ ہی واحد وہ زمانہ ہے جس میں آدمی جنسی اعتبار سے اپنا کوئی نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے جس طرح جوانی میں آدمی جنسی معاملات میں جلد بازی سے کام لیتا ہے اُسی طرح اِن معاملات میں نظم و ضبط کا مظاہرہ بھی ایک جوان آدمی ہی کے بس کی بات ہے۔ خرابی صرف یہ ہے کہ جوان آدمی کے اس نظم و ضبط کو عام لوگ نامردی کا نام دے دیا کرتے ہیں۔ راقم الحروف اِس نامردی کا آج تک شکار ہے ورنہ آپ جانتے ہیں جنسی معاملات کے حوالے سے ادھیڑ عمر سب سے زیادہ خطرناک عمر ہوتی ہے کیونکہ اِس عمر میں لذیذ مواقع پر نظم و ضبط سے کام لینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں لہٰذا ہماری ہمت دیکھئے کہ ہم اپنے دل پر بہت بڑا پتھر رکھ کر عموماً خواتین کو نہایت مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ جوانوں کی نسبت ادھیڑ عمر کے مردوں سے ملنے میں احتیاط سے کام لیا کریں۔ غرض عذرا اصغر صاحبہ نے اپنے اِس بے ڈھب عنوان کے افسانے میں نہایت سادگی اور بے تکلفی سے ایک بہت بڑی حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ افسانے کے عنوان کا ذکر آیا ہے تو اِس ضمن میں ہمارے ایک دو عامیانہ سے تاثرات سنتے چلئے۔ عذرا اصغر افسانوں کا عنوان قائم کرنے میں بھی کوئی پروا نہیں کرتیں۔ مثال کے طور پر کتاب کے پہلے ہی افسانے کو لیجئے۔ اِس کا عنوان ہے گھس بیٹھئے۔ ہم کتاب کھول کر افسانہ پڑھنے بیٹھے تو ہمارا ناہنجار ذہن گھس بیٹھئے کے پہلے حصے گھس پر اٹک کر رہ گیا۔ گھ اور س کے چکر میں آ کر ہماری عقل نے گھاس چرنا شروع کر دیا۔ افسانہ پڑھا تو پتہ چلا کہ زبان و بیان اور تکنیک سے قطعِ نظر اِس افسانے میں عذرا اصغر جذباتی اعتبار سے انتظار حسین سے آگے نکل گئی ہیں انتظار حسین قیام پاکستان سے قبل کی یادوں میں بری طرح گھرے ہوئے ہیں وہ ان سے کسی صورت نکل نہیں پاتے لیکن عذرا اصغر نے اِس افسانے میں اُن یادوں کو ایک عزم کے ساتھ اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی ہے۔ گھس بیٹھئے کے بعد دوسرا افسانے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں عذرا اصغر نے اپنے والد محترم کی یاد میں تحریر کیا ہے۔ گویا یہ ایک خودسوانحی افسانہ ہے۔ اِس کے بعد تیسرا افسانہ پڑھنے بیٹھا تو اُس کا عنوان ''آڑو کے پھول'' تھا۔ پہلے تو ہمیں چند ثانیے آڑو کی ڑ ہی نے اپنے صوتی فسوں میں باندھے رکھا۔ ڑ کے روڑوں سے نکلے تو ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ کیا ہم نے آڑو کے پھول دیکھے ہیں۔ ہم نے آڑو کے پھول تا حال نہیں دیکھے اِس لیے آڑو کے پھولوں کے حُسن سے متاثر ہونے کے بجائے ہمارا ذہن آڑو۔ آڑو ہم نے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ اُس کے کھٹ میٹھے ذائقہ سے لُطف اندوز بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو ہم بتائے دیتے ہیں کہ قیام پاکستان سے قبل ہماری زندگی کا بیشتر حصہ حصار کے علاقے میں گذرا ہے اور یہاں ڈھیٹ قسم کے آدمی کو گالی کے طور پر آڑو کا بیج کہتے ہیں۔ ہم جب تک آڑو کے پھول افسانہ پڑھتے رہے ہمارا بازاری ذہن آڑو کے بیج سے آگے نہیں بڑھا۔ یہ ساری خرابی ہمارے ذہن کی ہے جس کے لیے ہم اپنی افسانہ نگار خاتون سے معذرت خواہ ہیں۔

اب ذرا عذرا اصغر صاحبہ کے اسلوب افسانہ نگاری کی طرف آیئے۔ میں سمجھتا ہوں عذرا اصغر کا اسلوب خالصتاً اُن کا اپنا ہے۔ ورنہ آپ کو معلوم ہے ہمارے بڑے بڑے افسانہ نگاروں نے مغرب کے افسانہ نگاروں سے یا تو اسلوب چُرائے ہیں یا چراغ سے چراغ جلایا ہے۔ غلام عباس صاحب نے ایک نجی محفل میں ہمارے سامنے اِس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا کہ اگر وہ مغربی افسانے نہ پڑھتے تو اُن کے افسانے ایسے نہ ہوتے جیسے کہ ہم اور آپ آج دیکھ رہے ہیں۔ اِسی طرح میں سمجھتا ہوں اگر انتظار حسین نے مغربی ناول کا بغور مطالعہ نہ کیا ہوتا۔ تو وہ اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے اپنا عمدہ ناول بستی کبھی نہ لکھ

سکتے۔ واضح رہے کہ میں نے صرف اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے بستی کو ایک عمدہ ناول کہا ہے۔ اسی طرح مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ اگر انتظار حسین کا فکا کو نہ پڑھتے خصوصیت کے ساتھ اُس کا مشہور افسانہ Matamathics تو وہ اپنا افسانہ کایا کلپ کبھی نہ لکھ سکتے۔ اسے خیر چوری تو کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔ مگر انتظار صاحب نے چراغ سے چراغ خوب جلایا ہے اور اپنے افسانے کو داستاں کی روایت سے بھی نہایت چابکدستی کے ساتھ پیوند کیا ہے۔ مجھے عذرا اصغر کے افسانوں میں اس طرح کی پیوند کاری اور چراغ سے چراغ جلانے والی بات کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ تو اپنے انداز میں کہانی سُناتی ہیں اور نہایت بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ۔ لیکن یہاں خاص طور پر عذرا صاحبہ کے لیے ایک بات عرض کرتا چلوں کہ غلام عباس نے اُسی محفل میں یہ بات بھی کہی تھی کہ اگر ہم بدیسی افسانوں کا مطالعہ نہ کریں تو زندہ نہیں رہ سکتے اور پھر اُنھوں نے مثال کے طور پر اپنے ایک ہم عصر کا ذکر کیا تھا جن کے افسانوں کی اُٹھان خوب تھی لیکن مطالعہ نہ کرنے کے باعث وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے جلدی ختم ہو گئے مجھے اُن صاحب کا اِس وقت نام یاد نہیں آ رہا بہر حال بات عذرا اصغر کے افسانوں کی تکنیک پر ہو رہی تھی۔ ممکن ہے عذرا اصغر کی تکنیک ہمیں فی الحال زیادہ موثر نظر نہ آئے کیونکہ پیشہ ور نقادوں نے بدیسی افسانوں کی تکنیک کے گُن گا کر اور ہمارے بڑے افسانہ نگاروں نے اسے اپنا کر ہمارے ذہنوں کو خاصا متاثر کر رکھا ہے۔ ویسے عذرا کبھی کبھی یکا یک موڑ پیدا کرنے والی اور اچنبھے میں ڈالنے والی تکنیک بھی استعمال کر لیتی ہیں۔ اس کے ثبوت میں ہم اُن کا افسانہ سات تصویریں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ عذرا کی قوتِ مشاہدہ کو دیکھنا ہے تو اُن کا افسانہ تماشا مرے آگے پڑھ کر دیکھیے آپ کو معلوم ہو گا کہ ہماری افسانہ نگار خاتون نچلے طبقے کی زندگی کی جزائیات سے کس قدر واقفیت رکھتی ہے۔ زہر قند میں عذرا نے مامتا کو بالکل نئے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ سہارا میں چڑے چڑیا کی کہانی کو بالکل تازہ انوکھے اور بہت ہی خوبصورت اسلوب میں پیش کیا ہے۔ یوں عذرا اصغر کے اسلوبِ خاص کو آپ الگ سے دیکھنا چاہتے ہیں تو اِس کے لیے اُن کا افسانہ ڈوبتے ساحل ملاحظہ کر لیجئے۔ ویسے مجھے اِس کتاب کی ایڈیٹنگ میں بھی ایک خاص بات نظر آئی ہے۔ عام طور پر کتاب کے پہلے حصے میں زیادہ اچھی چیزیں پیش کی جاتی ہیں لیکن پت جھڑ کا آخری پتا کی یہ ایک خصوصیت منفرد ہے کہ اُس کا پہلا افسانہ زینے کا پہلا قدم ہے اِس کے بعد آپ اوپر ہی اوپر جاتے ہیں۔ محبت اور سیاست کتاب کا آخری افسانہ ہے لیکن یہ زینے کا آخری قدم بھی ہے۔۔۔ یہ میرا تاثر ہے آپ کو اِس سے اختلاف کا پورا حق حاصل ہے۔

آخر میں ایک اور بات عرض کر کے آپ سے اجازت چاہوں گا۔ معاف کیجئے ہمارا معاشرہ عورت کا ندیدہ معاشرہ ہے۔ ایسے معاشرہ میں کسی خاتون کا ادیب یا شاعر ہونا خود اُس کے لیے اور اُس کے خاندان والوں کے لیے اور خصوصیت کے ساتھ اگر وہ خاتون شادی شدہ بھی ہے تو اس کے شوہر کے لیے مصیبت سے کم نہیں۔ اور ایسی صورت میں تو معاملہ اور بھی سخت مشکلات اور پریشانیوں کا باعث بن جاتا ہے جب کوئی خاتون ابھی ادیب یا شاعر بننے کے دائرہ عمل میں سے گزر رہی ہو۔ ایسے وقت میں مجھ ایسا اونگا بونگا ادیب یا شاعر اُس خاتون کا ہمدرد اور صلاح کار بن کر اُس کی قربت کا خواستگار ہوتا ہے۔ چلئے کسی حد تک قربت کی اس خواستگاری کو میں بُرا نہیں سمجھتا آخر میر صاحب نے بھی تو فرما دیا تھا۔

شعر ہوتا ترا شار اے کاش

لیکن افسوس اور غصہ تو اس وقت آتا ہے جب مجھ ایسے کمزور ادیب یا شاعر اُس خاتون کی قربت حاصل کر کے اپنے دوستوں کی محفل میں اِدھر اُدھر کی ہانکتے ہیں۔ میرا خیال ہے عذرا اصغر کو اچھے ساتھی اور ہمدرد صلاح کار ملے ہوں گے لیکن آخر وہ ہمارے معاشرے میں جو عورت کے لیے بے حد ندیدہ معاشرہ ہے سانس لے رہی ہیں کچھ نہ کچھ اس کے ندیدے پن کی ذہنی تکلیف تو اُنھیں بھی ہوئی ہو گی اِس لیے وہ داد کی مستحق ہیں کہ ان تمام جھمیلوں میں سے گزر کر ادب کی راہ پر حوصلے کے ساتھ گامزن رہیں۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا تنقید کرنا تو ایسی حماقت ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ایسی صورت میں جب تنقید کرنے والا مخلص بھی ہو اور صاف گو بھی۔ اِس کے علاوہ تنقید یوں بھی حماقت بن جاتی ہے کہ تخلیق کار نہ جانے کتنے درد و کرب سے گزر کر کوئی چیز تخلیق کرتا ہے اور مجھ جیسے کم شعور اور بے درد افراد اس میں کیڑے ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ہم لوگوں کا ظرف اتنا چھوٹا ہو گیا ہے کہ ہم کسی کی خوبیاں دیکھ ہی نہیں سکتے۔ سب سے پہلے ہماری نظر کوتاہیوں کی طرف جاتی ہے اور اگر خوبیاں بیان بھی کرتے ہیں تو اِس طرح جیسے خوشامد کر رہے ہوں ویسے آپ جانتے ہیں خامیوں کی نسبت خوبیوں کو دیکھنا اور محسوس کرنا زیادہ مشکل کام ہے۔ اور ہم لوگ مشکلات سے بہر حال جی چراتے ہیں۔

ترغیب

جب امریکہ میں غلامی اپنے عروج پر تھی تو ایک ہیریٹ نامی خاتون نے خفیہ تنظیم بنائی جو غلاموں کو بھاگ جانے میں مدد کرتی تھی۔ ایک بار اس خاتون سے پوچھا گیا کہ تمہارے مشن میں سب سے مشکل مرحلہ کونسا ہوتا تھا؟ تو اس نے کہا کہ غلام کو ترغیب دینا کہ تم غلام نہیں اور آزاد ہو سکتے ہو۔ یہی سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔

○

پت جھڑ کے افسانے

الطاف فاطمہ

(●)

اس پت جھڑ کے آخری پتے نے تو میرے اُوپر ایک وقت ڈال دیا۔ پانی کا ایک ٹھنڈا یخ کٹورا اپنے اندر اُتارتی کتاب ہاتھ میں اٹھاتی ایک افسانہ پڑھتی ایک ٹھنڈی سانس لے کر کتاب ڈال دیتی اور اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتی۔

نہ لال باغ جاتے
نہ بالم کھیرا کھاتے
نہ انگلی کٹتی نہ جان جاتی۔

کوئی میرے اندر مسلسل کہہ رہا تھا۔ واقعی نہ اس رات میں 90C میں بیٹھی ہوتی نہ عذرا اصغر سے ملتی اور نہ اس کی بھولی بھولی پیاری پیاری صورت پر فدا ہو کر اُس سے۔ اِس پت جھڑ کے آخری پتے پر کچھ کہنے کا وعدہ کر بیٹھتی۔

اور اب اے میرے معبود اے زمینوں اور آسمانوں کے مالک میں کیا کروں اور کیا کہوں مگر زمینوں اور آسمانوں کے مالک کو اس طرح کے جواب دینے کی فرصت کب ہے۔ وہ خود تو جانے کن انتظاموں میں لگا رہتا ہے اور آپ کے سوالوں کے جواب خود آپ کے فیصلوں اور ارادوں سے دلواتا ہے۔

اب فیصلہ تو انسان یہ بھی کر سکتا ہے کہ چلو کہہ دیں گے کہ لو یہ بھی کوئی افسانے ہوئے نہ کوئی دھماکہ نہ حیرت۔ نہ کوئی اشارہ نہ علامت نہ تجرید۔ لیکن مشکل تو یہی ہے کہ میں ایسا نہیں کہہ سکتی۔ اور یہی میرا فیصلہ ہے کہ میں ایسی کوئی بات نہیں کہوں گی۔ اس لیے کہ افسانہ تو خیر ہے اور قطعی ہے اور بہت خوب ہے۔

پھر مشکل کیا ہے۔

دراصل میری مشکل یہ ہے کہ مجھے عادت ہو گئی ہے اور طرح کے افسانے پڑھنے کی۔ اس لیے جب عذرا کے سیدھے سیدھے افسانے میری نظر سے گزرے تو میرے ذہن میں ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی جس کو گھپلا کہا جا سکتا ہے۔

سب سے زیادہ حیرت تو مجھے عذرا کی ڈگر سے ہٹ کر چلنے والی حرکت پر ہوئی۔ اب اتنے سیدھے افسانے لکھنے کا فیشن کب رہا ہے۔ لیکن کیا اس فیشن والی بات سے عذرا کے افسانوں کی افسانویت اور فنی تکمیل میں کوئی فرق آیا ہے؟

عذرا کے افسانے نہ صرف مکمل ہیں بلکہ ان میں ایک عجیب سی گھما گھمی ہے۔ زندگی کی گھما گھمی جذبوں کی خیالوں کی گھما گھمی۔

آپ افسانہ پڑھتے جائیں اور کہتے جائیں کہ اونہہ کیا سیدھا سا افسانہ ہے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکیں گے کہ کیا سپاٹ افسانہ ہے۔۔۔۔ دراصل عذرا کے افسانے میں ایک قسم کی الماسیت ہے۔ جی ہاں ترشے ہوئے ہیرے کی چکا چوند اور دمک اپنی جگہ پر ہوتی ہے لیکن الماس یعنی In cut diamantion کی گھمبیرتا اور حلیمی اپنی جگہ ایک چیز ہوتی ہے۔ الماس ایک ٹھنڈا اور باوقار نگینہ ہے۔

اُسی الماسیت یعنی باوقار اور ٹھنڈے طرز اظہار نے ان افسانوں کو لطافت بخشی ہے۔ اس کے اسلوب کو ایک منفرد حسن عطا کیا ہے جو الماس کی طرح گراں قدر بھی ہے اور دیرپا تاثر کا حامل بھی ہے۔

پت جھڑ کے افسانوں کے مطالعہ کے دوران میں نے بہت ٹھنڈا پانی پیا اور بہت گہری سانسیں کھینچیں لیکن اس کی وجہ بے اطمنانی نہ تھی بلکہ اپنے اندر کی تڑختی ہوئی وہ سنگلاخی تھی جو افسانے کے فن کے بارے میں میں کچھ دن سے محسوس کر رہی تھی۔ بہر حال عذرا کے کے افسانوں کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر جو بھی خیال آیا جو بھی شبہ و تشکیک پیدا ہوئی ہو۔ ایک بات بالکل واضح ہے۔ وہ ہے ایقان اور Commitment۔ عذرا کا Commitment بڑا واضح ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے فن کے جسم کی وریدوں اور شریانوں میں پاکستان کی نمائندگی خون اور زندہ صالح خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہی اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ عذرا کی وفا اور عذرا کا ایقان مضبوط واضح اور حرارت مندانہ ہے۔ وہی جو ایک آزاد قوم کا افتخار ہوتا ہے۔ اس کی پہلی تمنا۔ پہلی ہمدردی اور پہلا کرب اپنے وطنی مسائل کے ساتھ ہے۔ وہ اس فرق کو صرف دو سطروں میں بڑی خوبی اور خوش آرائی سے واضح کر دیتی ہے۔ جو ایک محکوم اور آزاد قوم کے افراد میں ہوتا ہے گھس بیٹھے میں وہ ایک جگہ کہتی ہے۔

''ان دنوں بزرگوں کی زبان پر عموماً ''لام'' کا نام تھرتھرایا کرتا تھا۔ ہاں شاید کہیں جنگ ہو رہی تھی۔ کہاں اور کیوں؟ ہمارے ناپختہ ذہن اس جستجو سے دور تھے۔ یہ تو ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو دنیا کی دوسری عالمگیر جنگ تھی جس سے بے نیاز ہم دھما چوکڑی میں مصروف رہا کرتے۔ رضوان بھیا! وہ کیا زمانہ تھا۔ بے خبری مدہوشی جہاں خوشیوں کے سوا کوئی دوسرا احساس ہی نہ تھا اور اب کیسا وقت ہے کہ میری ننھی بچی بھی مشرقی پاکستان میں لحہ بہ لحہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تپش اپنے سینے میں محسوس کرتی ہے۔ سچ بھی تو ہے اپنا گھر جل رہا ہو تو کون سا دل ہو گا جو اس کی آنچ محسوس نہ کرے گا۔ اس آگ میں جل کر بھسم نہ ہو جائے گا۔''

پھر اسی افسانے میں ایک جگہ کہا ہے

''مگر تم نے مجھ سے نہیں میری پوری قوم سے انتقام لینا چاہا۔ اپنے فیصلے سے تم نے مجھ سے ہر رشتہ اور ناتہ ختم کر لیا۔ محض اس لیے کہ مجھے پاکستان سے محبت تھی۔''

عذرا کے فن میں یعنی اُس کے دل میں صرف جنگ سے ہی نفرت اور وطن پرستی کے اور چھچھلے جذبے ہی نہیں۔ بلکہ جذبوں کی وہ استواری ہے جو دوسرے تمام جذبوں کو متوازی کرتی اور ان کا تحفظ کرتی ہے ان جذبوں میں سے ہر جذبے کا ایک علیحدہ مقام ہے۔

''وہ محبت جو تھی جو ہے اور رہے گی۔ اور اس طرح تم نے میرے دل کے کونے میں چپکے سے ہی میں نفرت کا بیج بو دیا۔''

اوراس کے بعد وہ اصل بات پر آتی ہے۔

''جومیری لازوال محبت کے مقابلے میں پھل پھول تو نہ سکا مگر تم نے بنیاد کھڑی کر دی تمھاری محبت جو برگد کی گھنی چھاؤں ہے ریشم کے تاروں کی طرح کومل ہے۔ پہاڑی جھرنے کی مانند مترنم ہے اور چاندنی جیسی مدھر۔ وطن کی محبت فرض ہے۔ فرض سے غفلت گناہ ہے اور میں چھ سال پہلے پورے سترہ دن اسی محبت اور فرض کی سولی پر لٹکی رہی ہوں۔ پینسٹھ کی جنگ سے کچھ ہی پہلے تو رضا نے مجھے لکھا تھا کہ تم فوج۔۔۔۔میں بھرتی ہو گئے ہو آگے چل کر ایک جگہ لکھتی ہیں۔

''تمھاری وجہ سے میرے وطن کے نغمہ بار گیت موت کی نیند سوتے جا رہے ہیں سرسبز کھیتیاں جھلس کر خاکستر ہو رہی ہیں۔ میری پدما کا پانی سرخ ہو گیا ہے۔''

عذرا نے محبت کی تعریف یوں کی ہے ''پہاڑی جھرنے کی مانند مترنم اور چاندنی جیسی مدھر۔''

چوں کہ عذرا کے فن کی بنیاد محبت پر ہے اس لیے ترنم اور مدھرتا اس کے افسانوں کا بنیادی تاروپود ہے۔

پاکستان عذرا کے افسانوی تاروپود میں محض جنگ اور خونریزی کے حوالے ہی سے نہیں بلکہ زندگی کے ہر حوالے سے موجود ہے۔ سب سے بڑھ کر تو محبت کا وہ تصور ہے جو ہمارے ہی معاشرے میں سر اٹھا سکتا ہے اور اسی پیچ وخم میں پروان چڑھتا ہے کبھی زرد، گٹھیلے اور کبڑے درخت کی صورت میں کبھی لنجے اپاہج اور گہنائے ہوئے پیڑ کے روپ میں کبھی نیم کے تناور اور صحت بخشیں چھاؤں والے پیڑ کے انداز میں۔ آج کے پورے مشرق کی محبتوں اور نفرتوں کی بات پوری ضمانت اور یقین سے کون کر سکتا ہے۔ البتہ اپنی بات ہی انسان پورے یقین و اعتماد سے کر سکتا ہے۔ محبت کے یہ انداز ہمارے ہی جینے کی ایک ادا کہی جا سکتی ہے۔ جہاں ایک محبت کرنے والا اپنی مجبوریوں کے تحت اپنے آنگن میں آڑو کا پیڑ نہ لگا سکا۔ آڑو کا پیڑ جو اس کی محبوبہ کا انتخاب تھا۔ فرمائش تھی۔ جس پر شگوفے کھلتے اور رسیلے خوش رنگ پھل لگتے ہیں۔ تب دیکھئے وہ کیا کہتا ہے دیکھئے ہی نہیں سوچئے اور محسوس کیجیے کہ کیا اس بات پر آپ کے رونگٹے کھڑے نہیں ہو جاتے کہ۔۔۔

''میرے گھر کا رقبہ پانچ مرلے تھا۔ جہاں کئی زندگی کے پودے ٹھونسم ٹھاس اوپر تلے بھرے ہوئے تھے۔ گلریز چلی گئی اور میں نے وہ نظم پھاڑ کر پھینک دی اور اس کے بعد کوئی شعر نہیں کہا اور اپنا چھوٹا سا مکان اپنی بیوہ بہن کے سپرد کر کے اِدھر اُٹھ آیا جہاں پانچ سو روپے کی قلیل سی ڈوری لے کر رابعہ میری بیوی مہینے کے تیس اکتیس دنوں کو جکڑ لینے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے۔''

مایوسی کے صحراؤں میں محبت کے گُلِ لالہ کے بھولنے کا چلن تو ہمارا ہی ہے۔

پت جھڑ کے آخری پتے کے افسانوں میں محبت کبھی پانچ مرلے کے مکان سے گھر بدر ہو کر بھی زندہ رہتی ہے کبھی ڈوبتے ساحل میں مروا کے سفید ننھے ننھے پھولوں سے لدے گھنیرے درخت کے نیچے شلوار کے بھیگے پائنچے سنبھالے کھڑی لڑکی کی استوار اور لازوال یاد بن کر سر اٹھاتی ہے اور پروارت کی کسک بن کر رہ چمکتی ہے۔

''پاتال میں الاؤ کے گرد بیٹھے لڑکے اونچی آواز میں ہیر گانے لگتے ہیں۔ اور آج وہی زلیخا میرے پاس خود آئی ٹھہری۔ جھجکی اپنا سر میرے قدموں پر رکھا اور میری بے نیازی سے دل برداشتہ ہو کر دور تک تیرتی چلی گئی گدلے پانی کی بپھری لہروں پر ڈولتی اچھلتی مگر میں نے کب بھلا زلیخا کی تمنا کی تھی مروا کے پیڑ تلے کھڑی تم برہم نہ ہوئینی! میری تمنا میری زندگی تم ہی تو ہو۔ مگر زندگی کی تلخ حقیقتیں مجھ پر آشکار ہو چکی ہیں اور ایک بے حد تلخ حقیقت یہ ہے کہ میں کئی مکانوں کے ملبے پر بیٹھا ہوں۔

لیکن عذرا کے سامنے محض ایک مسئلہ محبت ہی کا نہیں ہے۔ پاکستان کا تشخص محض محبت بن کر ہی اس کے افسانوی فن کی رگ و پے میں نہیں دوڑتا بلکہ زندگی کی ہر جیت اس کی ہار اس کی جہت بن کر اس کے اندر سمایا ہوا ہے۔

اس کے افسانوں میں سماجی طبقات ہیں۔ اور ان سے متعلق ہر نوع کے انسان بھی۔ بچے بھی ہیں نوخیز اور نورس شباب اور بڑھاپا بھی ہے کوٹھیاں بھی ہیں۔ متوسط گھروں کے افسردہ آنگن بھی ہیں۔ شاگرد پیشے بھی ہیں۔ غرض موت و ممات کے مختلف رنگ بہاؤ ان افسانوں میں موجود ہیں لیکن سب کا خمیر اور خوبو ایک مخصوص مٹی اور ماحول سے اٹھا ہے۔ معاشرے اور اقدار کی اچھائیاں اور برائیاں غرض جو کچھ بھی ہے اپنا ہی ہے۔ لیکن اس اپنائیت میں محدودیت نہیں ہے اس لیے کہ افسانہ نگار کا سروکار انسان کے بنیادی جذبوں سے ہے۔

پت جھڑ کے آخری پتے میں شامل پہلے سے لے کر آخری افسانے تک سوچ اور فکر تہ در تہ نظر آتی ہے۔ پیاز کے چھلکوں کی سی شاداب گلابیاں لیے پوست در پوست کئی پرتیں ہیں۔ کئی پوستین اترتی اور نئی نمودار ہوتی ہیں۔ کئی موضوع بدلتے ہیں۔ ہر نئے موضوع نے کسی خیال اور تصور کو ابھارا ہے۔ موضوعات کا یہ تنوع مسلسل تجرباتی مرحلوں سے گزرا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا افسانہ ڈوبتے ساحل پڑھتے پڑھتے میں چونکی تھی۔ اس لیے کہ یہی وہ مقام تھا۔ جہاں پہنچ کر میری چھٹی حس نے اشارا کیا کہ اس ساحل تک پہنچتے پہنچتے عذرا کا فن خراد سے گزر رہا ہے۔ سیاہ اور جلا ہوا لوہا ڈھل کر صورت پذیر ہوتا ہے۔ اس میں آب وتاب اور لشک پیدا ہوتی ہے۔ یہ آب وتاب یہ لشکارا اگلے کئی افسانوں میں جھمکتا ہے کھوکھلی دیوار۔ مدوجزر اور لمحوں کے اسیر ایسے ہی افسانے ہیں۔

عذرا کے افسانوں میں ایک تجرباتی سعی ملتی ہے پت جھڑ کے آخری پتے میں زندگی کی لہر بہر موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ کرداروں کا اپنا ایک تشخص ہے۔ تجربے کے اس مرحلے میں کئی ایسے افسانے ملتے ہیں جن میں کبھی کبھی کچھ مانوس اور جانے پہچانے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے کبھی کبھی کوئی سایہ سا گزرتا محسوس ہوتا ہے لیکن جس طرح ہر چلنے والے کے قدم پڑنے کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے ہر سایہ موہوم ہونے کے باوجود اپنی ادا رکھتا ہے۔ اسی طرح جب قدموں کی چاپ ابھرتی ہے جب سایہ نمایاں ہوتا ہے تو اس میں عذرا کا تشخص واضح نظر آتا ہے۔ مثلاً سہارا ایک ایسی کہانی ہے جس کے آغاز ہی میں شک سا گزرتا ہے کہ جیسے اس چڑیا سے پہلے کہیں ملاقات ہوئی ہے۔ کہیں یہ وہی یلدرم

والی چڑیا تو نہیں جو اپنے چڑے کے ساتھ ایک گھر کی چھت کی کڑیوں میں دبکے دبکے انسانی زندگی سے مماثلت پیدا کر چکی تھی۔ پھر ایک ہلکا سا شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ انتظار حسین والی چڑیا تو نہیں جو روشندانوں اور سردی کے سبب ٹھہرے ہوئے پنکھوں کے سروں میں اپنا آشیانہ لگاتی پھرتی تھی۔

یوں کہنے کو ساری گوریا چڑیاں جو چھتوں روشندانوں اور پنکھوں میں گھونسلے لگاتی ہیں یا پھر اجاڑ اور تنہا پاپولر کی ڈالیوں میں آشیانہ بنائے اپنی نازک سی چونچ پروں میں دبائے بیٹھی ہوتی ہیں سب ہی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بھوسلی بھوسلی مٹیالی مٹیالی کالی کالی آنکھیں مٹکاتی۔ مگر ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی ایک ادا ہوتی ہے۔ چنانچہ جس طرح انتظار حسین کی چڑیا۔ یلدرم کی چڑیا سے مختلف ہے اسی طرح عذرا کی چڑیا یلدرم اور انتظار حسین کی چڑیا سے مختلف اپنی ذات میں ایک فرو ہے۔ جس کا مسئلہ بھی مختلف ہے۔

اسی طرح جب میں محبت اور سیاست پڑھ رہی تھی تو اچانک ہی مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی ہے کسی کا آنچل سرسرایا ہے اور کوئی بہت قریب سے گزر رہا ہے۔ ارے یہ سایہ۔ یہ عصمت چغتائی اور ان کا افسانہ ننھی سی جان، مگر نہیں یہ عذرا کا اپنا افسانہ تھا۔

بس یہی عذرا کی انفرادیت ہے کہ اس کا افسانہ اس کی اپنی نہج اور اسلوب کا افسانہ ہوتا ہے۔

اور اب آخر میں مجھے ایک اور افسانے کی بات کرنے کی اجازت دیجئے۔ جو پت جھڑ کے آخری پتے میں شامل نہیں ہے۔ یہ افسانہ ہے۔ ''نیا پاندان'' یہ افسانہ کیا ہے حقیقت ہے کہ اس افسانے اس ماحول کی بیٹی کیا سمجھ سکتی ہے جہاں ماؤں کو اولڈ ہاؤسسز اور اسٹرینجرز ہومز میں رکھا جاتا ہے جہاں بوڑھی ممتا سے تلملائی خواتین جب پوتے نواسیوں کو گلے سے چمٹانے سے قاصر ہوتی ہیں تو اپنی ممتا کو کسی ربڑ کے گڈے یا کسی بلی کتے پر نچوڑ کر تسکین حاصل کرتی ہیں۔ اسی طرح اس جذبے کو کہ:

''آج کے بعد مجھے کوئی لڑکی کہہ کر نہیں پکارے گا۔ وہ سر بلند خاتون نہیں سمجھے گی جو تیرہ چودہ سال کی عمر میں اپنے بچپن کو فخریہ خیرباد کہہ کر اعلان کرتی ہے۔ کہ I am adult and grown up.''

جس گھر میں خود ماں ایک پرانے ڈھوبرے اور ٹوٹے برتن کی حیثیت رکھتی ہو۔ وہاں نئے اور پرانے پاندان کی تفریق کیا حیثیت رکھ سکتی ہے اس جذبے اور مسئلے کو سمجھنے کے لیے وہ خمیر درکار ہے جو ایک خاص مٹی سے اٹھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسے افسانوں پر وہ یہ حکم لگادے کہ یہ تو سیدھے سادے بیانیہ افسانے ہیں۔ ان میں کیا رکھا ہے مبارک ہیں وہ لوگ جن کو خالق نے خلق کیا اور پھر بیان کا طریق سکھایا۔

بقیہ : ''اردو ادب کا بازیگر''

''بیٹھ جاؤ''

''سامنے مجمع نہ لگاؤ''

جیسے مفتی جی کو پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں یا وہ دولہا ہوں۔ چہرے پر آئی ملاحت۔۔۔ دیکھنے کا اشتیاق۔

مفتی جی کی سالگرہ ان کے مداحین ہر سال چھوٹے یا بڑے پیمانے پر مناتے رہے ہیں۔ اس دفعہ نیلوفر اقبال پیش پیش تھیں۔ پروگرام ترتیب پا رہے تھے۔ بالآخر پروگرام بنتے بگڑتے اٹھائیس اکتوبر آ پہنچا تھا۔ اس تاخیر میں کچھ مفتی جی کی طبیعت کی اونچ نیچ کو بھی دخل تھا اور کچھ جگہ کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا۔

اٹھائیس اکتوبر کی رات بھیگ رہی تھی اور سالگرہ کا خوبصورت کیک کا ٹا جا رہا تھا۔ رات ہی کی طرح مفتی جی کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔ اتنی بہت سی محبتیں ان سے سمیٹے نہیں سمٹ رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ سے پیار کرنے والوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ تہمینہ کے پیارے اپنے باپ، محبت کرنے والے خسر کے ساتھ محبت کا عالم شوق دیکھ کر زمین پر نہیں ٹِک رہے تھے۔ مفتی جی کی شریک سفر ان کے برابر بیٹھی حیراں مسکراہٹ کے ساتھ اس گہما گہمی سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ ایسی والہانہ محبتیں تو کم ہی کسی کو ملتی ہیں۔

نیلوفر اقبال نے بلند آواز سے دعا کی۔

''دس برس بعد انشاء اللہ ہم مفتی جی کی سوویں سالگرہ بھی اسی شان سے منائیں گے۔''

جانے کیوں آمین کہنے کے باوجود میرے دل نے کہا۔

''بڑی خوش فہمی۔ مجھے تو لگتا ہے مفتی جی کی یہ آخری سالگرہ ہے۔'' میں نے آہستہ سے برابر بیٹھی شمع خالد سے کہا۔

اگلے دن میں لاہور چلی گئی اور ٹھیک دو دن بعد پی ٹی وی کے خبرنامے میں خبر نشر ہو رہی تھی۔

''سینئر معروف اور ہر دلعزیز افسانہ نگار ممتاز مفتی مختصر علالت کے بعد اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔''

''مگر کون کہتا ہے مفتی جی ہمارے درمیان نہیں رہے؟ وہ تو اب پہلے سے بھی زیادہ ہمارے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔''

عذرا اصغر کا طلوع

انور سدید

(●)

اُردو ادب میں عذرا اصغر کا طلوع ہوا تو اردو افسانے کی بساط پر دھنک کے کئی رنگ بکھر چکے تھے۔ان میں سب سے زیادہ شوخ رنگ تو عصمت چغتائی کا ذاتی رنگ تھا اور اس رنگ نے کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ ہر نئی نکلنے والی خاتون نہ صرف شجر ممنوعہ کو ہاتھ لگانے اور ثمر یاب ہونے کی کوشش کرتی بلکہ حریص مرد کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے افسانے کو لذت انگیز بیانیہ میں بھی ڈھال دیتی۔میں بانو قدسیہ اور فرخندہ لودھی کو عصمت چغتائی کی توسیع قرار نہیں دیتا کہ ان کے ہاں دل کے آباد نگر میں مقیم کرداروں پر نظر ڈالنے کا انداز جدا گانہ ہے۔ تاہم جب ہموار اور خوشگوار بیانیہ کے دوران کردار کی آنکھوں میں اچانک سرخ ڈورے تیرنے لگتے ہیں اور جذبہ تنی ہوئی رسی کی طرح کھینچ جاتا ہے اور بانو قدسیہ فرخندہ لودھی اس پل صراط کو ڈولے بغیر عبور کر جاتی ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ عصمت چغتائی نے حقیقت کو بے باکی سے پیش کرنے کی جو طرح ڈالی تھی اس کو بعد میں آنے والی خواتین افسانہ نگاروں نے اس طرح استعمال کیا کہ معاشرہ چیں بچیں نہ ہو۔اس قسم کے اظہار کی ایک کھر دری استثنائی مثال واجدہ تبسم ہے اور جسے مرد حضرات محض اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس میں ایک مخصوص نوع کا جنسی چٹخارہ وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے اور لڑکیاں اس لیے پسند کرتی ہیں کہ عورت کے زیرِ جسم طوفان بپا کرنے والے جذبے تمثیلی انداز میں واجدہ تبسم نے ہی پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔اور ان میں پڑھنے والوں کو تجربے کی صداقت کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔کالج کی ایک پروفیسر خاتون جس نے طالب علمی کا زمانہ کڑے تہذیبی ماحول میں گزارا تھا مجھے بتایا کہ واجدہ تبسم کی کتاب حاصل کرنا آسان کام نہ تھا، ایک آنہ لائبریری پر اس کا کرایہ دوگنا تھا۔کتاب چھپا کر دی جاتی تھی اور واپسی کے لیے صرف ایک ہفتہ مقرر تھا۔موصوفہ بتاتی ہیں کہ اس ایک ہفتے میں اس کتاب کو تین یا چار لڑکیاں پڑھ ڈالتیں اور واجدہ تبسم کی کسی دوسری کتاب کا تقاضا کرتیں جو انھوں نے پڑھی نہیں ہوتی تھی۔وجہ یہ تھی کہ واجدہ تبسم کے افسانے ان کی تشنگی بڑھانے کی بجائے جذباتی سطح پر انھیں تسکین آفرین محسوس ہوتے تھے۔اسے پڑھ کر لڑکیاں بالعموم وہ کتھارسس حاصل کر لیتیں جس کے حصول کے دوسرے ذرائع انھیں میسر نہیں تھے۔

واجدہ تبسم کے افسانے، بنیادی طور پر کہانی بیان کرنے کی روایت ہی کا حصہ ہیں۔اس میں جدت یا اختراع کا عمل دخل ہے تو صرف اتنا کہ پرانے زمانے میں لڑکیاں باتیں کم کرتی تھیں اور داخلی جذبوں کی عدم سرابی اور نا آسودگی پر آہیں زیادہ بھرتی تھیں اور جب کے شادی ہو جاتی تو خوابوں کے شہزادے کی جگہ کوئی اجنبی والدین کی مرضی اور انتخاب کے مطابق دولہا بن کر آ جاتا تو سماجی سلامتی کے لیے اسے قبول کر لیتیں۔نتیجتاً آہیں مسکراہٹوں میں اور مسکراہٹیں بچوں کی معلوم بے ساختہ شرارتوں کے مشاہدے میں تبدیل ہو جاتیں۔اور زندگی پسند اور ناپسند کا سوال اٹھائے بغیر گزرتی چلی جاتی۔متذکرہ پروفیسر صاحبہ کا خیال تھا کہ واجدہ تبسم کے افسانوں نے لڑکیوں کو جرأت مند بنایا اور ان کی بالواسطہ عطایہ ہے کہ اب لڑکیاں اپنے مجوزہ دولہا کو سلیقے طریقے سے ٹھونک بجا کر دیکھ بھی لیتی ہیں اور ان کے نقوش اردو افسانے میں بھی بتدریج ظاہر ہوتے چلے گئے ہیں عذرا اصغر نے اردو افسانے کی ان تبدیلیوں کو چشمِ ہوش سے دیکھا اور ان کے مناسب اثرات بھی قبول کیے۔لیکن اپنے اختیار تمیزی کو قائم رکھا۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ عذرا اصغر تک آتے آتے اردو افسانہ کئی کروٹیں لے چکا تھا، موضوعات میں حیرت انگیز تنوع پیدا ہو چکا تھا۔ آزادی کے بعد آبادیوں کے تبادلے سے پیدا ہونے والے مسائل نے ایک نئی صورتِ حال پیدا کر دی تھی جن کی جلوہ گری اس دور کے افسانوں میں ہونے لگی تھی، اس پر مستزاد ادیبّت کے تجربات تھے جن میں تجرید کو آزمانے اور علامت کی تجدید کی کاوش اہم ہیں۔میرزا ادیب کے افسانے درون تیرگی کو جدید اردو افسانے کے علامتی اظہار کی ابتدائی تخلیقی کاوشوں میں شمار کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس میں تجرید کا پیوند انور سجاد نے لگایا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح ایک مخصوص دور میں بعض فلمی جوڑے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں اس طرح ادب میں بھی ایک ہی اسلوب میں لکھنے والوں کے جوڑے بھی معروف ہو جاتے ہیں۔چنانچہ سعادت حسن منٹو کی جنس نگاری کا ذکر آئے تو ذہن پر بے اختیار عصمت چغتائی کا نام بھی ابھر آتا ہے۔انور سجاد کی تجریدیت کا تذکرہ ہو تو خالدہ اصغر (جواب خالدہ حسین ہیں) کا نام لیے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی۔ تاہم تجریدی اور علامتی افسانے کو عوام میں قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔اور اسلوب کی تازہ کاری کے باوجود اسے بالعموم ایک ایسے تجربے کی حیثیت دی گئی جس میں حقیقت کو کھلے انداز میں پیش کرنا مشکل ہو گیا تھا اور یہ مشکلات ملک کے سیاسی عمل نے پیدا کی تھیں جب کہ فنکار نے اس سیاسی جبر میں اظہار کے دوسرے راستے اختراع کر لیے تھے۔تاہم یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ تجریدی افسانے کی جڑیں ہماری زمین میں گہری نہیں اتریں تو اس کی وجہ ہماری داستان نگاری بھی ہے جس کی ساعت میں عوام نے ہمیشہ گہری دلچسپی لی۔اس دھرتی پر ہیر رانجھا، سوہنی مہنیوال، اور سسی پنوں کی لوک داستانیں پروان چڑھ چکی تھیں جن کا ناتا اب بھی عوام سے قائم ہے۔(لوک داستانوں کی توسیع کی مثالیں بھی اردو افسانے میں دستیاب ہیں۔میں نے کچھ عرصہ قبل جوگندر پال کا ایک بے مثل افسانہ پڑھا تھا جس میں رانجھا اور ہیر عمر رسیدہ ہو چکے ہیں اور موجودہ دور کے معاشرتی ماحول اور مسائل سے دوچار ہیں۔یہاں محمود ہاشمی (مصنف کشمیر اداس ہے) کی مثال بھی

دی جا سکتی ہے جنھوں نے ڈرامہ ''انارکلی کی واپسی'' لکھا تھا)۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ نگاری اساس ''فن ہے اور صورتِ واقعہ، ماحول اور کرداروں کو تجرید کی صورت دے دی جائے تو اس کی کامیابی کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک مخصوص طبقے میں کامیابی حاصل کرنے اور بعض نقادوں کے قلم پر دوستی کے ناتے قابض ہو جانے کے باوجود انور سجاد اور خالدہ حسین اور ان کے قبیل کے دوسرے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو، غلام عباس، غلام الثقلین نقوی، رام لعل، بانو قدسیہ، اشفاق احمد اور فرخندہ لودھی جیسی کامیابی حاصل نہیں کر سکے تو اس کی ایک وجہ تو افسانے میں ٹھوس کہانی کی عدم موجودگی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ادب کے اساتذہ کی یہ کوتاہی بھی ہے کہ انھوں نے تجرید اور علامت کے فنی حسن کے زاویے واضح نہیں کیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رشید امجد، احمد جاوید، احمد داؤد، غلام الثقلین نقوی، فہیم اعظمی، محمود واجد، سریندر پرکاش، بلراج کومل، احمد ہمیش، اعجاز راہی اور متعدد دوسرے افسانہ نگاروں نے تجرید اور علامت کا ہوش مندانہ استعمال کیا اور ایک نئی ٹیکنیک میں افسانے لکھے جو اردو افسانے کے ارتقاء میں ایک اہم قدم ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو افسانے کا قاری اس نوع کے افسانے سے گہری اور جذباتی وابستگی پیدا نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی نئے فسانہ نگار میں کہانی کی روایت کا پرتو نظر آتا تو قارئین اسے پسندیدہ قرار دے دیتے اور اس کا خیر مقدم کھلے بازوؤں سے کرتے۔ اس کی کہانی کا تذکرہ دوستوں سے کرتے اور انھیں یہ کہانی پڑھنے کی ترغیب دیتے۔ با ماجرا اور ٹھوس کہانی کی پاسبانی کی وجہ سے عذرا اصغر بھی ایسے ہی افسانہ نگاروں میں شمار ہوتی ہیں اور انھوں نے اپنی طویل ریاضت سے اردو افسانے کی توسیع میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

یہاں مجھے اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنا ہے کہ میں ایک عرصے تک نہ صرف خالدہ اصغر کے قبیلے کی افسانہ نگار تصور کرتا رہا بلکہ انھیں خالدہ اصغر ہی موصوم کرتا رہا۔ چنانچہ انھیں اس ادبی خلوص سے نہ پڑھ سکا جس خلوص سے چوتھی کا جوڑا۔۔۔ ''موزیل''، ''گڈریا''، ''پاربتی''، ''آدھے گھنٹے کا خدا''، ''موم کی مریم''، ''سامانِ شیون'' اور گلاب دین چٹھی رسان'' وغیرہ افسانے پڑھے تھے۔ اور ذہن نے ان کا ناقابل فراموش تاثر قبول کر لیا تھا۔ عذرا اصغر سے میرا اوّلین قریبی تعارف ان کے افسانے ''نیا پاندان'' سے ہوا۔ شاید اس وقت ہی مجھے اپنی غلط فہمی کا احساس ہو گیا کہ یہ خالدہ اصغر سے مختلف افسانہ نگار ہیں اور ان کی اپنی انفرادیت ہے۔ عذرا اصغر کا افسانہ اپنا الگ ذائقہ رکھتا تھا اور اس کے اظہار کا زاویہ مستقیم تھا۔ تاہم میں نے اس غلطی کا اعتراف محض اس خدشے سے نہیں کیا کہ اظہر جاوید صاحب کو اخبار ''امروز'' اور ''حریت'' میں میری کم علمی پر کالم لکھنے کا موقعہ نہ مل جائے اور اب اعترافِ گناہ کر رہا ہوں تو محض اس لیے کہ میں عذرا اصغر کے کم از کم دو درجن سے زائد افسانے مختلف رسائل میں اور ان کی کتابوں ''پت جھڑ کا آخری پتا''، بیسویں صدی کی لڑکی''، ''تنہا برگد کا دکھ'' اور ''گدلا سمندر'' میں پڑھ چکا ہوں اور اب بلاخوف وخطر کہہ سکتا ہوں کہ ان کا فن اس مقامِ اختیار پر پہنچ چکا ہے جہاں میرزا ادیب، انتظار حسین اور خواجہ محمد زکریا نے انھیں خراجِ تحسین ادا کیا اور ان کی انفرادیت کے زاویوں کا اعتراف کیا۔ عذرا اصغر نے قبولیت عامہ کا یہ سفر اس دور میں کاٹا جب خالدہ اصغر (خالدہ حسین) کے افسانوں کا ڈنکا ہر طرف بج رہا تھا۔ اور ان کے گرد و پیش میں بانو قدسیہ واجدہ تبسم، جیلانی بانو، الطاف فاطمہ، فرخندہ لودھی، پروین سرور، نشاط فاطمہ، حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، رضیہ فصیح احمد اور اُمِّ عمارہ جیسی خواتین افسانہ نگاروں کا ہجوم موجود تھا۔ بلاشبہ انھیں اپنے نام کا سکہ چلانے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑی لیکن فن صرف رقصِ شرر نہیں کہ جھلک دکھا کر اندھیرے میں کھو جائے بلکہ فن جرسِ غنچہ کی صدا ہے کہ جس راستے سے بھی گزرے نسیم بہار تعاقب کرنے پر آمادہ ہو۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ خالدہ اصغر زندگی کا ایک موڑ کاٹ کر کبھی کی خالدہ حسین بن گئی ہیں لیکن عذرا اصغر اپنے مورچے پر ڈٹی ہوئی ہیں اور اب ان کے فن کی صدائے نو بہار لاہور سے اسلام آباد پہنچی اور اب اس کی خوشبو کراچی کے صنعتی ساحلی شہر کو معطر کر رہی ہیں۔

عذرا اصغر کے افسانے ایک زیرک، تعلیم یافتہ اور زندگی کی داخلیت کا تجزیہ کرنے والی ہوش مند خاتون کے افسانے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اپنی زندگی میں انھیں سندِ قبولیت ان الفاظ میں دے گئے تھے:

''عذرا اصغر کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ان کا گہرا مشاہدہ اور اپنے مشاہدات کے اظہار میں بے خوفی کے ساتھ ساتھ ان کا مہذب طرزِ بیان ہے۔''

قاسمی صاحب جیسے مشہور ادیب کی یہ رائے بہت اچھی ہے لیکن اس میں عمومیت نمایاں ہے اور اسے کسی بھی دوسری یا دوسرے پر کسی تردود کے بغیر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ گہرا مشاہدہ تو عصمت چغتائی کے ہاں بھی ہے اور جیلانی بانو کے ہاں بھی، اظہار کی جو بے خوفی واجدہ تبسم نے برتی ہے اس کا عشرِ عشیر بھی عذرا اصغر کے افسانوں میں موجود نہیں۔ طرزِ بیان کی تہذیب تو بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ اور رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں میں بھی خوبصورت انداز میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ پھر عذرا اصغر کی انفرادیت کیا ہے؟ کیا عصمت چغتائی، جیلانی بانو، فرخندہ لودھی اور ان کے ساتھ ساتھ عذرا اصغر کے مشاہدات کے زاویے الگ الگ نہیں اور کیا ان کے اظہار کی گہرائی کے بارے میں علیحدہ علیحدہ رائے قائم نہیں کی جا سکتی؟ محض یہ کہنے سے کہ عذرا اصغر نے افسانے کو افسانہ ہی رہنے دیا ہے اور اپنے اس منصب کو فراموش نہیں کیا کہ وہ اپنے قارئین کو ایک ایسی کہانی سنانے چلی ہیں جو انھیں اپنا ایک حیات پارہ بھی محسوس ہو عذرا اصغر کے فن کی حدیں متعین ہو جاتی ہیں؟ میرا جواب نفی میں ہے۔

میری رائے میں کہانی کا تار و پود اور اس کا تانا بانا تو محض ایک خارجی خول ہے۔ اس خول پر حادثات و واقعات مختلف انداز میں وارد ہوتے رہتے ہیں، زمانہ اس خول پر مسلسل ضربیں لگا رہا ہے۔ لیکن حقیقی تلاطم تو اس خول کے بھیتر پیدا ہوتا ہے اور افسانے کے جن نقادوں نے افسانے کے باطن میں اترنے اور بھیتر

جھانکنے کی سعی نہیں فرمائی انھوں نے افسانہ نگار کی صرف ظاہری سطح کا مطالعہ کیا ہے۔ظاہر کی یہ سطح ہر افسانے میں اپنا رنگ بدل لیتی ہے لیکن وہ عذرا اصغر جس نے تخلیق کا کرب برداشت کیا ہے، جس نے ''پت جھڑ کا آخری پتا''، ''گدلا سمندر''، ''بیسویں صدی کی لڑکی'' اور ''تنہا برگد کا دکھ'' جیسی کتابوں کے افسانوں میں بے شمار کرداروں کو جنم دیا ہے۔ان کے دُکھ سکھ میں شرکت کی ہے، معاشرے میں ان کا مقام متعین کرنے کا فرض ادا کیا ہے اور ان کے ساتھ زندگی کا کچھ عرصہ بسر کیا ہے۔ہجوم میں گم ہو جانے والی خاتون نہیں بلکہ وہ زندگی کے افسردہ دُکھ اور خوش گوار مسرتیں تلاش کرنے والی افسانہ نگار ہیں جو بے رحم سماج پر ملامتوں کی بارش کرنے کی بجائے نفسِ مطمئنہ سے زندگی بسر کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہیں اور افسانہ پیش کر کے ہمیں حقیقی زندگی کی ایک قاش سے متعارف کرا دیتی ہیں ان کے افسانوں کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان سب کی خالق عذرا اصغر ہیں۔جو تاثر کی ایک مخصوص وحدت کو جنم دیتی ہیں۔یہ تاثر بہتے دریا کی طرح اپنا نشیب خود تلاش کرتا ہے اور کناروں پر آباد بستیوں پر اثر انداز ہونے کے لیے اپنا راستہ خود بناتا ہے۔

ظاہر کی آنکھ سے دیکھیں تو عذرا اصغر کے افسانے پُر اسرار انسانوں کے افسانے نہیں، ان کے کردار جذبات اور احساسات سے بھیگے ہوئے لوگ محسوس ہوتے ہیں۔وہ اپنے تخلیقی آئینے سے مختلف کرداروں کو الگ الگ زاویوں سے پیش کرتی اور ان کی آدمیت کی بجائے انسانیت کا منفرد زاویہ ابھارتی ہیں تاہم یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ یہ سب زاویے مرکز گریز نہیں بلکہ ایک ہی مرکزی نقطے کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔یہ نقطہ خود عذرا اصغر کی ذات ہے اور یہ سب زاویے ان کے اپنے تجربات سے پھوٹے ہوئے ہیں اور حقیقی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔چنانچہ انھوں نے زندگی کے اکھاڑے میں لوگوں کو متصادم ہوتے ہوئے ہی نہیں دیکھا، نہ اس تصادم سے کہانیاں حاصل کی ہیں بلکہ افسانہ لکھتے ہوئے انھوں نے زندگی کو محسوس کیا اور پھر خود اپنے وجود کو ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔اور ہر ٹکڑے میں ایک کہانی بھی رکھ دی ہے۔پڑھنے والے اس کہانی کا مطالعہ کر سکیں اور ذرا گہرائی میں اترنے والے ان کے باطن کے کرب کو محسوس کر سکیں۔

عذرا اصغر کے افسانوں میں ''تنہا درخت''، ''آخری پتہ''، ''آڑو کا پودا'' اور پت جھڑ وغیرہ ایسی علامتیں ہیں، جن سے ان کے باطن میں جھانکا جا سکتا ہے۔لیکن غور سے دیکھئے تو یہ سب ایک ایسی دھرتی کے ساتھ منسلک ہیں جو اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے۔اور درخت کو مناسب غذا فراہم نہیں کرتی۔تنہا درخت پت جھڑ کے دور سے گزر رہا ہے اور اس کا آخری پتہ بھی مرجھا چکا ہے۔بالفاظ دیگر عذرا اصغر نے ہمارے سامنے ایک بے آب دھرتی کا تصور پیش کیا لیکن یہ دھرتی وہ بت نہیں جس کی پوجا کی جائے۔بلکہ یہ دھرتی تو تخلیق کا ماخذ ہے۔یہ وہ زمین ہے جس سے درخت اگتا ہے۔پتوں اور شاخوں کو نمو ملتی ہے اور ثمر پیدا ہوتے ہیں جن میں پورا درخت سما جاتا ہے اور پھر رزقِ زمین بن کر نئی تخلیق کا باعث بن جاتا ہے۔گویا یہ وہ کوکھ ہے جس سے شجرِ حیات کو نمو ملتی ہے اور زندگی کا ارتقا مسلسل بحال رہتا ہے۔عذرا اصغر نے اپنے افسانوں میں مختلف سطحوں پر اس دھرتی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔اس دھرتی کی ایک سطح جبلی ہے اور اس کی تسکین کے لیے عذرا اصغر کے کردار زندگی کی ہر کٹھن منزل کو طے کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر ان کا ایک نمائندہ افسانہ تماشہ میرے آگے میں ریشماں بظاہر بانجھ نہیں اور دینو کے سنجوگ سے تین بچے بھی پیدا کر چکی ہے لیکن اس کا جسم پھر بھی جنم جنم کا پیاسا ہے اور اسے اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک کہ اس دھرتی پر حسو کی برکھا وافر مقدار میں برس نہیں پڑتی۔افسانہ ''شمع بجھ گئی'' میں یہ دھرتی ہمہ تن التفات ہے اور فطرت کے آبیاری ایک انوکھے رنگ میں کرتی ہے۔''بہلاوا'' اور ''گھس بیٹھئے'' میں اس دھرتی نے وطن کی مقدس سر زمین کا روپ دھار لیا ہے۔اور انسان کے داخل میں چھپے ہوئے جاں سپاری کے قیمتی جذبات کو جلا دی ہے۔دھرتی کی اس متنوع پیشکش میں عذرا اصغر نے جسم کو روح میں تحلیل کرنے اور پھر اسے اونچی پرواز کرنے کی دعوت دی ہے۔چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عذرا اصغر کی دھرتی میں کششِ ثقل زیادہ نہیں وہ اپنے فن کی معاونت سے دھرتی کو بوجھل پن سے سبک کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور یوں انسان مادے کے بوجھ سے نجات حاصل کرنے اور عمودی سمت میں پروں کے بغیر پرواز کی دعوت دیتی ہیں، آپ اسے نروان حاصل کرنے کا عمل بھی قرار دے سکتے ہیں جو زندگی میں حاصل ہو جائے تو بہت سے مسائل کو بے معنی قرار دے دیتا ہے۔

عذرا اصغر کے افسانوں کے کرداروں میں جنس کی اعتبار سے ایک واضح حد فاصل کھینچی جا سکتی ہے۔ان کے نسوانی کرداروں کو روح سے زیادہ جسم کے داخلی تقاضوں کی تسکین زیادہ عزیز ہے۔اس کے برعکس مرد کردار شعر و نغمہ کی وادیوں میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔عذرا اصغر نے ان میں فطری سنجوگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں یہ سنجوگ پیدا نہ ہو سکا وہاں زندگی کے متضاد دھاروں کو اپنے اپنے رخ پر بہنے کی جازت دے دی گئی ہے۔چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ عذرا اصغر کے افسانوں میں زندگی کا دھارا رواں دواں رہتا ہے اور متضاد طبائع کا تلاطم معاشرے کو کسی خطرے سے دوچار نہیں کرتا۔۔۔۔تو یہ بات بڑی حد تک درست ہوگی۔

میں اُوپر لکھ چکا ہوں کہ عذا اصغر موضوعی طور پر بے آب دھرتی کو اپنے فن میں زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔افسانہ تشنہ لب میں انھوں نے لکھا ہے:

''اس گھر میں نہ سایہ تھا اور نہ بوند پانی کی کہ ایک قطرہ کہیں سے مل جائے تو اپنے سوکھے ہونٹوں میں ٹپکا کر تر کر سکتی۔''

افسانہ ''پت جھڑ کا آخری پتا'' میں پیاس حسرت بن کر ابھرتی ہے:

''میں نے سیلون کے شیشوں سے باہر جھانکا۔شام کتنی سہانی ہو رہی تھی، فواروں کی ننھی ننھی بوندیاں جیسے میرے وجود کو بھگونے لگیں۔پانی کے بکھرتے چھینٹوں نے مجھے گدگدایا پر میں نے اپنے جذبات پر نقاب گرا لیا''

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ کیجیے

پت جھڑ کا آخری پتا

ڈاکٹر رشید امجد
(راولپنڈی)

کہانی کی تاریخ اُسی قدر قدیم ہے جتنا قدیم خود انسان ہے۔ پہلی کہانی عالم وجود میں آئی تو جنت کا جمود ٹوٹا۔ ازلی اور ابدی مثلث کا ایک کردار شیطان تھا جس نے حوا کو بہکا کر آدم کو شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے پر مجبور کیا۔ اور یوں افسانہ از افسانہ می خیزد کے طور پر کائنات میں حرکت پیدا ہوئی اور ڈھیروں کہانیاں بکھر گئیں دراصل زندگی خود ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ہر فرد اپنے گرد ایک کہانی لیے پھرتا ہے۔ ہر دور ہر نسل کی ایک کہانی ہوتی ہے۔ جسے مورخ اپنے انداز میں اور ادیب اپنے انداز میں لکھ کر آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیتا ہے۔ کہانی لکھنے والے یا کہنے والے کو تو اپنے مشاہدے تجربے اور ذوق کو کام میں لا کر ایک مقدس امانت اپنے گرد و پیش رہنے والے انسانوں کے سپرد کرنا ہوتی ہے۔ اور یوں دنیا کا کوئی ادب ایسا نہیں جس میں افسانے کا تاریخی تسلسل موجود نہ ہو۔ اردو ادب میں افسانے کا آغاز بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا۔ دیکھنے والوں اور زندگی کو پرکھنے والوں کے لیے آج بھی کہانیوں کے لیے اتنا ہی مواد موجود ہے جتنا اُس وقت موجود تھا۔ جب ایک عورت کے حصول کے لیے زمیں پر انسان کا خوں پہلی بار بہا تھا۔ اسی لیے تو میر نے کہا تھا

سرسری تم جہاں سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اس عرصے میں اردو افسانے نے کئی کروٹیں لیں اور مختلف روپ اختیار کیے علاماتی افسانوں کو چھوڑ کر جو قاری کو ایک اُلجھن میں ڈال کر ختم ہو جاتے ہیں اس کی گرفت بہت قوی رہی ہے۔ بقول عذرا اصغر عورت ابتدا سے کہانی کہتی آئی ہے۔ اور مرد کہانی سنتا آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں ناول نگار اور افسانہ نگار خواتین کی تعداد اس قدر ہے کہ اُس سے نظر بچانا اردو ادب کے مؤرخ قاری اور نقاد کے لیے ممکن نہیں محترمہ عذرا اصغر کا نام افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک جانا پہچانا نام ہے سردستِ میرے پیشِ نظر اُن کا افسانوی مجموعہ ''پت جھڑ کا آخری پتا'' ہے۔ پلاٹ کے اعتبار سے عذرا اصغر کے افسانوں کے پلاٹ سادہ دکھائی دیتے ہیں۔ سادہ پلاٹ کو نبھانا ایک ادق فریضہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایسے پلاٹ قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں اکثر و بیشتر ناکام رہتے ہیں۔ لیکن ایک اچھا فن کار زندگی کے معمولی واقعات کو خوبصورت روپ عطا کر دیتا ہے۔ اگر کہانی دلچسپ ہو تو وہ خواہ کتنی ہی حقائق کی پردہ کشائی کرتی ہو قاری کے لیے غیر دلچسپ بن کر رہ جاتی ہے۔ عذرا اصغر نے ایک تبدیلی اپنے افسانوں میں یوں پیدا کی ہے کہ اُنھوں نے متوسط طبقے کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ عطا کی ہے متوسط طبقے کو موضوع بنانے کا رجحان ایک حد تک سرسید احمد خان کے دور میں پیدا ہوا تھا اور پھر یوں ختم ہوا جیسا یہ طبقہ اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر مزدور اور کسان کو محض فیشن کے طور پر اکثر افسانہ نگاروں نے اپنا موضوع بنایا لیکن یہ تصنع آمیز ادب اکثر افسانہ نگاروں سے نبھ نہ سکا اور چند ایک کو چھوڑ کر اکثریت وہ تخلیقی سرمایہ ہمیں عطا نہ کر سکی جس کے محض ہم منتظر ہیں۔ آڑو کے پھول میری اس عرض داشت کے ثبوت کے لے کافی ہوگا۔ اس افسانے کا ہیرو ایک فن کار ہے۔ متوسط طبقے کا پڑھا لکھا نوجوان جو آڑو کے پھول پر نظم تو لکھ سکتا ہے اپنی بہن کے جہیز کا جوڑا خریدنے کے بجائے آڑو کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت کی تصویر اپنی محبوبہ کو پیش کر سکتا ہے لیکن اُسے اپنانے کے لیے اُس کے پاس اتنی جگہ موجود نہیں ہے جہاں وہ آڑو کا ایک درخت لگا سکے اور نتیجے کے طور پر اُس کی محبوبہ ایک ایسے شخص کی دُلھن بن جاتی ہے۔ جو اُسے آڑو کے درختوں کا باغ لگا کر دے سکتا ہے۔ بے ڈھب اسی قبیل کی ایک کہانی ہے۔ جس کا انجام ایک گہری سوچ دے کر قاری سے رخصت ہو جاتا ہے۔ پلاٹ کے ساتھ ساتھ عذرا اصغر کا بے خوف اظہار قاری کو بار بار اپنی جانب متوّجہ کر دیتا ہے اظہار کی بے خوفی مشکل مرحلہ ہے فن کار کو تلوار کی دھار پر پر چل کر یہ سفر طے کرنا ہوتا ہے۔ ہر قوم ہر نسل کی کچھ اخلاقی قدریں ہوتی ہیں۔ کچھ تہذیبی بندھن ہوتے ہیں۔ مہذب قاری فن کار سے توقع کرتا ہے کہ وہ اُن کا احترام کریں۔ عذرا اصغر کا بے خوف اظہار۔ منٹو کے جرأت مندانہ اظہار سے قطعی مختلف ہے۔ عذرا اصغر کے افسانے پڑھ کر فضا اُتنی غلیظ بدبودار اور گندی دکھائی نہیں دیتی جتنی گندی منٹو کے افسانے پڑھ کر محسوس ہوتی ہے۔ جہاں عذرا اصغر نے متوسط طبقے اور اس طبقے کے ادیبوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے وہاں نچلے طبقے کو بھی فراموش نہیں کیا جو جیسا بھی ہے ہماری سوسائٹی کا ایک بڑا حصہ ہے۔ اُن کا افسانہ 'بے کفن' اس کی خوبصورت مثال ہے۔ افسانے کا ہیرو سلیم مزدور تھا لیکن جب ایک ٹانگ کٹ چکنے کے بعد افلاس اُس کے دروازے پر یوں دستک دیتا ہے کہ بقول عذرا اصغر پیٹ خالی ہو۔ تو خوشی خوشی ہوتی ہے اور نہ کوئی غم، غم، جذبہ بھوک ریلے میں بہہ جاتا ہے۔ سلیم کی بیوی محنت مزدوری کرتی اور کنبے کا پیٹ پالتی ہے۔ اس کی موت سلیم کے گھرانے کے لیے بہت بڑا المیہ ہے۔ غریب کے لیے زندگی تو عذاب ہوتی ہے۔ موت بھی ایک بہت بڑا عذاب بن جاتی ہے۔ جس گہرے مشاہدے اور حساس دل کے ساتھ عذرا اصغر نے یہ افسانہ لکھا ہے اُس کی مثال اردو افسانوں کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ موت تو ہر گھر میں زندگی کی طرح آتی ہے۔ لیکن ایک غریب مزدور کی موت اور ایک سرمایہ دار کی موت کی الگ الگ تصویر کشی کر کے عذرا اصغر نے ظالمانہ طبقاتی تقسیم کی تصویر کشی فنی چابکدستی سے کی ہے۔ جو گہرا تاثر قاری پر چھوڑ جاتی ہے۔ عذرا اصغر کا افسانہ زہر قند ایک نیم رومانی افسانہ ہے۔ جو اُن کے دور کے کھوکھلے پن کا اظہار بڑے بے باک انداز میں کرتا ہے۔ زندگی دراصل سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن کھوکھلا

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ کیجیے

عذرا اصغر کے افسانے

ڈاکٹر سعادت سعید
(لاہور)

عذرا اصغر کے افسانے ہمارے سماج کی کتنی تہہ داریوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ماحول میں پرورش پانے والے مسائل کو تنقیدی انداز سے پرکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں رومان کی چاشنی بھی موجود ہے اور حقائق کی تلخی بھی۔ سلگتے جذبات کا اظہار بھی ہے اور پختہ شعور کا استعمال بھی۔ ان کا ہر افسانہ کسی نہ کسی مسئلے کی کوئی نہ کوئی پرت ضرور ابھارتا ہے۔ وہ افسانہ برائے افسانہ لکھنے کی قائل نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کی ذات سے لے کر اجتماع تک کی کئی پیچیدگیاں اور الجھنیں اجاگر ہوئی ہیں۔ عذرا کا کوئی افسانہ بھی مبہم اور عدم ابلاغ کا نمائندہ نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں ان کے ذہن میں اس کا ایک واضح خاکہ ہوتا ہے۔ ایک متعین پلاٹ اور ایک متعین نقطہ نظر ان کے ہر افسانے میں جھلکتا ہے۔ وہ ہر موضوع کے آغاز اور انجام سے واقف ہیں۔ ان کے افسانوں میں آپ بیتی کی تاثیر بھی نمایاں ہے اور جگ بیتی کا ذائقہ بھی۔ وہ کرداروں کے بطن میں اتر کر ان کی نفسی کیفیات کو بھی گرفت میں لیتی ہیں اور صورتِ حال کی گہرائیوں میں جھانک کر اس کے تاثرات کو بھی خیال کے دائروں میں سمیٹتی ہیں۔ عذرا کے معاصر افسانہ نگاروں کی موضوعاتی اور تکنیکی کائنات وسعتوں سے ہمکنار ہے۔ اس میں رنگا رنگ تجربے اور بوقلموں اسالیب دستیاب ہیں۔ افسانہ نگاروں کا ایک ہجوم ہے کہ اپنے اپنے حوالوں اور اپنے اپنے وطیروں سے سانس لیتی زندگی کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنانے میں مشغول ہے۔ نئے عہد کے افسانوں میں زندگی، ماحول، معاشرت اور افراد کے ایک ایک طور، رنگ، سلیقے اور لہجے کی داستان رقم کی گئی ہے۔ نئے افسانہ نگار سیاست، معشیت، معاشرت، اخلاقیات، نفسیات اور فکریات کے پاتالوں میں اتر کر ایسے ایسے قیمتی جواہر تلاش چکے ہیں کہ ان کی بصیرتوں، ویژنوں اور مہارتوں پر رشک آتا ہے۔ استعاراتی اسالیب کے امکانات، علامتی اظہاریت کے چھپے علاقے، مشاعرانہ متخیلہ کے دفینے اور افسانوی تکنیکوں کے مخفی ذخائر کیا کچھ سامنے نہیں آیا۔ تاہم ہنوز موضوعات اور مواد کے اَن گنت تیور تشنۂ اظہار ہیں۔ شاید اس لیے کہ تاریخ اور معاشرت ہمہ وقت متحرک ہیں۔ تبدیلیاں اور ارتقا ان کی سرشت میں ہیں۔ ہر افسانہ نگار زندگی، ماحول اور انسان کو اپنے مخصوص حوالوں سے پہچانتا ہے اور اپنے مخصوص انداز سے انھیں الفاظ کا لبادہ عطا کرتا ہے۔ سادہ بیانیہ تکنیک کے وحدتِ تاثر رکھنے والے افسانوں سے لے کر پیچیدہ علامتی تکنیک کے متنوع تاثرات رکھنے والے افسانوں تک افسانہ نگاری کے کئی دبستان تاریخ ادب کا حصہ بنے ہیں۔ کسی ایک افسانہ نگار کے افسانوں پر خامہ فرسائی کرنا ایسے میں کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ ہم آسانی سے اس کے افسانوں کو کسی ایک دبستان سے وابستہ کر کے اس کی مخصوص خصوصیات کو احاطۂ تحریر میں لا سکتے ہیں اور یہ فتوے بھی صادر کر سکتے ہیں کہ فلاح افسانہ نگار پریم چند دبستان کا افسانہ نگار ہے۔ فلاں سعادت حسن منٹو دبستان کا اور فلاں انور سجاد دبستان کا۔ سجاد حیدر یلدرم دبستان اور قرۃ العین حیدر دبستان کے افسانہ نگاروں کی بھی اردو میں کمی نہیں ہے۔ یہ تو ہم بھول ہی گئے کہ اے حمید کا بھی تو اپنا ایک مخصوص دبستان ہے۔ سرِ دست ان دبستانوں کی خصوصیات گنوانا میرا مقصد نہیں ہے مجھے تو صرف ایک افسانہ نگار کے افسانوں کا جائزہ لینا ہے اور وہ ہیں عذرا اصغر جن کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''پت جھڑ کا آخری پتا'' حال ہی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ عذرا اصغر کوئی ایسی افسانہ نگار نہیں ہیں کہ ان کے نام سے یا ان کے اسلوب سے افسانہ نگاری کے کسی دبستان کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہو یا جن کا شمار اردو کے چند صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں کیا جا رہا ہو۔ وہ فقط اور فقط اپنے افسانوں میں اپنے حوالے سے زندگی انسان اور ماحول کے ان تجربوں کو منتقل کرتی ہیں جن میں یا تو وہ ذاتی طور پر شریک رہی ہیں یا ان کی باریک بیں آنکھ نے جنھیں ان کے شعور کا حصہ بنایا ہے عذرا اصغر کے افسانوں کے مطالعے سے ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے دکھوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اپنے قلم کی حدود میں سمیٹنے سے گریز نہیں کرتیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ قومی نوعیت کے مسائل پر جذبۂ حب الوطنی کے حوالے سے کہانی کا تار و پود بنانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور آسان ہے اور وہ افسانہ نگاری کی نئی نئی تکنیکوں کو بھی استعمال میں لانے کی شوقین نہیں ہیں۔ علامت سازی سے انھیں کوئی شغف نہیں ہے۔ استعاراتی اسلوب کے خارزاروں میں اترنا بھی انھیں پسند نہیں ہے۔ شاعرانہ متخلیہ کے تخلیقی اظہار کی جانب بھی ان کی توجہ نہیں ہے۔ شعور کی رو اور انٹی شارٹ سٹوری کی تکنیکوں کو بھی انھوں نے اپنے لیے منتخب نہیں کیا۔ وجودی مکتبِ فکر یا مارکسی مکتب فکر سے انسپریشن لے کر کرداروں اور پلاٹ کی تراش خراش کرنا ان کا مطمعِ نظر نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھی سادی افسانہ نگار ہیں اور سیدھے سادھے افسانے لکھنا ان کا شیوہ ہے۔ عذرا اصغر کے افسانے اپنے اردگرد کے ماحول کی جزئیات سے لبریز ہیں۔ انھوں نے سماج میں موجود قسم قسم کے کرداروں کا ایک چاک و چوبند مصور کی مانند مشاہدہ کیا ہے۔ نچلے طبقے کے کردار ہوں، متوسط طبقے کا ماحول ہو کہ امراء کی منڈلیاں ان کا قلم یکساں پھرتی سے تصویریں بنانے میں مصروف رہتا ہے۔ دیہات کا سادہ لوحی پر مشتمل منظر نامہ ہو کہ شہروں کا ریاکاریوں پر مبنی کینوس عذرا کی فنی نزاکتوں کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ مردحاکمیت کے سماج میں عورتوں کی مجبوریوں کی کینوس ہوں کہ طماع بدکاریوں کی، محبتوں کے سلگتے جذبات ہوں کہ حقیقی فطری خواہشوں کی تکمیل کے احساسات معصوم کنواریوں کے خطرناک سوالات ہوں کہ گھاگ بوڑھیوں کی چالیں، حرام و حلال جنسی تعلقات کے مسائل ہوں کہ طبقاتی جستیں

لگانے کی پیچیدگیاں جھلملاتے ہولناک ماحول کے جھانسے میں آتی دوشیزائیں ہوں کہ بے شعوری سے گڑھوں میں گرنے والی مٹیاریں عذرا اصغر نے اپنے افسانوں میں ان کی نقشہ کشی مطالعاتی انہماک سے کی ہے۔ان کے شعور کی اقلیم میں ہر شے اپنی مناسب اہمیت کے حوالے سے جگہ پاتی ہے۔ذیل میں ان کے مجموعے ''پت جھڑ کا آخری پتا'' کے افسانوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس ابھرتی ہوئی افسانہ نگار کے شعور کے کچھ نقوش سامنے آسکیں۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''گھس بیٹھئے'' اور آٹھواں افسانہ ''بہلاوا'' عذرا اصغر کی پاکستان دوستی انسان دوستی اور حب الوطنی کے جیتے جاگتے ثبوت ہیں۔ ''گھس بیٹھئے'' کا آغاز واحد متکلم کی بچی آشی کے ایک سوال سے ہوتا ہے۔''امی تخریب کار کسے کہتے ہیں؟'' اس سوال کے حوالے سے واحد متکلم کچھ پرانی تلخ کہانیوں میں کھو جاتی ہے۔یہ افسانہ مشرقی پاکستان کے المیے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس افسانے میں رضوان کا کردار بھی ہے جو واحد متکلم کا بھائی ہے جو قیام پاکستان کے زمانے میں اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے پاکستان آنے کی بجائے بھارتی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج کے داخلے سے واحد متکلم بہت پریشان ہے۔اسے رضوان یاد آتا ہے مگر یہ یاد محبت سے بھری یاد نہیں ہے اس میں نفرت کا ایک دریا موجزن ہے وہ اس سے خیالوں میں مخاطب ہے ''تم نے مجھ سے ہر رشتہ ناتا ختم کر لیا محض اس لیے کہ مجھے پاکستان سے محبت تھی جو ہے اور رہے گی، اور اس طرح تم نے چپکے ہی سے میرے دل میں نفرت کا بیج بو دیا۔'' یہ افسانہ محبت اور فرض کی کشمکش کو بھی ظاہر کرتا ہے مگر واحد متکلم کا اپنے وطن پر اتنا شدید اعتقاد ہے کہ وہ اس پر ہر نوع کی دیگر محبتیں قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔

''بہلاوا'' میں عذرا اصغر کی حب الوطنی اور انسان دوستی اور بھی زیادہ واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔اس افسانے کا مرد کردار جمشید وطن کی خاطر لڑتا ہوا شہید ہو چکا ہے اس سے واحد متکلم خاتون شدید محبت کرتی ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسے اپنے ان عوام کے دکھوں غموں اور صدموں سے محبت ہے جن کے عزیز جنگ کی نذر ہو چکے ہیں یا جو اپنا گھر بار لٹا چکے ہیں۔ وہ صرف اور صرف جمشید سے محبت نہیں کر سکتی۔اس کی جمشید سے محبت انھی لوگوں کے حوالے سے زندہ ہے جن کے لیے اس نے جان دی ہے۔یہ افسانہ بھی سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔عذرا اصغر نے ان دونوں افسانوں میں آزاد علاقوں پر کسی ملک کی فوجوں کی یلغار کو رد کیا ہے اور آزادی کے تحفظ کے لیے نبرد آزما قوم اور غیرت مند قوم قرار دیا ہے۔

عذرا اصغر نے طبقاتی معاشرے میں طبقات کے مختلف النوع رویوں کی وضاحت کے لیے بھی بہت سے افسانے لکھے ہیں آڑو کے پھول، تماشا میرے آگے، سات تصویریں، کھوکھلی دیوار دل ایک ویرانہ، بے کفن، جنگل کا پھول اور محبت اور سیاست یہ سب افسانے جہاں طبقاتی تفاوت اور طبقاتی تضاد کا موثر اظہار ہیں وہاں ان میں مختلف طبقوں کے بارے میں عذرا اصغر کا نقطہ نظر بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

'آڑو کے پھول' یہ افسانہ طبقات کے پس منظر میں ناکام سسکتی محبت کا آئینہ دار ہے۔اس میں واحد متکلم مرد ہے۔عورت ہو کر بھی اپنے افسانوں میں عذرا اصغر نے جگہ جگہ مرد کرداروں کے حوالے سے بہت سے مسائل پیش کیے ہیں اور وہاں حقیقتاً یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ افسانے کسی عورت کے نہیں مرد کے لکھے ہوئے ہیں۔واحد متکلم الفت خاں شادی شدہ ہے اور شاعر بھی ہے اس کی شادی رابعہ سے ہوئی ہے۔شادی کے بعد پیدا ہونے والے سماجی اور معاشی مسائل کے تذکرے کے بعد اس افسانے کا وہ حصہ ماضی کی دھند سے نمودار ہوتا ہے جو محبت کے سسکتے جذبات کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔الفت خاں گلریز سے محبت کرتا تھا۔گلریز کو آڑو کے پھولوں سے بہت لگاؤ تھا۔گلریز کی شادی ایک امیر آدمی سے ہوتی ہے جو اس کی ہر خواہش پوری کرتا ہے اور وہ خوش ہے عذرا اصغر نے اس افسانے میں یہ سمجھایا ہے کہ محبت کے تقاضوں اور طبقاتی معاشرے میں خواہشوں کی تکمیل نچلے متوسط طبقے یا غریب طبقے کے بس کی بات نہیں ہے گلریز کی جس سے شادی ہوئی ہے اس نے اس کے لیے آڑو کا پورا باغ لگوایا ہے۔الفت خاں کے گھر کا رقبہ پانچ مرلے تھا ''جہاں زندگی کے کئی پودے ٹھونسم ٹھانس اوپر تلے بھرے ہوئے تھے''۔

''تماشا میرے آگے'' عذرا اصغر کا یہ افسانہ ایک اور حوالے سے طبقاتی تضاد کا شارح ہے۔اس میں جو سوال سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ امیر آدمی مرے تو اس کی کوٹھی میں تعزیت کرنے والوں کی رونقیں لگ جائیں اور غریب آدمی مرے تو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھے؟ اس افسانے میں واحد متکلم ہر واقعے اور ہر صورتِ حال کا مشاہدہ کرتی ہے اور ان کو تمام اہم تفصیلات سمیت سامنے لاتی ہے۔حسو کی موت جو ایک غریب آدمی ہے اونچے محلوں میں رہنے والوں کے دل نہ پگھلا سکا۔لمحے کے لمحے لوگوں نے اپنے آہنی کھڑکیوں سے باہر جھانکا اور ہائے بے چارا کہہ کر اپنے ائر کینڈیشنڈ کمروں میں جا بیٹھے عذرا اصغر کا افسانہ سات تصویریں جست لگا کر ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں جانے کے رویے کی مذمت کرتا ہے۔اس افسانے میں واحد متکلم ایک مبصر کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔یہ کرداری مطالعے کا افسانہ ہے اور اس میں سبق یہ ہے کہ انسان کو اپنے طبقے کی حدود میں رہ کر اپنے وسائل معاش پیدا کرنا چاہیں۔رضیہ ایک غریب لڑکی ہے اور وہ جست لگا کر چمک دمک والے طبقے میں پہنچنا چاہتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسے ایک فاحشہ بننا پڑتا ہے۔اور اس کی تصویر دیگر بدکار عورتوں کے ساتھ ایک اخبار میں چھپ جاتی ہے۔یہ افسانہ طمع اور لالچ میں مبتلا افراد کے منہ پر ایک طمانچے کی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں عذرا اصغر نے رضیہ کے کردار کی نفسیاتی کشمکش کو باریک بینی سے پیش کیا ہے کھوکھلی دیوار متوسط طبقے کے ایک بے روزگار شاعر اور دانشور کی کہانی ہے اسے کینسر ہو چکا ہے۔اس کی

محبوبہ عاصمہ اپنے محبّ دانشور کی ناداری کی وجہ سے کسی اور کی ہو چکی ہے۔اس شاعر اور دانشور کو افسانے میں واحد متکلم کے روپ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ مزدوروں کے حق میں نظمیں لکھتا ہے۔سوشلسٹ ہے وہ یہ حقیقت بھی جانتا ہے کہ معاشرے کا مظلوم ترین طبقہ وہ پڑھا لکھا بے روزگار طبقہ ہے کہ جو نہ تو مزدوروں کی طرح کام کاج کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے اتنے وسائل ہوتے ہیں کہ وہ غمِ روزگار سے بے نیاز ہو جائے۔ یہ افسانہ سفید پوش طبقے کے مسائل کی حمایت میں لکھا گیا ہے۔ یہ قارئین کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی سوچیں کہ اس طبقے کے مسائل کیوں کر حل ہو سکتے ہیں! ''دل ایک ویرانہ'' کا موضوع بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ''ہر انسان ایک غلاف میں چھپا ہوا ہے۔ایک خول میں بند ہے اور طبقاتی رسہ کشی میں الجھا ہوا ہے خود اپنی روح اپنے وجود اپنی شخصیت سے برسرِ پیکار ہے۔ بڑا مزید بلندی پر پہنچنے کے لیے بے قرار ہے اور چھوٹا اچک اچک کسی کنویں کے مینڈک کی طرح باہر نکلنے کو بے چین مگر درمیانہ طبقہ سدا کا بھوکا، حالات و وضعداری کا شکار ظاہر داری کے خول میں لپٹا ہوا۔خود سے الجھا ہوا یہ متوسط طبقہ!اس افسانے میں ناکام محبت اور ہجر کی مجبوری کا بھی بھرپور احساس ہوتا ہے اور واقعی ایسی کیفیت پیدا کی گئی ہے جس سے دل کی ویرانی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔عذرا اصغر کا افسانہ ''بے کفن'' بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا ہے۔اس کا بنیادی خیال دو طبقوں کے غیر انسانی روّیوں کا مظہر ہے۔ایک طرف سرمایہ دار طبقے کی بے رحمی پر اظہار خیال ہے دوسری طرف نچلے طبقے کے بعض لوگوں کو جن کی زندگی کی بنیادی قدر بھی حصول زر اور روپیہ جمع کرنے کی طمع پر ہدف تنقید بنایا گیا ہے اور عذرا اصغر کے بقول اس طبقے میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو آپس کی ہمدردی، اور رفاقت پر یقین نہیں رکھتے۔ مائی بختاں ایک محنت کش کردار ہے جو اپنے محبت کرنے والے خاوند سلیم کے معذور ہو جانے کے بعد اس کی اور اپنے بچوں کی کفالت کا بوجھ اٹھاتی ہے۔ مائی بختاں کی موت سے یہ کنبہ اجڑ جاتا ہے۔ان کے پاس مردہ نہلائی اور تجہیز و تکفین تک کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ مائی رحمتے مردہ نہائی کے پیسے مانگتی ہے۔سلیم جو اپنی بیوی بختاں سے شدید لگاؤ رکھتا ہے مائی رحمتے کے اس رویے سے روحانی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔اور اچانک ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جاتا ہے اس کے جسم کی آدھی معذوری جاتی رہتی ہے اور وہ کہتا ''میرے ہاتھ تو سلامت ہیں میں مائی بختاں کو خود غسل دوں گا'' سلیم کو جو روحانی اور نفسیاتی صدمہ ہوا اس کے نتیجے میں ایک بار پھر اس کے نچلے دھڑ کی شکتی لوٹ آئی۔ وہی سلیم جو مائی بختاں کا محتاج تھا اور جسے معذوری کی بنا پر مل سے نکال دیا گیا تھا اور اس کا روز گار چھن گیا تھا، اب سلیم جانتا ہے کہ مائی بختاں کے بعد بچوں کو پروان چڑھانے اور زندگی کا مقابلہ کرنے کی مکمل ذمہ داری اس کے کندھوں پر ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اس کے معذور دھڑ میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔اس افسانے میں عذرا اصغر کی حقیقت پسندی اور مشاہدے کی باریک بینی قابل قدر ہے۔

''جنگل کا پھول'' طبقاتی تناظر میں لکھا گیا ایک اور عمدہ افسانہ ہے۔اس میں جمیلہ کو اس کی ماں بتاتی ہے کہ وہ اس لیے غریب ہے کہ ان کے ماں باپ غریب تھے۔غربت کا یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔جس طرح جنگلی پھول کبھی محلوں کے باغیچوں میں نہیں کھلتا اسی طرح غریب کی اولاد کبھی امیر نہیں ہو سکتی۔سجاد جمیلہ کا نام نہاد عاشق ہے اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے وہ اس سے عارضی محبت کرتا ہے مگر اس کی شادی تارہ سے ہوتی ہے۔ جو اس کے اپنے امیر خاندان کی ایک فرد ہے اور یوں جمیلہ اپنے آپ کو ایک جنگلی پھول کے روپ میں دیکھتی ہے جو صرف ریگستانوں میں کھلتا ہے اور محلوں کے باغیچوں میں نہیں ہوتا عذرا اصغر کے طبقات کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں میں آنسو، صبر، سیاست، قناعت، دکھ، صدمے تو بہت ملیں گے لیکن کہیں ایسا احساس نہیں ہوتا کہ وہ استحصال کرنے والے طبقوں کو معدوم کرنا چاہتی ہیں شاید اس لیے کہ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہر طبقے میں اچھے اور بُرے لوگ موجود ہوتے ہیں۔محبت اور سیاست میں بھی ایسی ہی صورتِ حال ہے کہ اس میں ایک امیر گھرانے کی مالکن اپنی ملازمہ بے گناہ صفورہ پر بد چلنی کا شبہ کر کے اسے جان سے مار دیتی ہے اور پھانسی کے خوف سے اور جیل جانے کے ڈر سے سب سے یہ کہہ دیتی ہے کہ کوئی پوچھے تو کہنا صفورہ کو نمونیہ ہو گیا تھا ڈبل نمونیہ معصوم صفورہ سیاسی ذہن رکھتی تھی اور اسی گھرانے کے ایک فرد مجو میاں سے اس شرط پر محبت کرنے کو تیار تھی کہ وہ اس کی پارٹی کو ووٹ دیں گے۔عذرا اصغر کے افسانوں میں طبقاتی نظام کے خاتمے کے لیے نہ تو کوئی طریق کار رقم ہوا ہے اور نہ ہی شاید انھوں نے اس کی ضرورت محسوس کی۔

ساتھی، ممتا اور شفقت پدری کی تلاش کے حوالے سے بھی اس مجموعے کے کچھ افسانے بہت اہم ہیں۔سہارا لمحوں کے اسیر، کیسی قربت کیسی دوری، تشنہ لب اور شمع بجھ گئی انھی تاثرات کے عکاس ہیں۔سہارا میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ زندگی کے پہاڑ سے لمحوں کو کاٹنے کے لیے چڑیا کو دکھ جو شاید صنفِ نازک کا روپ ہے کسی نہ کسی محبت کرنے والے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کہتے ہوئے غالباً ہم یک طرفہ ہیں چڑے کو بھی (کہ جو مرد کا روپ ہے) کسی ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو اسے پناہ دے دے اور پھر وہ دونوں مل کر فضاؤں میں تیریں، پروں سے پر ملائیں، اونچے اور اونچے نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں تیرتے رہیں۔ نئے حوصلے اور عزائم کے ساتھ اس افسانے میں یہ بات بڑے واضح لفظوں میں کہی گئی ہے کہ یہ ساتھ جنسی وصال کے بغیر ادھورا ساتھ ہوتا ہے۔ اس افسانے کو ایک تمثیلی افسانہ کہا جا سکتا ہے اس کی تکنیک بیانیہ ہے۔لمحوں کے اسیر'' سماج کے اتار چڑھاؤ میں ناکام محبتوں کی تصویر کشی کرتا ہے اس میں یورپ اور معاشروں کے تصوراتِ محبت کا بھی بھرپور اظہار ہوا ہے۔''کیسی قربت کیسی دوری'' ایک محبت کرنے والی روح کے بچھڑ جانے پر اور ایک ساتھی کے کھو جانے پر لکھا ہوا لفظی نوحہ ہے۔تشنہ لب میں ایک نوجوان لڑکی کہ جو باپ کی نگرانی میں پلی بڑھی ہے اسے اپنی ماں بہت یاد آتی ہے۔ وہ ماں جسے بد چلنی کا الزام لگا کر اسے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔عالیہ اپنے باپ سے بار بار کہتی ہے کہ وہ اپنی ماں سے

ملنا چاہتی ہے مگر اس کا باپ اس کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ شادی کے بعد عالیہ اپنے خاوند سے سارا ماجرا کہتی ہے ساجدا سے اس کی ماں سے ملواتا ہے یہ شادی کی دوسری رات کا واقعہ ہے۔ ساجد اس کہانی کا چشم دید گواہ تھا کہ جس کی دوسری شب کی حقدار وہ عورت قرار پائی جس کی کوکھ سے عالیہ نے اٹھارہ برس پہلے جنم لیا تھا، اور عالیہ کے خشک گلے میں چبھے کانٹے اس عورت نے ممتا رس کی بوند ٹپکا ٹپکا کر ایک ہی رات میں نکال ڈالے اور شمع بجھ گئی باپ کی شفقت سے محروم ہو جانے کا ایک دردناک نوحہ ہے۔ اس میں خواب اور حقیقت کے حوالے سے موت کی دہشت اور خصوصاً ایک شفیق باپ کی موت سے واحد متکلم کے سینے میں پیدا ہونے والے خلا کی منتخب الفاظ میں عکس بندی کی گئی ہے۔ ہسپتال، موت، منکر نکیر، حساب کتاب، خواب میں بھیا کا سفید چہرہ، باپ کی موت کے بعد ہر آہٹ، ہر آواز کا مرجانا ان کے بغیر جیتی بھی کیسے؟ شمع بجھنے کا استعارہ اپنے بطن میں معنویت کا ایک سلسلہ لیے ہوئے ہے۔ اس افسانے میں باپ سے محبت کے ضمن میں ایک بیٹی کے بھرپور جذبوں کو منعکس کیا گیا ہے۔ عذرا اصغر کی فنی مہارت کی بدولت یہ افسانہ زمانی حدود کو پھلانگتا نظر آتا ہے۔

اپنے اردگرد کے سماج کے چند اور تیوروں کو ظاہر کرنے کے لیے عذرا اصغر نے بے ڈھب، پت جھڑ کا آخری پتا، ڈوبتے ساحل اور کرامت والے، جیسے افسانوں کی تخلیق کی، بے ڈھب عذرا اصغر کے جرأت مندانہ اظہار کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں واحد متکلم ایک رسالے کا نگران ہے۔ دو فاحشہ عورتیں جمعدارنی اور اس کی بیٹی زرینہ اسے اپنی ہوس کاریوں کے جال میں پھنسانا چاہتی ہیں۔ مگر وہ بنیادی طور پر شریف ہے اور ان کی کسی چال میں نہیں آتا نتیجہ یہ ہے کہ اسے نامردی کا طعنہ سننا پڑتا ہے۔ عذرا اصغر کا موقف یہ ہے کہ اخلاق باختہ کرداروں کے لیے شرافت نامردی ہے اور یوں یہ خوب صورت طنزیہ تحریر ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس قسم کے رویوں کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟ پت جھڑ کا آخری پتا میں ایک دل پھینک کردار جامی کا مطالعہ ہے اسے بھی عذرا اصغر نے واحد متکلم خاتون کی زبان میں لکھا ہے میری زندگی میں بے شمار لڑکیاں آئیں مگر اب سوچتا ہوں وہ سب تمھارے قدموں کی دھول تھیں پیروں کی خاک اس افسانے میں اس نوجوان طالبہ کے جذبات اور احساسات کا موثر اظہار ہوا ہے جو ہوسٹل میں رہتی ہے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر میں مقیم ہے۔ ماں کی اُمیدوں، معاشرتی دباؤ اور داخلی جذباتی ابال کے مسائل کی اس افسانے میں پر تاثیر انداز میں وضاحت ہوئی ہے۔

ڈوبتے ساحل عذرا اصغر کا یہ افسانہ واحد متکلم مرد کی خود کلامی کی تکنیک میں ہے۔ واحد متکلم سیلاب میں گھرا ہوا ہے۔ ایک ٹیلے پر ایستادہ کسی امدادی پارٹی کا منتظر ہے۔ پانی اس کے پاؤں سے ہوتا ہوا آہستہ آہستہ ٹخنوں تک آ پہنچا ہے۔ اسے اپنے بچنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ موت اس کے چاروں جانب بازو کھولے کھڑی ہے۔ ایسے میں وہ یادوں کے حوالے سے عینی سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گاؤں کی خوب صورت ترین مٹیار زلیخا کی پھولی ہوئی لاش گزرتی ہے۔ واحد متکلم کے پاس سپنوں کی پونجی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس کی تمنا تھی کہ وہ عینی کے وجود میں اسی طرح مدغم ہو جاتا جیسے گاؤں کے ہرے بھرے کھیت پانی کے تختے میں مدغم ہو چکے تھے عینی کے کردار کا تعارف یہ ہے کہ وہ رواقی ہے اپسی کیورس، لیوکریشس، سسرو اور سنیکا کے فلسفہ حیات کی حامی ہے اور اس کے لیے چاہت، جذبہ اور خواہش فضول چیزیں ہیں۔ زلیخا واحد متکلم کو بن مانگے سب کچھ دینے کے لیے تیار تھی مگر واحد متکلم تو عینی کا گرویدہ تھا۔ وہ عینی کو فراموش کر چکا تھا مگر سیلاب اور موت کی اندوہناک اور دہشت ناک صورتِ حال میں گھر جانے کی وجہ سے وہ اسے پھر یاد آتی ہے۔ وہ اس کے اس فلسفے کو رد کرتا ہے جس میں خود غرضی بنیادی شے ہے یوں وہ دوسروں کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ واحد متکلم کو سیلاب میں بہتے گاؤں کا دکھ ہے شاواں اور اس کے سہاگ کے جوڑے کے بہہ جانے کا غم ہے گاؤں کی ہر شے کے برباد ہو جانے کا صدمہ ہے۔ اسے اس بات کا بھی ملال ہے کہ ہندوستان نے اپنے بپھرے ہوئے دریاؤں کا رخ ہماری جانب موڑ دیا ہے۔ اور وہ فطرت انسانی کے اس رویے سے بھی نالاں ہے بھائی بھائی کا گلا دباتا ہے۔ دوست دوست کی جیب کاٹتا ہے ہمسایہ ہمسائے کے گھر کو لوٹتا ہے۔ یہ افسانہ عذرا اصغر کے آؤٹ لک کی بلندی کو ظاہر کرتا ہے یعنی یہ کہ انسان کو دوسروں کے لیے جینا چاہیے اور زندگی میں طمع، تعیش و رخود غرضی کے رویوں سے اجتناب برتنا چاہیے۔ کرامت والے میں دیہات کے ماحول کی سادہ لوحی اور توہم پرستی کی تفصیل دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا کہ بے شعوری اور کم علمی کی وجہ سے لوگ جعلی پیروں کے ہتھے چڑھ کر اپنی عزتیں تک لٹوا لیتے ہیں۔

عذرا اصغر کے اس مجموعے میں بنیادی اہمیت کے افسانے وہ ہیں جن میں عورتوں کی آزادی کے معاملات پر رائے زنی کی گئی ہے دوسرا حادثہ، زہرقند اور مدوجزر۔ دوسرا حادثہ کا لب لباب اس افسانے کے ایک کردار تارا ہی کی زبان سے سنیے جس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے ''عورت کے مقسوم میں بہر طور لٹنا لکھا ہے وہ اپنے رضا سے لٹ جائے تو معاشرہ اسے ذلیل سمجھنے لگتا ہے۔ بدکاری کا دھبہ اس کے وجود سے چپک جاتا ہے مگر وہی عورت دوسروں کی رضا و رغبت سے لٹے تو نیک نامی ہی نیک نامی ہے بات ایک ہے انداز مختلف ہیں' حرامی بچہ، سہاگ رات یہ وہ الفاظ ہیں جن کے معانی تارا کو شادی سے پہلے معلوم نہ تھے مگر اس کا شوہر عرفات اسے ان سے آگاہ کرتا ہے یوں تارا پر اس کے خاندان کے بہت سے شرفاء کے راز منکشف ہو جاتے ہیں وہ سوچتی ہے کہ پیاری پیاری کہانیاں سنانے والے شجو ماموں اتنے بڑے بھوگی ہو سکتے ہیں یعنی ایک حرامی بچے کے خالق! زہرقند میں مردحاکمیت کے سماج میں اس مجبور عورت کی داستان رقم ہوئی ہے جو اپنے خاوند کے مظالم اور تشدد کا نشانہ بننے کے باوجود کسی دوسرے شخص پر اپنے حالات ظاہر نہیں کرتی۔ سنجیدہ اپنی زبان سے اس معاملے کا اعتراف نہیں کرتی ہمیشہ اپنے

خاوند کی پردہ پوشی کرتی ہے۔شمسہ کو سنجیدہ اس بچے کی مانند نظر آتی ہے جسے ذرا پیار کیا اور وہ کھلکھلا پڑا۔ یہ افسانہ مرد حاکمیت کے سماج میں عورت کی صدائے احتجاج کا ایک فنکارانہ ثبوت ہے اور اپنے اندر اَن گنت سوالات لیے ہوئے ہے۔ مدو جزرِ عورت کے آشوب پر لکھا گیا ایک اور افسانہ ہے جس میں منگنی کے بعد تمام رشتوں کے تبدیل ہو جانے کے تجربے منعکس ہوئے ہیں۔ عذرا کے افسانوں میں عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کا علم بلند ہوا ہے۔ ان کے پسندیدہ نسوانی کرداروں کی اکثریت سماج کی ناجائز دیواروں اور رکاوٹوں سے نالاں ہے۔ عورت عذرا اصغر کے لیے حقیقی تخلیق کی علامت ہے۔ وہ زندگی میں حسن بھی بھرتی ہے اور نئے نقوش کا ساؤنڈ سکیپ بھی لاتی ہے۔ وہ جدوجہد میں مصروف مرد کی ساتھی بھی ہے اور معصوم کلیوں کی قوتِ نامیہ بھی، وہ سوگوار اور درد کے مارے انسانوں کی رفیق بھی ہے اور بے رحم گلچیوں کی دشمن بھی۔ ان کے افسانوں کی باشعور عورت قربانی کی حقیقی روح سے بھی واقف ہے اور اپنے حقوق سے آگاہ بھی، یہ عورت ٹوٹ کر محبت کرنا بھی جانتی ہے اور دل کھول کر نفرت کرنا بھی۔ وہ معذوروں کی خدمت بھی کر سکتی ہے اور کڑیل تنومند جوانوں کی قدر بھی۔ بے سہاروں کا سہارا بننے کی امنگیں بھی اس کے ضمیر کا حصہ ہیں اور اپنے کمزور پہلوؤں کے حوالے سے سہاروں کی تلاش کی آرزوئیں بھی! وہ زیورِ حیا سے بھی آراستہ نظر آتی ہے اور حقیقی رشتوں کے احترام سے مالا مال بھی ہے۔ اس عورت کا قومی شعور بھی پختہ ہے اور وہ وطنیت کے حقیقی معانی بھی پہچانتی ہے۔ عذرا اصغر کا پسندیدہ نسوانی کردار انسان دوستی کا علمبردار ہے۔ طبقاتی تفاوت سے متنفر اور حقوق کی پائمالی سے افسردہ۔ یہ کردار حسن پرست بھی ہے اور فطرت شناس بھی۔ مناظر کی خوب صورتیوں کا دلدادہ بھی ہے پھولو، پھلوں، پیڑوں، سبزہ زاروں اور شام وسحر کی رنگینیوں کا رسیا بھی! عذرا اصغر کی آئیڈیل عورت وطن دشمنوں سے شدید نفرت کرتی ہے۔ اپنے والدین، بہن بھائیوں اور بچوں کے لیے گہرا خلوص اور ہمدردی بھی رکھتی ہے۔ وہ سرمایہ پرست اور سٹیٹس کی بھوکی عورتوں کو بیچ چوراہے ننگا بھی کرتی ہے اور محنت کش عورتوں کے لیے دست بدعا بھی ہے۔ اس کے لیے شریف مردوں کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ حرافہ عورتوں کو زہریلی آنکھوں سے دیکھنا اس کا شیوہ ہے۔ وہ آوارہ اور اوباش مردوں کا نفسیاتی آپریشن بھی کر سکتی ہے اور محبت کرنے والے مردوں سے قدم ملا کر چلنے کو بھی تیار ہے۔ عذرا اصغر ایک منجھی ہوئی افسانہ نگار کی طرح زندگی اور سماج کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھتی ہے ان کے افسانوں کے لینڈ سکیپ میں ان گنت اشیا اور چہرے موجود ہیں ان کے یہ افسانے خیال انگیز بھی ہیں اور موثر بھی۔ یہ افسانے حقیقت پسندی اور سماجی مشاہدے کی تفصیلات لیے ہوئے ہیں!

بقیہ : ''عذرا اصغر کا طلوع''

تاہم انھوں نے اس پیاسی دھرتی کو یکسر بانجھ اور تخلیق سے عاری قرار نہیں دیا۔ وہ اس کی تخلیقی قوت سے آشنا ہی نہیں بلکہ معترف بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں گیلی مٹی کا تصور بھی نمایاں نظر آتا ہے جو زرخیزی اور تخلیقی نمو کا آئینہ دار ہے۔ افسانہ ''دوسرا حادثہ'' میں جب اس دھرتی کو نم کا چھینٹا ملتا ہے تو ساری الجھی ہوئی گتھیاں خود بخود سلجھ جاتی ہیں اور زندگی اپنا تمام اسرار آشکار کر دیتی ہے۔ افسانہ ''سہارا'' میں جب آسمان خود زمین کے قدموں میں پناہ حاصل کر لیتا ہے تو یہ محض ایک چڑے اور چڑیا کا سنجوگ نہیں رہتا بلکہ اس کے ساتھ پوری کائنات بھی جھومنے لگتی ہے۔ پاپولر کے اونچے درختوں کی ٹہنیاں ننھی ننھی ہری کونپلوں سے لد جاتی ہیں، سفید میٹھا پانی دھریے دھریے ہلکورے لینے لگتا ہے۔ لہریں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی ہیں سوکھی خاک اڑاتی زمین سبز مخملیں، فرش سے ڈھک جاتی ہے اور دنیا پر بہار آ جاتی ہے۔ اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ عذرا اصغر نے تکمیل کائنات کے جذبے کو محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اس کے فطری تخلیقی زاویے کو ابھار کر کائنات کے حسن میں اضافہ کرنے کی کاوش بھی کی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم عذرا اصغر کو اپنی معاصر افسانہ نگاروں سے منفرد قرار دے سکتے ہیں۔

- بقیہ -
''پت جھڑ کا آخری پتا''

پن برداشت کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ ایسے دور میں جسموں کی تو فراوانی ہوتی ہے لیکن اندر اس قدر خالی ہو جاتا ہے کہ لیپا پوتی کے بغیر زندگی کو گھسیٹنا مشکل سے مشکل تر ہو جاتا ہے۔ زہر قند ایک نئی سوچ دے کر ہم سے رخصت ہو جاتا ہے۔

عذرا اصغر کے کردار زندگی کے عام کردار ہوتے ہیں۔ معاشی بد حالی کے شکار ادیب، متوسط طبقے کے کردار جو مشقت سے چور ہو کر گھر لوٹتے ہیں یا پھر وہ عام طبقہ جسے ہم مزدور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ہمارے لیے اجنبی نہیں ہوتا۔ لیکن ان کرداروں کو وہ ہمارے لیے اہم بنا کر پیش کرتی ہیں۔ اور ان کرداروں کے ذریعے وہ اپنے گرد و پیش کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ کردار زندگی کی دوڑ میں بھر پور طور پر شریک ہوتے ہیں۔ اُن کے کردار نہ تو ابنارمل ہوتے ہیں۔ اور نہ معاشرے کے باغی۔ لیکن اس کے باوجود وہ افسانہ کی دلچسپی کو قائم رکھتے ہیں۔

غرض یہ کہ عذرا اصغر اردو ادب میں ایک نمایاں مقام کی حامل ہیں اور اُن کا مجموعہ پت جھڑ کا آخری پتا اردو افسانوں کی دنیا میں خوبصورت اضافہ ہے۔

جہانِ افسانہ کا بیان

اے بی اشرف
(ملتان)

یورپ پر ایک دور ایسا گزرا جیسے کہ جب وہاں کی عورت ہمارے یہاں کی عورت کی طرح بے زبان بھی تھی اور بے آواز بھی۔ وہ اُمور خانہ داری اور افزائشِ نسل جیسے بامعنی وظائف کی تکمیل کا فرض پورا کرتی تھی۔اور بس۔۔۔صنعتی انقلاب آیا تو صورت حال بدل گئی۔عورت خود کمانے لگی۔معاشی آزادی حاصل کرتے ہی آزادیِ نسواں اور آزاد محبت کی تحریکوں میں حصہ لینے لگی۔کارخانوں میں مشینی ضروریات کے تحت بال کٹوانے لگی۔یہاں تک کہ بوائے کٹ کا رواج آ گیا۔۔۔سکرٹ تنگ ہو کر سکڑنے لگا اور اونچا بھی ہونے لگا۔یہاں تک کہ منی سکرٹ بن گیا۔

ہمارے یہاں یہ سب کچھ سرسید دور سے آہستہ آہستہ شروع ہوا اور اب تک یہ عمل جاری ہے۔لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں نوبت سلیولیس تک پہنچ پائی ہے۔ملتان ذرا قدیم شہر بھی ہے اور تاریخی بھی یونیورسٹی تک کی لڑکی کا دوپٹہ سر سے کھسکا اور واویلا مچ گیا اور واویلا مچانے والے وہ لوگ ہیں جو گھر میں ریڈیو تو لاتے ہیں لیکن بیوی کو ریڈیو سنتا دیکھ کر لاٹھی سے ریڈیو کا قلع قمع کر دیتے ہیں اور ٹی وی میں جین پہنے لڑکی کو دلچسپی کی پوری توانائیوں سے دیکھ کر آخیر میں لاحول پڑھ دیتے ہیں اور پھر ایک عدد خط مدیر محترم کے نام لکھ کر نفس کش اور نفسی کشی کا کفارہ بھی ادا کرتے ہیں خیر یہ تو تھا ایک جملہ معترضہ۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ زندگی کے اخراجات میں اضافے اور رشتوں کی کمیابی کے سبب لڑکیاں پیشوں میں بھی داخل ہونے لگیں۔سکولوں، کالجوں اور ہسپتالوں سے آگے بڑھ کر ریڈیو، ٹی وی، بنک دفتروں اور دکانوں تک پہنچ گئیں۔برقعہ اترا تو لباس کی تراش خراش پر متوجہ ہونا پڑا۔خود کفیل بنیں تو پسند کا خاوند، برابر کے سلوک، سماجی میل جول اور گھر والے سے گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کا تقاضہ بھی کرنے لگیں۔یہاں تک کہ افسانہ بھی لکھنے لگیں۔۔۔اور تقریب کے درمیان بیٹھ کر جانِ محفل بھی بن گئیں۔آج ایسی خواتین میں سے ایک خاتون ہمارا موضوع ہیں۔عذرا اصغر جو آج کی باشعور جرأت مند، سوشل اور تعلیم یافتہ خاتون افسانہ نگار ہیں۔

اردو افسانہ نگاری میں مردوں سے زیادہ عورتیں مقبول ہوئی ہیں۔مختصر افسانہ صنفِ نازک کو خوب راس آیا ہے۔حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، واجدہ تبسم، خالدہ اصغر، جیلانی بانو، رضیہ فصیح احمد، بانو قدسیہ اور آج کی ہماری افسانہ نگار عذرا اصغر۔

دراصل یہ سب کی سب دنیا کی سب سے بڑی کہانی نگار شہرزاد کی دوتیاں پوتیاں ہیں جو اس کی روایت کو آگے بڑھا رہی ہیں۔لوری دینا ان کا شعار ہے اور کہانی سنا کر سلانا ان کا منصب رہا ہے۔سونے والے بچے ہوں یا بڑے۔یہ سلا دیتی ہیں۔کبھی عقل پر پردہ ڈال کر، کبھی تھپک کر اور کبھی کہانی سنا کر۔کیونکہ بولنا ان کو آتا ہے اور مرد کچھ نہ سن کر بھی سننے کا گُر جانتا ہے۔سمجھنے کا اسے دعویٰ نہیں۔عذرا اصغر دل چسپ اور کراری کہانیاں سناتی ہیں۔حالی کی کہانیوں کی طرح ان کی کہانیاں نیندیں نہیں اچاٹ دیتیں۔بے مزہ نہیں کرتیں بلکہ سہلاتی ہیں۔لوریاں دیتی ہیں۔

نئے افسانے کے افق پر عذرا اصغر کا نام ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔اس نام کے نقش کو ابھارنے اور لوگوں کو متوجہ کرنے کا کام جتنا تنہا اظہر جاوید نے کیا ہے اتنا شاید اخباروں، رسالوں، طاہر تونسوی کی تقدیروں اور احمد ندیم قاسمی کے **فلیپس** نے بھی نہیں کیا۔عام قاری کی حیثیت سے جب میں نے ان کی فنی اور تخلیقاتی دنیا کا سفر شروع کیا تو نہ میں کسی طلسماتی فضا میں اسیر ہوا۔نہ علامتوں کے چکر میں پھنسا، نہ تعصبات کی الجھن کا شکار ہوا۔نہ اجنبیت کا احساس ابھرا نہ دوریوں کے فاصلے ناپنے پڑے۔میں نے اس دنیا کو سادہ پایا۔چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل کی دنیا۔جو کبھی حل ہو جاتے ہیں اور کبھی حل نہیں ہو پاتے۔یہاں حقیقتیں بھی ہیں اور خواب بھی۔حقیقتیں ہیں تو تلخ نہیں۔ناقابل برداشت نہیں۔خواب ہیں تو ماورائے حیات نہیں۔وہ حقیقت نگاروں کی طرح کھری کھری بے رحم باتیں نہیں کرتیں۔مہربان سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے، اور حسین اسلوب کا پیالہ ہاتھ میں تھامے معاشرے کا زہر بھی پیا کرتی ہیں تو امرت معلوم ہوتا ہے۔اس لیے کہ وہ معاشرے کی ناہمواریوں کو دشمن کی طرح نہیں دوست کی طرح دیکھتی ہیں۔ان میں زہرناکی نہیں ہوتی۔ہمدردی اور خلوص کا رس ہوتا ہے۔وہ ان ناہمواریوں پر جھنجلاتی نہیں، کوسنے نہیں دیتی، تبسم کناں ہو جاتی ہیں۔پلکوں میں اوس کے قطرے سموئے۔تبسم اور آنسو کے ملاپ سے وہ حقیقتوں کو نیا روپ دے دیتی ہیں۔اس روپ میں تازگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔اور نئے ذائقوں کا مزہ بھی۔

عذرا اصغر واقعی زندگی کی ناہمواریوں پر جھنجلاتی نہیں۔اس کے لیے چیتے کا جگر چاہیئے یا کسی خاتون کی مجبوری، عذرا اصغر کے پاس حوصلہ ہے یا مجبوری۔اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔بہر حال عذرا محبتوں اور چاہتوں کے پیغام عام کرنے کا آدرش رکھتی ہیں۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہاں بدنیتی کے بیج بوئے جاتے ہیں اور منافقتوں کی فصلیں کاٹی جاتی ہیں۔پھر بھی عذرا اصغر کا احسان ہے کہ انھوں نے امن کا گیت گایا ہے۔محبت کا پیغام دیا ہے۔

''محبت جو برگد کی گھنی چھاؤں ہے۔ریشم کے تاروں کی طرح کومل ہے۔پہاڑی جھرنے کی مانند مترنم ہے اور چاندنی جیسی مدھر۔''
(گھس بیٹھے، ص ۶)

عذرا اصغر رنگوں، خوشبوؤں، بہاروں، محبتوں، چاہتوں اور معصوم رشتوں کی بات کرتی ہیں۔منافقتوں، خباثتوں، کدورتوں اور نفرتوں سے آنکھیں بند کر لیتی

ہیں کہ ان کے سینے میں ایک مہر پذیر دل دھڑکتا ہے۔ ان کے چہرے پر افق کے اس پار چمکتی صبحوں کے مچلتے سائے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں دور بہت دور کی ان دیکھی دنیاؤں کی تلاش کی چمک ہے۔ وہ موجود اور معلوم کے حوالے سے موہوم اور نامعلوم کی تمنا کرتی ہیں۔ اور وہاں تک پہنچنا ان کا آدرش ہے۔ فاصلہ قرنوں کا ہے لیکن یہ ان کا جذب وشوق ہے جو ان فاصلوں کو طے کر جاتا ہے۔

ایک حساس افسانہ نگار کا دل سب کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ وہ دوسروں کے دکھ پر کڑھتا ہے ان کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر کرب محسوس کرتا ہے۔ وہ سماجی نا انصافی کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ عذرا اصغر زندگی کے دوزخ کا بیان باہر سے نہیں اندر سے کرتی ہیں کیونکہ وہ اپنے ہر افسانے میں بہ نفسِ نفیس موجود ہوتی ہیں۔ نہ صرف واقعات میں شریک بلکہ ہر عمل اور ردعمل میں بھی نمایاں ہوتی ہیں۔ ''گھس بیٹھے'' اور ''شمع بجھ گئی''، ''تماشا میرے آگے''، ''سات تصویریں''، ''بہلاوا''، ''پت جھڑ کا آخری پتا''، ''مدوجزر'' وغیرہ سب ایسی کہانیاں ہیں جن میں عذرا اصغر خود شامل ہیں۔

دراصل فنکار میڈیم ہے۔ جس کے وسیلے سے زندگی ادب اور فن میں منتقل ہوتی ہے۔ یہ زندگی المناک بھی ہے۔ کریہہ المنظر بھی۔ اور بھیانک بھی لیکن یہی زندگی فنکار کے اندر سے جب پھوٹتی ہے تو اس میں سے قوسِ قزح کے رنگ شرارے بن کر چھوٹنے لگتے ہیں۔ عذرا اصغر نے تلخ زندگی کو آتش بازی کے شراروں کی طرح بکھیرا ہے۔ دیکھنے میں آگ ضرر رساں برتنے میں بے ضرر ٹھنڈی۔ عذرا اصغر خود کہانی میں موجود رہ کر بھی خود کہانی کا کردار نہیں بنتیں محض ایک میڈیم رہتی ہیں۔ جس کے ذریعے زندگی کی حقیقتوں کو رومانی انداز میں بے نقاب کرتی ہیں۔ وہ اپنی کہانی میں نہ تو ذرہ بن کر چمکتی ہیں کہ آنکھوں کو خیرہ کر دیں اور نہ صحرا بن کر پھیلتی ہیں کہ قاری کو گم کردہ راہ بنادیں۔ واقعات کی کرنیں بکھیرتی جاتی ہیں۔ ہم سمیٹ لیں تو روشنی بن جائیں نہ سمیٹیں تو دیپک اور جگنور ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کسی بھی معاشرتی فرد کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک لاشعوری اور دوسرا شعوری اور سماجی۔ دو منطقوں کے درمیان بھٹکنے والی شخصیت کا جھکاؤ اگر ایک طرف زیادہ ہو جائے تو وہ نیوراتی ہو جاتا ہے۔ عذرا اصغر کی شخصیت اتنی متوازن ہے کہ اس کا جھکاؤ کسی ایک طرف نہیں ہوتا بلکہ وہ اعتدال قائم رکھتے ہوئے انسانی سائیکی کے ساتھ ساتھ اس کے سماجی منصب کو بھی نظر انداز نہیں کرتیں اس لیے تو احمد ندیم قاسمی نے کہا ہے کہ

> ''عذرا اصغر نے معاشرتی مسائل کی پردہ
> کشائی میں بے خوفی اور تہذیب کا ایک
> متوازن امتزاج اور معیار بیان کیا ہے۔''

ان کے یہاں غیر معمولی نفسیاتی ژرف نگاہی، نفسی الجھنیں یا علامتی نظام موجود نہیں ہے البتہ فنکارانہ سلیقہ مندی ضرور ہے۔

عذرا اصغر نے چھوٹی چھوٹی خوبصورت کہانیاں تخلیق کی ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر۔۔۔ خوبصورت بھی اور تلخ پہلوؤں پر بھی۔۔۔ ان میں اختصار کے ساتھ ساتھ سادگی بھی ہے۔ رومان کی چاشنی بھی۔ عذرا اصغر کا طرز احساس شاعرانہ ہے کہانی نگاروں جیسا نہیں یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں غزل کے اشعار ہیں۔ ان کو ملا دیا جائے تو ایک غزل بن جائے گی۔ محبت، حسن اور سادگی سے پُر، موضوع اور اسلوب کا رومانوی رویہ عذرا اصغر کا کریز ہے۔ تازہ پھولوں، خوبصورت گلدانوں، سفید گلابوں مست جھولوں، آڑو کے درختوں، کنواری شاخوں، سونا بکھیرتی کرنوں، نکھری جھیلوں، خوشبو سے بوجھل ہواؤں، چہچہاتی چڑیوں، مست خرام پانیوں کا ذکر کرتے وہ تھکتی نہیں۔ سہارا، آڑو کے پھول، ''پت جھڑ کا آخری پتا'' خالصتاً رومان رویے کے حامل افسانے ہیں۔ ''کھوکھلی دیوار''، ''تماشا مرے آگے''، ''بے ڈھب'' وغیرہ حقیقت سے پُر کہانیاں ہیں۔ جن میں طبقاتی شعور بھی ملتا ہے۔ غریب اور امیر کا فرق بھی نمایاں ہے۔ سامنے کی حقیقتیں بھی ہیں۔

جنس کے بارے میں عذرا اصغر کا رویہ غیر معمولی انسان کا رویہ نہیں ہے ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول صورت حال یہ ہے کہ اگر جنس افسانہ نگار پر سوار ہو جائے تو لذیذیت کا شکار ہو کر پڑھنے والوں کی کنپٹیاں گرم کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔ اگر وہ خود جنس پر سوار ہو جائے تو پاک محبتوں والے نیم پخت رومانی افسانے لکھے گا لیکن ان دونوں Behaviours کے برعکس وہ جنس کو زندگی کا ایک حیاتیاتی عمل سمجھتے ہوئے آنکھ جھپکے بغیر اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے تو پھر اس نازک مسئلے کے ساتھ صحیح معنوں میں انصاف کرنے کے قابل ہوگا۔ عذرا اصغر کے یہاں جنس کا مسئلہ تسلسل یا تواتر کے ساتھ پیش نہیں ہوا۔ انھیں اور بہت سے مضمون مل جاتے ہیں۔

''بے ڈھب'' کا موضوع اگرچہ جنس ہے لیکن اس کو معاشرتی حوالوں کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش اسے ایک اقتصادی افسانہ بناتی ہے۔

عذرا اصغر نے اپنی ان کہانیوں کو ان محبتوں کے نام منسوب کیا ہے جو ان کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔۔۔ خوشی کی بات ہے کہ انھیں یہ سرمایہ میسر ہے ورنہ اس دنیا میں اسی چیز کا تو قحط ہے۔ خدا ہم سب کو یہ سرمایہ عطا کرے۔

''غلام''

جو لوگ سوال نہیں اٹھاتے وہ منافق ہیں۔ وہ لوگ جو سوال کر نہیں سکتے وہ احمق ہیں اور جن کے ذہن میں سوال اُبھرتا ہی نہیں۔۔۔ وہ غلام ہیں۔

جارج گورڈن بائرن

مسافتوں کی تھکن

ڈاکٹر صابر لودھی

(●)

عذرا اصغر کا ناول ''مسافتوں کی تھکن'' کا مطالعہ شروع کیا تو ۱۹۴۷ء کے اُس دور میں چلا گیا۔ جب شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کی نظم 'فتنۂ خانقاہ' میرا دل لبھاتی تھی۔ شاعر مزدور احسان دانش کا کلام دیہات کی رنگین شاموں کا جلوہ دکھاتی اور سب سے بڑھ کر اختر شیرانی کی سلمٰی میرے خوابوں میں آتی تھی۔ عذرا اصغر نے شاعری کا جوہر نثر میں استعمال کیا تھا۔

''اترتی بہار میں گلاب کی شاخوں پر پھوٹتے شگوفے ماضی کے دریچے ان کے سامنے ایسے ہی وا کر دیتے ہیں جیسے گلاب کی شاخ میں اٹکی کلی دھیرے دھیرے اپنی پنکھڑیاں کھول کے پھول بنتی ہے اور سورج کی اولین نرم کرنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی ہے ایک فتح مند مسکراہٹ۔۔۔لطیف اور معصوم مسکراہٹ۔۔۔''

میں نے سوچا ''مسافتوں کی تھکن'' ایک رومانی ناول ہو گا جسے مزید رومانی بنانے اور محبت کی وارفتگی بیان کرنے کے لیے شعروں اور نظموں کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔

محبت پھول، خوشبو اور صبا ہے
محبت چودھویں کی چاندنی بھی
محبت آبشاروں کی نغمگی بھی

اور

محبت کعبۂ دل کا نگیں ہے
محبت خانہ دل میں مکیں ہے

عمر کے اس حصے میں شاعری اور رومان میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

چند صفحات کے مطالعے کے بعد ''مسافتوں کی تھکن'' میں مجھے انسانی رشتوں کی لہر بہر نظر آئی۔ نچلے متوسط طبقے کے پڑھے لکھے اور آپس میں جُڑے ہوئے انسانوں کی کہانی جو پاکستان بلکہ برصغیر پاک و ہند کے بے شمار خاندانوں کی کہانی بھی بنتی ہے۔ خاندان کی روایت کی کیل سے بندھے افراد۔ مرد و زن۔۔۔جو آزاد ہونا چاہتے ہیں لیکن ہو نہیں پاتے۔ احترام کی مضبوط رسی انھیں اپنے مرکز سے دور ہونے نہیں دیتی۔ رخشندہ ایک مرکزی کردار ہے جو ایک طرف راشد علی کی محبت کی ڈور سے بندھا ہوا ہے لیکن دوسری طرف اپنے مضبوط مرکز سے ٹوٹ بھی نہیں سکتا۔ رخشندہ اور راشد کی رومانی کہانی اگر ماہین کی وجہ سے ٹوٹ نہ جاتی تو یہ ایک رومانی ناول ہی ہوتا لیکن عذرا اصغر نے اپنی ژرف نگاہی سے پہلے اسے عمرانی اور پھر نفسیاتی ناول بنا دیا۔ رومان پس منظر میں چلا گیا اور زندگی کے حقائق سامنے آ گئے۔

عذرا اصغر نے سب سے پہلے رخشندہ کی ذات پر ٹوٹنے والے عذاب کا مطالعہ پیش کیا۔ اُس کی نفسیات کا مطالعہ کیا اور اُس کے حوالے سے اُس کے خاندانی اور خونی رشتوں کی نفسیات کا جائزہ لیا۔ کبھی اُسے اس لیے عزت ملی کہ بڑے بھائی نے خاندانی مکان اُس کے نام کر دیا تھا اور اب اُسے واپس حاصل کرنے کی آرزو رکھتے تھے اور کبھی اس لیے چاہا گیا کہ وہ خاندان کے چھوٹوں کو سنبھالنے کا فریضہ بطریق احسن ادا کر سکتی تھی۔ راشد اُسے چھوڑ کے سکردو کے خوبصورت علاقے میں جا بسے تھے۔ بزدل اور مغرور بن کر۔ رخشندہ کی اس محرومی پر کسی کو ہمدردی نہ تھی بلکہ خاندان کا کوئی فرد اُس کی شادی کے حق میں نہ تھا لیکن جب بڑے بھائی کو اُس کا خاندانی مکان واپس مل گیا اور فرجاد جیسے دولت مند آدمی سے رخشندہ کی شادی ہو گئی تو رشتوں میں اعتدال آ گیا۔ اس طرح عذرا اصغر مفلسی کو رشتوں کی کمزوری کا سبب سمجھتی ہیں۔ دولت ہو تو روایات کا نعرہ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ وہی رخشندہ جسے فرجاد سے شادی کرنے کے فیصلے کے سبب گمراہ اور کلنک کا ٹیکا سمجھا جا رہا تھا۔ اور روشنا جیسی لڑکی اُسے اپنے سے کمتر سمجھتی تھی رخشندہ کے ہاتھ میں فرجاد کی دی ہوئی انگوٹھی دیکھ کر چیخ اٹھتی ہے۔

''اُف اللہ۔ اور انگوٹھی بھی کتنی قیمتی ہے ہیرے کی۔۔۔اتنا بڑا ہیرا''

اور یہ ہیرا رخشندہ کی کمتر ذات کو بہترین ذات میں بدل گیا۔

تھامس ہارڈی نے اپنے ناولوں میں جو خوبصورت فضا پیش کی ہے کچھ ایسی ہی فضا عذرا اصغر نے اپنے اس ناول میں قائم کی ہے گلگت، سکردو اور شمالی علاقہ جات کا حسن اس ناول کی ایک اضافی خوبی ہے لیکن غیر شعوری طور پر عذرا اصغر نے چارلس ڈکنز کا تتبع کیا ہے۔ ڈکنز نے اپنا ایک مشہور ناول "Hard Times" انگلستان کے بورژوائی اور فرسودہ تعلیمی نظام پر تنقید کرنے کے لیے لکھا تھا۔ ایک مخصوص تعلیمی ماحول میں پرورش پانے والے بچے معاشرے کے تضاد کا شکار ہو کر کس طرح برباد ہوئے ہیں۔ اس ناول کا یہ بنیادی موضوع تھا لیکن جب ناول چھپا تو نقادوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اس ناول میں صنعتی ترقی سے ہونے والی بربادی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ انڈسٹری ہاتھی کی طرح تمام صلاحیتوں اور قدروں کو کھا جاتی ہے عذرا اصغر نے بھی رومان کی گٹھڑی سے پاکستان کے بدلتے ہوئے سماجی حالات اور سیاسی خرابیوں کی تصویر نکالی ہے۔ فوجی حکومتوں نے کس طرح دہشت گردوں کو ابھارا ہے اور کیسے مختلف مذہبی فرقوں کی ہم آہنگی کی توڑ پھوڑ کی ہے۔

''اس شہر میں بہت سے مزارات تھے اور ایک قتل گاہ بھی تھی جو کربلائے معلّی کا ''مینی ایچر'' تھی۔ آئمہ معصومین کی قبور مقدسہ اور دیگر زیارات کو کربلا کے انداز میں ترتیب دیا گیا تھا۔ قتل گاہ کے ایک وسیع حصے پر ان فوجی شہداء اور جوانوں

باقی صفحہ۱۷پر ملاحظہ کیجیے

افسانہ

''ہیڈکوارٹر''

عذرااصغر

(زیرنظرافسانہ جناب مستنصرحسین تارڑ نے پاکستان ٹیلی وژن،لاہورسینٹر کے لیے ڈرامہ ٹائز کیا)

☆

صبح کے اخبار میں پڑھ کر دفعتاً مجھے وہ یاد آ گیا۔

بیشک کیسی ہی پالیسی بنائی جائے کہ سنسنی نہ پھیلے لیکن ایک آدھ خبر تو بچ بچا کر منظرِ عام پر آ ہی جاتی ہے کہ دل دھک سے رہ جائے۔تاہم وہ خبر جو میں نے پڑھی بظاہر دل دھڑکانے والی تو نہ تھی پھر بھی میرے لیے وہ بڑی اہم خبر ثابت ہوئی۔ سمگلنگ، ڈاکہ، چوری، اغوا اور قتل کی خبریں تو زندگی کا معمول ہیں۔ایسی خبریں پڑھ کر تو ہم اخبار یوں اُچھال دیتے ہیں جیسے وہ اخبار نہ ہو ردی کا ٹکڑا ہو۔۔۔بے مصرف۔۔۔بے کار۔۔۔مگر آج صبح کے اخبار کی وہ خبر میرے لیے، بہت اہم ہے۔

''مظفرآباد سے آتا ہوا ٹرک پکڑا گیا جس میں سمگلنگ کا سامان بھرا ہوا تھا۔دو ملزم گرفتار۔۔۔ڈرائیور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔''

یہ تھی وہ خبر جس نے مجھے غیر مطمئن کیا تھا۔ بظاہر معمولی اور غیر اہم لیکن۔۔۔جب رات کا اندھیرا پھیل جائے گا یا اگلی صبح کی پو پھٹ رہی ہو گی تو میرے دروازے پر دستک ہو گی۔۔۔کوئی بڑھ کر دروازہ کھول دے گا اور وہ منہ سر لپیٹے۔۔۔ہاتھ پیر، جسم چادر میں ڈھانپے وہ میرے سامنے کھڑا ہو گا۔

''صادق آ گیا۔۔۔صادق آ گیا'' بچے بستر سے منہ نکال نکال کر شور مچائیں گے۔

''میں چھپ کر بھاگا ہوں عنبر صاحب جی کہ آپ سب سے مل لوں۔پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔'' وہ میرے پیر چھوتے ہوئے کہے گا۔

''کمبخت! پھر کچھ کیا تو نے؟''

''بی بی درخت کاٹے ہیں ہم نے۔وہ لکڑی ہم وزیر آباد لا رہے تھے کہ ٹرک پکڑا گیا۔ میں بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔سوچا جیل جانے سے پہلے آپ سے تو مل لوں۔'' وہ کہے گا اور پھر کچن میں گھس کر چائے بنانے لگے گا۔ وہ جب بھی آتا ہے ایک آدھ ایسی ہی داستان سناتا ہے۔دس بیس دن گزارتا ہے اور پھر برس دو برس کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔

اس کی حیثیت میرے گھر میں افرادِ خانہ جیسی ہے۔بعض لوگ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہوتے ہیں۔اپنے تمام تر معمولی پن کے باوجود بڑے اہم ہوتے ہیں۔۔۔صادق بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔بیحد معمولی مگر از حد اہم۔۔۔بارہ برس پہلے وہ دبلا پتلا مریل سا ایک لڑکا تھا۔دس یا بارہ کا سن ہو گا۔گورا میلا میلا سا رنگ، کتابی چہرہ، بڑی بڑی ویران آنکھیں، پھٹے ہوئے میل بھرے ہاتھ، جوتوں سے ناآشنا کھردرے پیر، ٹخنوں سے اونچی کالی دھوتی اور لمبا سیاہ رنگ کا کرتا جو یقیناً میلا چکٹ ہو گا مگر اپنے رنگ کی وجہ سے پتہ نہ چلتا تھا۔

''اوفوہ! مجھے اس وحشی کے ساتھ مغز کھپائی کرنا پڑے گی؟'' بے حد کوڑھ میں نے سوچا۔

''تم کشمیری ہو؟'' میں نے اسے مخاطب کر کے پوچھا۔

''جی۔۔۔ہاں جی'' بڑی سستی سے اس کی گردن ہلی۔

''مجھے تو تم میانوالی کے جانگلی لگتے ہو۔پکے جانگلوش۔'' میں نے ظراف سے کہا۔وہ سہما سہما ذرا کے ذرا مسکرایا اور میری جان میں جان آئی۔

''چلو اور کچھ نہ سہی خوش مزاج تو ہے نا'' میں نے سوچا اور اطمینان کا سانس بھرا۔ اسے میری تنگ مزاجی کہہ لیجیے یا حسن پرستی کہ بدشکل، بدمزاج، کند ذہن نوکر بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔صادق کی خوش مزاجی سے میرا دل ٹھہر سا گیا۔اسے ہاتھ منہ دھونے کا کہہ کر میں کپڑے سینے بیٹھ گئی۔میں جب تک سلائی کرتی رہی وہ صحن میں لگے نلکے کے نیچے بیٹھا جھانوے سے ہاتھ پیر مانجھتا رہا۔چند گھنٹوں کی محنت کے بعد اس نے کینچلی بدل کر خود کو کسی حد تک عین میرے معیار کے مطابق بنا لیا تھا۔

دن گزرنے لگے اور صادق رفتہ رفتہ بڑی تیزی سے سارے گھر پر چھا گیا۔ہر کام وہ ایسے کرتا جیسے ہمیشہ سے جانتا ہو، ہر آدمی کا مزاج شناس ہو۔کس کو کیا پسند ہے، کیا برا لگتا ہے، وہ ہر دم سب کا خیال رکھتا۔بظاہر لاابالی، کھلنڈرا مگر کام میں مستعد اور چوکس۔البتہ صبح اٹھنے میں اسے بہت دقت پیش آتی۔میں ناشتہ بنا کر بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر لیتی تب کہیں اُٹھتا۔

''صبح سے چیخ چیخ کر تھک گئی ہوں۔نواب صاحب کی آنکھ ہی نہیں کھلتی۔'' میں بگڑ کر کہتی۔

''آپ جی میرا پیر گھسیٹ کر مجھے منجی سے نیچے گرا دیا کریں جی یا میرے اوپر پانی ڈال دیا کریں۔'' وہ کمال سادگی سے کہتا اور ہنس پڑتا۔

''میں کیا کروں جی۔نیند ہی نہیں کھلتی۔''

''تمہاری خادمہ ہوں نا میں۔'' میں جل جاتی۔

''بی بی بس یہی تو خرابی ہے مجھ میں۔'' وہ لاپروائی سے کہتا اور بچوں کے بستے گلے میں لٹکا کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔میری ڈھیل اور لاڈ پیار نے ہی اسے بگاڑ رکھا تھا شاید۔بارہا میں نے اس کے ساتھ بیگماتی قسم کا سلوک کرنا چاہا مگر میرے اندر بیٹھے حضرت ضمیر صاحب نے ہر بار میری ہمت توڑ دی۔''وہ بھی آخر کسی کا بچہ ہے نا'' میرا دل دکھ جاتا۔''بے رحم حالات اور زندگی کی مجبوریوں نے اس کمسنی میں اسے تیرے میرے جھوٹے برتن صاف کرنے اور جھڑکیاں کھانے پر معمور کر دیا ہے تو کیا ہوا۔ہے تو وہ کسی ماں کا دلارا'' میں سوچتی۔کام

سے فراغت پا کے وہ میرے بچوں کے ساتھ کھیلتا۔ کبھی ان کے ساتھ بیٹھ کر پڑھتا، کتابوں سے کہانیاں سنتا مگر لکھنے پڑھنے میں اس کا جی نہ لگتا۔ گھر کا کام وہ شوق سے کرتا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی ایمانداری تھی۔ میں کہیں جانے کے لیے تیار ہوتی تو میرے زیور تک وہ ہی نکال کر دیتا۔ سودا سلف لانے کو پیسے چاہیے ہوتے تو الماری سے میرا پرس وہی اٹھا کر لاتا اور پھر رکھتا بھی۔ کیا مجال کہ ایک دھیلہ بھی اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ میں اس سے کلّی طور پر مطمئن تھی اور وہ بھی خوش تھا۔ اس کی یہ پہلی نوکری تھی۔ معصوم زندگی کا پہلا تجربہ۔۔۔ کئی مہینے بعد اس کے گھر سے خط آیا۔ اسے بلایا گیا تھا۔ پیغام ملتے ہی وہ مچل گیا۔

''بی بی جی صرف ایک ہفتے کی چھٹی دے دیں۔'' وہ اصرار کرنے لگا۔ میں چند ہی ماہ میں خاصی آرام طلب ہو گئی تھی۔ اس نے گھر ایسے سنبھال لیا تھا جیسے کوئی جہاندیدہ پختہ کار عورت سنبھالتی ہے۔ شرفا میں اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے اسے خوب آ گئے تھے۔ میں اس کے چھٹی جانے کے تصور سے حراساں ضرور تھی مگر اسے بہر طور اپنے گھر جانا تھا۔ اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ سے ملنا تھا۔ اپنے گاؤں کے مرغزاروں میں گھومنا تھا۔ اپنے ہمجولیوں کو شہر کی باتیں سنانا تھیں۔ ساتھیوں پر اپنی شہریت کا رعب ڈالنا تھا۔ چھٹی جانا بہر حال اس کا حق تھا اور میں اس کا یہ حق چھین نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک ہفتے کے وعدے پر گھر چلا گیا۔ ہفتے کے سات دن میں نے گن گن کر گزارے۔ ہفتہ گزر گیا مگر وہ نہیں آیا۔ اور بھی چار چھ دن یونہی گنتی کرتے گزر گئے۔ میری مایوسی یقین میں بدل گئی۔ ''بس اب نہیں آئے گا وہ'' میں نے سوچ لیا۔ ''پچھلے نوکروں کا تجربہ میرے سامنے تھا۔ وہ بھی بہر حال نوکر تھا اور نوکر کب سدا مستقل رہتے ہیں۔'' میں نے دل کو تسلّی دی اور زندگی کے معمولات میں جٹ گئی۔ لیکن دو مہینے بعد اچانک وہ آ نکلا۔

''آپ نے مجھے یاد کیا تھا بی بی جی؟'' وہ میرے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ ایک لمحے کو میں نے سوچا۔

''تو کیا واقعی میں نے اسے یاد کیا تھا؟''

''انسان کتنا خود غرض ہے کسی کو یاد کرتا ہے، کسی کو چاہتا ہے تو محض اپنے آرام کی خاطر۔۔۔ اپنی تسکینِ قلب کے لیے۔۔۔ اپنی آسائش کی غرض سے۔''

''میں نے سوچا تم شاید کہیں مر مرا گئے ہو۔'' میں نے اس کے سوالیہ چہرے کا جائزہ لیا۔

''میں آپ کے پاس ہی مروں گا جی۔'' وہ حسبِ عادت ہنستا رہا۔

''بہت باتیں بنانا آ گئی ہیں تجھے؟''

''میری امّاں بھی یہی کہہ رہی تھی جی۔''

''کیا کہہ رہی تھی؟''

''کہہ رہی تھی تو بہت سیانا ہو گیا ہے رے''

''اتنے دن کیوں لگائے تو نے؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے میری منگنی کر دی ہے جی۔''

''منگنی۔۔۔؟ تیری۔۔۔؟؟'' میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''ہاں جی۔۔۔ وہ تو میری شادی کرنا چاہ رہے تھے''

''اس عمر میں۔۔۔ ابھی سے شادی۔۔۔؟ پاگل ہوا ہے؟''

''ہاں جی۔۔۔ اس لیے کہ میری منگیتر جوان ہے۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے۔ احمق۔۔۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''سچی مچی جی۔۔۔ گل بات تو جی میرے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔''

''تجھ سے بڑی ہے وہ لڑکی؟''

''ہاں جی بہت بڑی ہے۔ میری ماسی کے برابر ہے۔''

''ہے کون وہ۔۔۔؟''

''میری بھابی کی بہن ہے۔''

''تجھے کوئی چھوٹی لڑکی نہیں ملتی تھی کیا؟ مجھے سخت غصہ آیا اس کے گھر والوں کی حماقت پر۔ مگر ان کے رسم ورواج تبدیل کرنے والی میں بھلا کون تھی اور میں تو اپنے معاشرے کی بدعتیں اور غلط نظام کو بدلنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ میں بس غصّہ کھا سکتی تھی۔ جھنجھلا سکتی تھی سو وہ کیا۔

''بس جی میری بھابی یہی چاہتی ہے۔'' وہ سر جھکا کر اداسی سے بولا۔

''پھر کی کیوں نہیں تو نے شادی۔'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''پہلے تو گھر والے جھگڑتے رہے میں مانتا نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کرنی ہے شادی ابھی۔'' وہ تفصیل سنانے لگا۔ ''پھر ایک دن میرا بھائی اور بھابی مجھے وہاں لے کر گئے۔ وہ تو جی اتنی بڑی عورت ہے آپ جتنی ہو گی اور بتاؤں جی کیا ہوا پھر؟'' وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔

''ہاں کیا ہو؟'' میں مزید متوجہ ہو گئی۔

''میں اندر کوٹھے میں گیا نا۔ ہماری طرف گھر ایسے نہیں بنتے جی جیسے آپ کے ہاں ہوتے ہیں۔ ہمارے لوگ پتھروں سے ایک کوٹھا چھتتے ہیں پھر اس کے آگے ایک اور چھت لیتے ہیں۔ جیسے آپ کے کمرے کے سامنے برآمدہ ہوتا ہے مگر ہمارے ہاں آگے پیچھے دونوں کمرے ہی ہوتے ہیں۔ میں پہلے والے کمرے میں گیا تو اندر سے وہ نکلی اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کھینچ کر دوسرے اندر لے گئی۔ مجھے بڑا ڈر لگا۔ وہ تو کوئی چڑیل تھی جی۔ خبرے وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی۔۔۔'' وہ سہم کر بولا۔ اس کے چہرے پر بتاتے ہوئے بھی خوف تھا۔

''پھر تو نے کیا کیا۔۔۔؟'' میری دلچسپی اور بڑھی۔

''بس جی اسی رات میں سب کو سوتا چھوڑ کر بھاگ آیا'' وہ فخر سے بولا۔

''نہیں! جب اس نے تجھے اندر گھسیٹا تو کیا کیا تو نے؟'' میں نے بات کا سرا جوڑا۔

''میں نے اس کے جی کھینچ کے چپیڑ ماری اور ہاتھ چھڑا کر بھاگا اور جی دور ندی کنارے جا کر ٹھہرا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ بھی میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہی ہو۔'' بتاتے بتاتے اس کا سانس پھولنے لگا۔

''وہ سچ مچ چڑیل ہے جی۔'' وہ یقین کے ساتھ بولا۔
دوسری چھٹی سے واپسی پر اس نے بتایا کہ زبردستی اس کا نکاح کر دیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا ''اب تو کیا کرے گا؟''
''میں نے رخصت نہیں کرنا جی اس چڑیل کو'' وہ بیزاری سے کہتا رہا۔
دن رات۔۔۔ ہفتو مہینوں اور سالوں میں ڈھلتے گئے۔ اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ اسے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ چولہے ہانڈی کا تمام کام وہ سیکھ چکا تھا اور باقاعدہ خانسامہ رہ سکتا تھا۔ مجھے اس کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا احساس تھا اس کے گھر سے خط آتے تو پیسوں کا تقاضا ہوتا۔ کبھی کوئی بیل مر جاتا اور نیا بیل خریدنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی۔ کبھی کمرے کی چھت گرنے کے سبب پیسوں کا تقاضا ہوتا۔ وہ خط سن کر پریشان ہو جاتا۔ اس کے حقوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور اس کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اسے ایک فیکٹری میں ملازم کروا دیا۔ وہ زیادہ تنخواہ پا کر بہت خوش ہوا۔ ہفتہ بعد وہ گھر آیا اور فیکٹری کی تفصیل سناتا رہا۔ اس کا دل وہاں نہیں لگ رہا تھا۔ پھر مہینہ بھر بعد ہی وہ نوکری چھوڑ کر آ گیا۔ کچھ ہی دن بعد اسے ایک بڑے گھر میں خانسامہ کی جگہ مل گئی اور وہ چلا گیا۔ چند روز بعد ملنے آیا۔۔۔ کہنے لگا:
''وہ جی۔۔۔ بیگم بڑی فضول عورت ہے۔''
''ایں۔۔۔؟ یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' میں اس کے لہجے سے چونکی۔
''ہاں جی سچ کہہ رہا ہوں۔ کھا کھا کے موٹی ہوئی پڑی ہے۔ چار نوکر رکھے ہوئے ہیں۔''
''گھر کے لوگ زیادہ ہوں گے نا'' میں نے سمجھانا چاہا۔
''نہیں جی۔۔۔ صرف چار بچے ہیں اور دو وہ خود میاں بیوی۔ اور چار نوکر'' وہ ہنسا۔
''کیا کیا کام کرتے ہیں اتنے نوکر؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
''پتہ ہے جی وہ بیگم صاحب کیا کرتی ہے؟'' وہ اپنی دھن میں بولتا رہا۔
''کولہوں پر ہاتھ رکھے بس نوکر کو حکم دیتی رہتی ہے یا سوتی رہتی ہے۔ تبھی تو موٹی ہوئی پڑی ہے۔''
''تم سب کیا کیا کام کرتے ہو؟'' میں نے پھر پوچھا۔
''صبح اُٹھ کر ایک نوکر چائے بناتا ہے، دوسرا بستر اٹھاتا ہے، تیسرا کپڑے استری کرتا ہے۔۔۔ اور چوتھا میں۔۔۔'' وہ تفصیل بتانے لگا۔
''ویسے تو جی آرام بھی بڑا ہے۔ ہمارا کمرہ چھت پر ہے اور کمرے میں گھنٹی لگی ہوئی ہے جی۔ غسلخانہ، عیش فسٹ کلاس، منجیا بستر۔۔۔ بس جب صاحب کو یا بیگم کو ضرورت ہوتی ہے تو گھنٹی بجتی ہے اور چاروں میں سے ایک نیچے چلا جاتا ہے۔ صبح کو بھی گھنٹی سے ہم اٹھتے ہیں۔''
''اچھا۔۔۔! تو تیرا دل لگ گیا وہاں؟''
''نہیں جی۔ میرا دل نہیں لگا۔ مجھے آپ لوگ یاد آتے ہیں۔ میں نوکری چھوڑ آیا ہوں۔''
''ہیں؟'' اس انکشاف سے میرے ہاتھ سے نٹنگ چھوٹ گئی۔
''ایسی بدمزاج عورت کے ساتھ میں نہیں رہ سکتا جی۔'' وہ اطمینان سے بولا۔
''پاگل ہے بھئی تو بھی''
پھر اس کا معمول بن گیا۔ مہینہ دو مہینہ نوکری کرتا اور پھر چھوڑ کر بھاگ آتا۔ ایک بار وہ سال بعد آیا۔ آتے ہی کہنے لگا:
''بی بی جی آپ سے ایک بات کرنا ہے۔''
''کہو''
''آپ میری شادی کر دیں جی۔'' وہ بولا۔
''مگر تیرا تو نکاح ہو چکا ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
''میں نے اسے طلاق دے دی ہے جی'' وہ اطمینان سے بولا۔
''پھر۔۔۔؟''
''ایک لڑکی ہے جی۔۔۔'' وہ ذرا شرما سا گیا۔
''پسند ہے تجھے؟''
''ہاں جی۔۔۔'' اس نے منہ پھیر کر کہا۔
''وہ کرے گی تجھ سے شادی؟''
''ہاں جی۔ وہ تیار ہے۔ وہ تو کہتی ہے مجھے دوڑا لے جا''
''دوڑا لینا پھر۔ یہ تو بہت آسان کام ہے'' میں نے اسے چھیڑا۔
''نہیں جی۔ ایسے کام ٹھیک نہیں ہوتے۔'' وہ بڑے ناصحانہ انداز میں بولا۔
''تو کیا اس کے گھر والے مان لیں گے؟''
''اسی لیے تو آپ سے کہہ رہا ہوں جی۔ آپ اس کے گھر چلیں نا''
''اچھا چلوں گی'' میں نے بجھے دل سے وعدہ کر لیا۔
حسبِ معمول وہ پھر لمبے عرصے تک غائب رہا۔ ہم کسی وقت بھی اس کی آمد کی توقع کر سکتے تھے۔ میرا گھر گویا اس کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اِدھر اُدھر پھر کر جب ضرورت ہوتی وہ بے تکلفی سے چلا آتا۔ پندرہ بیس دن یا مہینہ دو مہینے ٹکتا اور پھر کسی طرف کو نکل جاتا۔ شاید ایک جگہ رہتے رہتے اس کا دل بھر جاتا تھا۔ کہتا تو وہ یہ تھا کہ پیسے زیادہ چاہئیں۔ تنخواہ بڑی ہو مگر میں نے اس کے پاس کبھی پیسہ نہیں دیکھا۔ دو چار روپے جو اس کی جیب میں کبھی ہوئے وہ بچوں کو مونگ پھلیاں، ٹافیاں لا کر کھلا دیتا پھر سارا وقت مجھ سے پیسے مانگ مانگ کر سگریٹ پیتا۔ کپڑے میلے ہو جاتے تو گھر ہی میں سے ایک پرانا جوڑا مانگ کر پہن لیتا۔ اپنے میلے کپڑے دھونا اس کے مسلک میں نہیں تھا۔ ہمیشہ اپنے اترے ہوئے کپڑوں کو کسی کونے کھدرے میں چھپا دیتا۔ صفائی کے دوران کبھی جب وہ بدحال بدرنگ کپڑے نکلتے تو انہیں پھینکتے ہی بنتی۔ جب تک رہتا مجھے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے

دیتااور جب من اٹھ جاتا لحہ بھر میں واپسی کا اعلان کر دیتا۔ میں اس کی عادت سے اچھی طرح واقف تھی۔ جیسے اپنے گھر کے باقی لوگوں کی عادت سے تھی۔ جب وہ جانا چاہتا میں کبھی نہ روکتی۔ میں اگر روکنا چاہتی بھی تو وہ رک نہیں سکتا تھا۔ یہ میں جانتی تھی پھر بھلا کہنے سے کیا فائدہ۔ اس دفعہ وہ کئی برس تک نہیں آیا۔ میں نے گھر بدلا، علاقہ بدلا اور دوسری جگہ چلی آئی۔ اس کا خیال کبھی کبھی آتا ضرور مگر اس سے ملنے کی اب کوئی توقع نہیں تھی۔ ہم سب مل کر اکثر اس کا ذکر کرتے مگر یوں لگتا کہ اب وہ حکایتِ پارینہ بن چکا ہے۔ وہ ماضی کی ان تہوں میں چھپ چکا ہے جن کے پرت یادوں میں تو الٹے جاسکتے ہیں، انہیں مجسم نہیں کیا جاسکتا۔ گویا وہ ماضی کا ایک واقعہ بن چکا تھا ایسی یاد تھی جو اور بہت سی یادوں کے ساتھ ذہن کے تہہ خانے میں محفوظ تھا، مقفل تھا۔ اس سے ملنے یا اسے دیکھنے کا تصور بھی اب بظاہر ممکن نہیں تھا مگر ایک روز میں حیرت زدہ رہ گئی۔

وہ شروع اکتوبر کے دن تھے۔۔۔ صبح اٹھ کر موسم بدلا بدلا لگتا۔ ہلکی ہلکی خنکی اور غیر محسوس طور پر بہتی ہوا، بھولے بسرے قصے دوہرا کر دل کو عجیب طرح کے دکھ سے بھر رہی تھی۔ میں نے نٹنگ کی ٹوکری اٹھائی اور کھٹوں کی باڑھ کے سائے میں کرسی ڈال کر آ بیٹھی۔ باڑھ کے ہرے پتوں میں چھپی چڑیوں کی چوں چوں، پھولوں پر بیٹھتی، رس پیتی رنگ برنگی تتلیاں مجھے کچھ اور بھی مغموم کرنے لگیں۔ عاشق کے گریبان تو بہار کے موسم میں چاک ہوتے ہیں مجھے ہر بدلتا موسم ایسا کرنے کا اکساتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا اور میرا دل گزری یادوں کی گرفت میں تھا کہ وہ ہانپتا کانپتا اچانک میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''ارے صادق تو زندہ ہے؟'' میں خوشی سے بے قابو ہوگئی۔

''ہاں جی۔۔۔ تو کیا آپ سمجھ رہی ہیں یہ میری روح ہے جی'' وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسے جارہا تھا اور فورِ جذبات سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔

''گھر کیسے ملا تجھے؟''

''جی میں ادھر گیا تھا۔ پہلے والے گھر۔۔۔ پھر ان سے پوچھتا پاچھتا۔۔'' وہ میرا گھر کھوجنے کے حوالے بتا رہا تھا۔

''تونے شادی تو کر لی ہوگی۔۔۔ بچّے وچّے۔۔۔؟'' اس کے گھر کی خیریت پوچھنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''شادی ہی نہیں ہوئی تو بچے کہاں سے ہوں گے جی؟'' وہ لاپروائی سے ہنسا۔

''کیوں۔۔۔ کیوں بھئی؟''

''ملی ہی نہیں نا کوئی؟''

''اور وہ لڑکی۔۔؟ جس کے پاس تو مجھے لے جانا چاہتا تھا؟''

''وہ۔۔۔ وہ مرگئی جی''

''ارے۔۔۔ کیسے؟'' مجھے واقعی صدمہ ہوا۔

''سانپ نے وڈلیا تھا'' وہ غیر جذباتی لہجے میں بولا۔

''تجھے افسوس نہیں ہوا۔۔۔؟'' ٹھہر ٹھہر کر میں نے پوچھا۔

''لو بھلا کیوں نہیں ہوا جی۔''

''پھر۔۔۔!''

''پھر کیا کرتا''

''اب کیا کر رہا ہے؟'' کافی دیر چپ رہنے کے بعد میں نے موضوع بدلا۔ اس مرنے والی کے ذکر سے وہ رنجیدہ سا لگا۔

''پتہ ہے بی بی جی میں پکڑا گیا تھا'' وہ خوش دلی سے بتانے لگا۔

اس کی ازلی لاپرواہی خوشی لوٹ آئی تھی۔

''کیا مطلب۔۔۔؟'' مجھے تعجب ہوا۔ اس جیسا ایماندار آدمی بھی کسی جرم کا مرتکب ہوسکتا ہے بھلا۔

''پتہ ہے جی کیا ہوا تھا؟''

''ہوں۔۔۔؟''

''ہم کچھ لڑکوں نے گورنمنٹ کے درخت کاٹ کر بیچ لئے۔ کئی دفعہ کاٹے پھر انہیں نا۔۔۔ جنگل والوں کو شک پڑ گیا اور ہم موقع پر ہی پکڑے گئے میں چھ مہینے اندر رہا۔''

''پھر۔۔۔؟ کیسے چھٹا۔۔۔؟''

''بس پھر انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ سزا پوری ہوگئی تھی۔''

''اب کیا کر رہا ہے؟''

''آج کل تو بیکار ہوں جی۔''

اس کی سیلانی طبیعت کے پیشِ نظر میں نے اس کے معاملات میں مداخلت مناسب نہ سمجھی۔ میں کوشش کر کے اسے کام دلوا بھی دیتی مگر بے سود تھا۔ کسی ایک جگہ ٹکنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ میں جانتی تھی وہ ایڈونچر پسند تھا۔ اسے نئے نئے کام کرنے، جان جوکھوں میں ڈالنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ وہ فطرتاً برا نہیں تھا مگر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں اسے مزا ملتا تھا۔ اس کا ذہن تخریبی نہیں تھا لیکن تخریب خود بخود اس سے سرزد ہو جاتی تھی۔ اسے تخریب اور تعمیر کا فرق معلوم نہ تھا اور یہ فرق تو اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو معلوم نہیں ہوتا۔۔۔ وہ تو جاہل تھا۔۔۔ ان پڑھ۔۔۔ نرا دیہاتی۔۔۔ اور آج صبح کے اخبار میں وہ خبر پڑھ کر میں اس کی منتظر ہوں۔ جب رات کی تاریکی پھیل چکی ہوگی یا اگلی صبح کی پو پھٹ رہی ہوگی تو میرے دروازے پر دستک ہوگی۔ کوئی اٹھ کر دروازہ کھول دے گا اور وہ سامنے کھڑا مسکرا رہا ہوگا۔

''پتہ ہے بی بی جی میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے جی''

وہ اپنے مخصوص انداز میں میرے پیر چھو کر بتائے گا مگر میں اسے کچھ نہ کہہ سکوں گی کیونکہ میں جانتی ہوں میرا کچھ کہنا، کوئی نصیحت کرنا بیکار ہوگا۔۔۔ قطعی بے سود۔۔۔ بے فائدہ۔۔۔ کہ اس کا دل ایسا کھلنڈرا ہے جہاں سے نوادرات نہیں نکلا کرتے۔

- ناول کا باب -

''مسافتوں کی تھکن''

عذرااصغر

بعض رشتوں اور تعلقات کے سرے حیرت انگیز طور پر جڑ جاتے ہیں اور اب یہ بات کس قدر تعجب خیز تھی کہ فرجاد کے والد احمد کریم رخشندہ کے خاندانی نکلے۔ بیشک عزیز داری زیادہ قریبی نہ تھی مگر تھی تو سہی اور انیس احمد کے انتقال کے بعد ملنا جلنا بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ یوں بھی احمد کریم ایک طویل عرصہ یورپ میں رہنے کے سبب خاندان سے کٹے رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ رخشندہ ان کے نام اور رشتے سے قطعی لاعلم تھیں۔ مگر جب وہ یعنی احمد کریم اپنی بہو رخشندہ سے ملے اور ان کے خاندان کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ ان کے بیٹے نے ایک کام تو بہت ہی نیک اور اچھا کیا ہے۔ اور انہیں بہت آسودگی اور طمانیت کا احساس ہوا کہ جو غلطی برسوں پہلے انہوں نے جوانی کے جذبات کی لہر میں بہہ کر ایک غیر ملکی لڑکی سے شادی کر کے کی تھی اب ان کے بیٹے نے اس غلطی کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ اور رخشندہ کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ایک ملازم کے ساتھ اکیلے رہ رہے تھے۔ بیوی انہیں چھوڑ گئی تھی اور بیٹے کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اپنی تنہائیوں سے لڑتے ہوئے اس گلٹ Guilt یا ندامت میں بھی مبتلا تھے کہ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا اور اس کو باعزت اور بہترین زندگی اسی عورت کے توسط سے ملی تھی جس نے ان کے ساتھ بیوفائی کی تھی اور رخشندہ نے ان سے کہا تھا ''ابّا آپ کو ہمارے ساتھ چل کر رہنا ہوگا۔ میں آپ کو یہاں اکیلا نہیں رہنے دوں گی۔''

اور انہوں نے رخشندہ کی بات سے خوش ہو کر بڑے لاڈ سے کہا۔

''یہ نالائق تو مجھے ڈیڈی کہتا ہے۔ انگریز ماں کی اولاد ہے نا۔ اور تم نے مجھے ابّا کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ خالصتاً مشرقی انداز میں اور اب مجھے ایک بیٹی بھی مل گئی ہے۔ میں ضرور تم لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔''

اور یہ سب انہوں نے اس سفر کے دوران سوچا جو وہ شمال کی سمت کرتی تھیں اور یہ تجویز اور خواہش بھی انہی کی تھی کہ پاکستان کے شمالی علاقوں کا سفر زمینی راستے سے کیا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں اور بہت سے شہر دیکھتے جائیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اسلام سے گاڑی کرایہ پر لے لی اور بھور سمے سفر پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ٹیکسلا کو انہوں نے صبح کے دھندلکے میں سرسری طور پر دیکھا۔ اونچے گھنیرے پیڑوں سے گھری میوزیم کی عمارت نیم روشنی میں خاموش کھڑی تھی اور عمارت کے اندر چبوترے پر بیٹھا بدھا گیان دھیان میں مصروف تھا اور اپنے عقیدت مندوں کا منتظر۔ اور وہ بدھا سے ملے بغیر گزرتے چلے جاتے تھے۔ ناشتے کے لیے وہ ہری پور میں سڑک کے کنارے بنے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں قیام پذیر ہوئے۔ ہری پور کی صبح انگڑائیاں لیتی بیدار ہوتی تھی اور سڑک کے کنارے کھڑے پاپولر کے درخت نیم مستی کی حالت میں جھومتے تھے اور سورج کی اوّلین کرنیں ان کی پھنگوں کو جگمگاتی تھیں ان کا دوپہر کا پڑاؤ مانسہرہ میں تھا جہاں ایک کچے پکے ڈھابے ٹائپ ہوٹل میں ڈھچر پچر میز کے گرد بیٹھ کر لنچ کرتے تھے اور خود کو مکمل ٹورسٹ محسوس کرتے تھے۔ شام کے سائے گہرے ہونے سے پہلے وہ خود کو بالاکوٹ کے خوابناک شہر میں پاتے تھے۔ بالاکوٹ بلند پہاڑوں گھری وادی میں دو دریاؤں کے اوپر بنے ہوٹل میں بیٹھے دریا کا شور سنتے تھے اور پانی کا شور ان کے کانوں میں جلترنگ بجاتا تھا اور سامنے اوپر جاتی نہایت بل کھاتی ہوئی سڑک ان کے دلوں میں تجسس اور انجانہ خوف پیدا کرتی تھی۔ اگلی صبح انہیں اسی راستے پر روانہ ہونا تھا اور اب رات کی تاریکی میں آتی گاڑیوں کی روشنیاں چمکتی تھیں اور نیچے اتر آتی تھیں سڑک کے خم انہیں چھپاتے تھے اور پھر ظاہر کرتے تھے۔ شام کی خنکی بڑھی اور تاریکی گہری ہوئی تو وہ اٹھ کر اندر آ گئے اور وہ ہوٹل کے گرم بستر کمبل کے اندر لپٹی اب تک کی گزری باتیں یاد کرتی تھیں۔

فرجاد کریم سے اپنی وابستگی خود انہیں ایک ناقابلِ یقین حقیقت لگتی تھی اور وہ قدرت کے اس کرم پر حیران ہوتی تھیں اور اس شادی کے وقت وہ کتنی خائف تھیں مگر اب وہ محسوس کرتی تھیں کہ فرجاد سے شادی نے ان کے وقار میں اضافہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کو اعتماد بھی بخشا تھا اور شبّر بھائی تو یوں ان کی پذیرائی میں مصروف تھے کہ وہ خود میں شرمندہ ہوتی تھیں اور حیرت سے سوچتی تھیں۔ ''یہ وہ شبّر بھائی ہیں جو امّی بابا کے بعد ان سے زیادہ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور اب؟ نوری بھابی میرے سامنے کیسے بچھی جاتی ہیں اور بڑھ بڑھ کر خاطر داری میں لگی ہوئی۔''

رخشندہ فرجاد۔۔۔ ایک نئی حیثیت میں بھائی کے گھر آئی تھیں اور بھائی، بھابی اور ان کے بچوں کے لیے قیمتی تحفے لائی تھیں۔ بھابی کو تو انہوں نے ہیرے جڑا سونے کا سیٹ بھی دیا تھا جسے دیکھ کر چند لمحوں تک تو نوری کچھ بول ہی نہیں سکی تھیں۔ خوشی ان کے چہرے سے مترشح تھی اور جیسے بمشکل انہوں نے کہا تھا:

''رخشندہ یہ تو بہت قیمتی سیٹ ہے؟''

''بھابی آپ بھی تو بہت قیمتی ہیں۔ کم از کم میرے لیے۔'' مگر دل میں انہوں نے سوچا تھا۔

''بھابی! آپ کی محبت مجھ سے نہیں میرے اسٹیٹس سے ہے'' اور اس احساس نے ان کی محبت اور خلوص کو سینے پہ دھری کسی انجانی پتھر کی سل تلے کچل کے رکھ دیا تھا اور ان کا دل افسردگی سے بوجھل ہو گیا تھا اور اب بالاکوٹ کی خوشگوار رات کی ٹھنڈک اونی کمبل کے اندر لیٹی وہ سب گزری باتیں یاد کرتی تھیں۔

پہاڑوں پر اندھیرے کے سائے بدستور گہرے تھے مگر ان کی اونچی

چوٹیاں طلوعِ سحر کے نور سے روشن ہو رہی تھیں اور صبح کے دھندلے اجالے میں ان کی گاڑی بالاکوٹ سے اوپر جانے والی سڑک پر رواں تھی۔ موڑ کاٹتے ہوئے انہوں نے گاڑی کے شیشے سے نیچے دیکھا۔ وہ ہوٹل جہاں انہوں نے رات قیام کیا تھا ایک چھوٹے سے گھروندے کی مانند دکھتا تھا۔ گاڑی نے ایک اور موڑ کاٹا اور سارا منظر بدل گیا۔ نیچے بہت گہرائی میں دریا بہتا تھا جو اتنی بلندی سے ایک پتلی سی چمکدار لکیر کی مانند نظر آتا تھا۔ دوسری طرف فلک بوس پہاڑی سلسلہ تھا۔ ایک کے بعد ایک رنگ بدلتے پتھر اور سبزہ۔۔۔ کہیں کہیں گہرا سبزہ، کہیں ہلکا اور کہیں ڈھلوانوں پر کھلے رنگ برنگے پھول۔۔۔ انہوں نے بہت نیچے کھائی سے پہاڑ کی آخری چوٹی کو دیکھا جو دریا کے اس پار تھی اور وہ پہاڑ کی ہیبت سے لرز کے رہ گئیں۔

''اور ہم نے پہاڑوں کو زمین میں میخوں کی طرح گاڑ دیا کہ وہ حرکت نہ کر سکے۔'' قرآنی آیت ان کے کانوں میں گونجی۔

بڑا سی کا گھنا پیچ در پیچ جنگل، جس کی خاموشی دلوں میں گونجتی تھی اور جس کا سناٹا انسان کے اندر ایک لطیف خوف کو جنم دیتا تھا اور یہ ایک مختلف سفری تجربہ تھا جو اب تک کے تمام سفر پر حاوی تھا اور اس جنگل کو عبور کر کے وہ بالاکوٹ پہنچے تھے اور اب کوائی سے آگے بڑھ آئے تھے یہاں سڑک کے ساتھ بہتا دریائے کنہار گہری کھائیوں سے نکل کر سطحِ زمین پر آ گیا تھا۔ انہوں نے گاڑی رکوائی اور دریا کے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ پیر اور منہ دھویا اور انہیں ایک فرحت انگیز سکون کا احساس ہوا پھر انہوں نے دریا کے کنارے سے چمکدار اور رنگین پتھر چُنے جو چاندی کی مانند چمکتے تھے اور ان کے رنگ حیرت میں مبتلا کرتے تھے۔ رخشندہ پتھروں پر پیر رکھتی ہوئی دریا کے اندر تک گئیں۔ دریا کا پاٹ یہاں پر چوڑا تھا اور بیچ دھارا تیز تھا۔ فرجاد نے چلا کر کہا۔

''رخشی زیادہ دور نہ جانا آگے پانی کا بہاؤ تیز ہے۔''

''جناب کسی وقت بھی زیادہ اور تیز پانی آ سکتا ہے'' ڈرائیور نے کہا۔ وہ واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے ہاتھوں میں بھرے پتھر سیٹ کے نیچے رکھ دئے اور بولیں۔

''فرجاد آپ نے دیکھا کیسے خوبصورت پتھر ہیں؟''

دن ڈھلتے سے وہ کاغان پہنچ چکے تھے اور ان کی گاڑی پتھریلی سڑک پر ٹھہر ٹھہر کر چلتی آگے بڑھتی جاتی تھی اور ان کے سامنے دائیں ہاتھ کے بلند پہاڑوں سے گلیشئر اترتا تھا اور کنہار میں جا ملتا تھا وہ مبہوت ہو کر یہ منظر دیکھا کیں اور پھر اس گلیشئر پر آہستہ آہستہ چلتی کار گلیشئر کو پار کر کے ناران تک جا پہنچی۔ ترائی میں کھیتوں میں اور رنگ کے خوشنما پھول کھلے تھے۔ آلو کی فصل تیاری کے قریب تھی اور سورج کسی شرمیلی دوشیزہ کی طرح ہلکی سرمئی چادر میں چہرہ چھپائے مسکراتا ہوا اپنے سیاحوں کو خوش آمدید کہتا تھا۔ ہوا خنک اور خوشگوار تھی اور ان کے سامنے کنہار دور تک بہتا وسیع علاقے کو سیراب کرتا تھا۔

ناران سے جھیل سیف الملوک تک کا راستہ گلیشئرز پر سے ہی گزرتا تھا اور ٹھنڈک ان کے اندر ہڈیوں کے گودے کو منجمد کرتی تھی۔ جھیل سے کئی فرلانگ پہلے پیدل چل کر وہ جھیل تک پہنچے اور بعض سیاح یہ رستہ گدھوں اور خچروں پر بیٹھ کر عبور کرتے تھے۔ سربلند پہاڑوں کے پیالے میں جھیل کا پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہلکورے لیتا تھا اور ملکہ کوہسار سے اترتا گلیشئر جھیل جھیل سے ہم آغوش ہوتا تھا۔ داستان گو شہزادہ سیف الملوک اور پری بدالجمال کی رومانی داستان سنا کر سیاحوں کو محظوظ کرتے اور روزی کماتے تھے۔ شام سے پہلے پہلے وہ واپس پلٹے اور ناران کے گردونواح کی سیر سے لطف اندوز ہوتے اگلے روز لالہ زار تک پہنچے۔ ان کی گزرگاہ ناہموار اور پگڈنڈی جیسی پتلی تھی۔ جس پر ان کی جیپ محتاط انداز میں رواں تھی۔ سڑک کے ساتھ جگہ جگہ پہاڑوں سے آبشار گرتے تھے اور وہ ان کی پوہار میں بھیگتے جاتے تھے۔ کنہار بہت نیچے نشیب میں پتلی سی ندی کی مانند دکھتا تھا اور پھول ان کا خیر مقدم کرتے تھے اور ہوا اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ ان کے قدم چومتی تھی۔

جھیل لولوسر اپنی کہانیوں میں رنگ بھرتی تھی اور اپنا دیدار کرنے والوں کو لبھاتی تھی۔ جھیل کا پانی اپنی رنگت اپنا روپ لحظہ لحظہ بدلتا تھا۔ کبھی سرخ کبھی نیلگوں کبھی سیاہ اور سبز۔ ایسا کہ آنکھیں خیرہ کر دے اور حیرتوں سے انسان کو گنگ کر دے اور اس جھیل لولوسر پر پریاں جھمگھٹے کی شکل بنائے آتیں اور ان کے انتظار میں سیاح ٹھہرے رہتے مگر پریاں شاید انسان سے زیادہ چالاک و ہشیار تھیں کہ سیاحوں کو منتظر رکھتیں اور جھلک بھی نہ دکھاتیں۔ ذرّہ بابوسر سے ہوتے ہوئے وہ چلاس تک آئے تھے اور سکردو کی ناہموار سڑک پر مڑ گئے تھے۔ فرجاد نے گلگت چلنے کو کہا تھا مگر رخشندہ کو شاپنگ سے دلچسپی نہیں تھی انہیں سکردو دیکھنے کا اشتیاق تھا جس کے بارے میں انہوں نے اکثر سفرناموں میں پڑھا تھا اور جب وہ سکردو پہنچے تو پہاڑوں پر رات اتر آئی تھی اور شہر خاموش اور اداس تھا۔ شفاف آسمان پر ستارے چمکتے تھے اور بلند پہاڑوں کی چوٹیاں پورے شہر کو اپنی بانہوں میں سمیٹے سیاہ چادر میں لپٹی کھڑی تھیں۔ ہوٹل کے کمرے سیاحوں سے بھرے تھے۔ انہیں بالآخر سرائے علمدار میں کمرہ خالی مل گیا۔ رخشندہ کو سخت بھوک لگی تھی مگر ان کے اٹینڈنٹ علی نے کھانے کے لیے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''سر ہمارے ہاں کھانا آرڈر پر تیار ہوتا ہے اس میں گھنٹہ آدھا گھنٹہ تو صرف ہوگا کہیے تو چائے حاضر کیے دیتا ہوں۔''

''تو بھائی ایسا کرو آملیٹ اور سلائس ہمیں چائے کے ساتھ سرو کر دو بھوکے ہیں اور نیند بھی آ رہی ہے۔ لمبے سفر سے تھکے آ رہے ہیں۔''

علی کے جانے کے بعد انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دو سنگل بیڈ صاف ستھرے تھے اور ان پر دھلی ہوئی بچھا دریں بچھی تھیں۔ کمرہ کشادہ اور ہوادار تھا جس کے بڑے بڑے دریچے باہر کی سمت لان میں کھلتے تھے اور جن کے ذریعے لان میں کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو اندر تک آتی تھی۔ رخشندہ نے ضروری

چیزیں سوٹ کیس سے نکال کر الماری میں رکھ دیں اور نائٹ سوٹ نکال کر فرجاد سے بولیں۔

''اتنے میں چائے آئے آپ نہا کر کپڑے بدل لیں پھر میں نہاتی ہوں۔'' دو ہفتے کے قیام میں سارا دن وہ باہر رہتے۔قریہ قریہ گھومتے اور رات کو آ کر کمرے میں سو رہتے۔رات کا کھانا علی کو پکوانے کے لیے کہہ جاتے اور دن میں جو ملتا جہاں ملتا کھا پی لیتے۔سکردو کے لغوی معنی جانے کیا تھے اور یہ کس زبان کا لفظ تھا مگر انہیں لگتا کہ کشمیری یا کسی زبان میں سکردو کے معنی یقیناً جنت کے ہی ہوں گے۔ یہاں قدم قدم پر حیران کن مناظر تھے۔صد پارہ جھیل تھی اور اس کے اوپر بل کھاتی سڑک تھی وہ سیاحوں کو دیوسائی لے کر جاتی تھی اور دیوسائی کا طلسم انسان کو سحر زدہ کرتا تھا۔یہ ایک عجیب و غریب سرزمین تھی جہاں دور دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ویلی میں بہتے بل کھاتے دریا تھے اور یہ جگہ دنیا کی چھت تھی۔میلوں میں پھیلا ایسا صحرا جس کی زمین پر رنگ برنگے پھول ایسے بچھے تھے جیسے شہروں میں لوگ اپنے گھروں کے لان میں گھاس اُگاتے ہیں مگر ان پھولوں کو اُگانے والا کوئی انسانی ہاتھ نہیں تھا۔یہ قدرت کا انمول اور حیران کن عطیہ تھا اور زمین پر بچھے یہ پھول ان سے ہمکلام ہوتے تھے۔فضائیں گیت گاتی تھیں اور ارد گرد ایستادہ برف پوش پہاڑ اس زمین کے مقابل گنگ کھڑے حیرت سے تکتے تھے۔

''اوفو! فرجاد اس قدر پھول؟'' حیرت سے وہ چیخیں تھیں۔

''یہاں تو زمین پر قدم رکھتے ڈر لگتا ہے''

''کیوں بھئی؟''

''اس لیے کہ پھول پیروں میں آتے ہیں اتنے نازک اور حسین پھول روندے نہ جائیں۔'' وہ پنجوں کے بل بچ بچ کے چلتی تھیں۔''بھلا قدرت کی اس صناعی پر میں رو نہ پڑوں تو کیا کروں؟'' انہوں نے روہانسی ہو کر فرجاد سے کہا۔

''ارے بابا مناظرِ قدرت خوش ہونے کے لیے ہوتے ہیں رونے کے لیے نہیں۔'' فرجاد ناصحانہ انداز میں بولے۔

''مگر ہم کتنے غافل لوگ ہیں فرجاد۔۔۔قدرت نے ہمیں کیا کچھ عطا کیا ہے مگر ہم اپنے ملک پر دوسرے ممالک کو ترجیح دیتے ہیں۔میں تو قدرت کی اس فیاضی پر مبہوت ہو رہی ہوں۔دیکھو! یہاں نہ مالی ہے نہ کھاد۔اور کوئی دیکھ بھال کرنے والا انسان بھی نہیں۔لیکن قدرت نے کس فیاضی سے پھول اگائے ہیں اور یہ پھول ایسے ہیں جو انسانی ہاتھوں کی لذت اور رہنمائی سے ناآشنا ہیں۔یہ کھلتے ہیں، اُگتے ہیں، مرجھاتے ہیں اور پھر کھلتے ہیں اور پوری وادی کو اپنی انجانی خوش بو سے مہکاتے ہیں۔بھلا اس خوشبو کو ہم کسی جانی پہچانی خوشبو سے تشبیہہ دے سکتے ہیں؟ یہ خوشبو نہ چنبلی جیسی ہے نہ موتیا اور گلاب جیسی۔یہ ایک انوکھی خوشبو ہے۔یہ مہک مسامِ جاں میں اترتی ہے اور انسان کو عجیب کیف دیتی ہے اور یہ دریا جو اس قطع زمین پر بغیر کسی رکاوٹ کے بہتا ہے مگر اپنے کناروں سے باہر نہیں آتا اور اس میں پڑے بڑے چھوٹے پتھر دھلے دھلائے سکون سے پڑے ہیں اور ان پر سے مسافروں، سیاحوں سے بھری جیپیں گزرتی ہیں اور سیاح پیدل انہیں پار کرتے ہیں۔ان کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہے اور جب سورج کی کرنیں برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں پر قوس قزح کے نارنجی، سبز، پیلے، دھانی رنگ بن کر اترنے لگیں تو وہ دونوں اور جیپ کا ڈرائیور واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ویلی ویسے ہی صبح کی طرح سنسان اور خاموش تھی مگر سڑک پر آگے پیچھے موڑ کاٹتی جیپیں دوڑتی تھیں۔سنبھل سنبھل کر چلتی تھیں۔نیچے کھائیاں تھیں اور ان کے اوپر پہاڑ بلند ہوتے جاتے تھے۔صبحدم میلوں میں پھیلی ویلی پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکتے سورج کی روشنی میں چمکتی تھی اور دلوں میں گدگداہٹ پیدا کرتی تھی اور بھرپور کھلکھلاہٹوں کے ساتھ اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہتی تھی اور اب دمِ رخصت جانے والوں کے اداسی سے بوسے لیتی تھی۔بھیگی ہوا ان کے گالوں کو تھپتھپاتی تھی۔

وہ کمرے میں پہنچے تو علی الہ دین کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

''سر چائے یا۔۔۔؟''

''ہاں علی۔۔۔گرما گرم چائے۔۔۔جلدی سے''

''سر آج آپ کے لیے میں نے سموسے لا کر رکھے ہوئے ہیں۔''

وہ خوش دلی سے بولا۔

''پنجاب سے آنے والے سموسے بہت پسند کرتے ہیں۔''

''ارے واہ! یہ تو تم نے بہت اچھا کیا مگر علی ہم لاہور سے نہیں لندن سے آئے ہیں۔'' فرجاد نے کہا۔

''اوہ سر۔۔۔آپ تو فارنر ہوئے نا؟''

''نہیں بھائی ہم پاکستانی ہیں۔میری بیگم تو کراچی میں پیدا ہوئی تھیں میں البتہ لندن میں پیدا ہو گیا تھا۔مگر ہم دونوں پاکستانی ہیں۔''

''لیکن سر آپ کا رنگ روپ تو یورپ والوں سے ملتا ہے۔میں پہلے ہی سوچتا تھا''

''بھائی پیدا ہونے کی وہاں جو غلطی ہو گئی نا۔'' فرجاد نے ایسے کہا کہ علی بے اختیار ہنس پڑا۔

''سر میں چائے لے کر آتا ہوں۔'' کہتا ہوا علی چلا گیا۔

اور وہ جو سکردو آٹھ دس دنوں کے پروگرام پر آئے تھے۔دو ہفتے گزار کر جانے کی تیاری کرتے تھے۔انہوں نے سکردو اور اس کے گرد و نواح کے سب علاقے کھنگال ڈالے تھے اور رخشندہ جو دنیا کے حسین ترین جزائر کی سیر سے لوٹی تھیں اور انہوں نے پانی پر آباد شہر وینس بھی دیکھا تھا۔جہاں کشتیوں میں زندگی آباد تھی۔کشتیوں اور چھوٹے جہازوں میں بازار لگتے تھے۔پانی کی گلیاں اور پانی کی ہی سڑکیں لیکن شمالی علاقے کی دید نے تمام جگہوں کو ان کی نظروں

میں ہیچ کرڈالا تھا۔فرجاد کہتا تھا:

''تم متعصب ہورہی ہورخشی'' اوران کا کہنا تھا۔

''جن جگہوں پرہم گئے ہیں فرجادان کوانسانوں نے سجایااورسنوارا ہے۔انسانی کاوشوں نے ان کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔بلاشبہ وہ سب علاقے قدرت کی صناعی کے اعلیٰ ترین شاہکار ہیں مگر پھربھی میں کہوں گی کہ ان سب جگہوں کوانسانی عقل اور پیسے نے قابلِ دید بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے جبکہ خطّہ۔۔۔اب تک صرف قدرت کی صناعی کے تابع ہے مکمل طور پراور اگر ہماری حکومت توجہ دے اور اخلاص کا ثبوت دے تو ہم سیاحت کے ذریعے بے حد زرِمبادلہ کما سکتے ہیں مگرافسوس تو یہ ہے کہ ہم بنیادی طور پرخودغرض،لالچی اور مفاد پرست قوم ہیں۔ہم اپنی ناک کے آگے کچھ نہیں دیکھتے۔فرجاداللہ تعالیٰ نے اس خطے کوبہشت کانمونہ بنایا ہے۔کتنا زرخیز ہے یہ علاقہ۔یہاں سڑکوں پرپھل دار پیڑ ایسےاور بہتات سے کھڑے ہیں کہ ہمارے ہاں اس طرح نیم اور ببول بھی نہیں اُگتے۔ہم نے شنگریلہ میں سیاہ شہتوت دیکھے تھے؟ کیسے رسیلےاور میٹھے تھے۔ذرا سی دیر رکھے رہے توشربت بن گئے تھےاور بلیک چیری۔۔۔خوبانیاں۔۔۔جن کے درخت سڑکوں کے کنارے ایستادہ ہیں۔سایہ بھی دیتے ہیں اور مسافروں کو کام ودہن کی لذّت بھی۔فرجاد! پہلے میں نے سوچا تھا کہ یہ لوگ ان پھلوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے؟ مگر پھر میں نے محسوس کیا کہ پھل جو درختوں سے اترتے ہی پانی بن کر بہنے لگتے ہیں ان کوکہیں بھیجا نہیں جا سکتا۔البتہ یہاں کی خشک خوبانیاں ہم اپنے ہاں کھاتے ہیں۔جو یہاں کےلوگ وافر مقدار میں جھڑی ہوئی خوبانیاں خشک کرتے رہتے ہیں اورفرجادایک مزے کی بات بتاؤں؟''جب شنگریلہ بن رہا تھا اوراخبارات میں اورٹی وی اس کی خبریں آتی تھیں،ٹیپ چلتے تھےتو ہم سوچتے تھے جانے دنیا کی کس اور۔۔۔کس سرے پر یہ ہوٹل تعمیر ہورہا ہے اورجانے کس کے لیے؟ بھلا وہاں کون جاسکے گا اوراب جب ہم وہاں گئےتو مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ میں اس خوابناک جگہ کوبہ نفسِ نفیس دیکھ رہی ہوں بلکہ اس ہوٹل کی خوابگاہ میں دوتین رات قیام کرکے آرہی ہوں۔''اورشنگریلہ سےاوپرجھیل کچوراتھی جواس پہاڑی درے کی خاموشی میں عجیب منظر پیش کرتی ہے۔پہاڑوں نے اسے دبایا ہوا تھا اور پہاڑی سبزے کا عکس اس کے پانی کورنگین بناتا تھا۔اپنے تمام ترحسن کے ساتھ جھیل کچورا دل پرایک ہیبت طاری کرتی تھی اس سے اوپر ڈونگر تھااور زھوق کا کچارستہ جوشاید سیاحوں کی آمدورفت نے تراشا تھااورآگے چل کر پہاڑوں نے اپنا لباس اتار کر پھینکا تھااوراپنے تانبے جیسے بدن کے ساتھ دوردورہٹ گئے تھےاوران کے بیچ زمین میدانی شکل میں نمودار ہوتی تھی اوراس میدان میں دوریاذرا فاصلے سے بہتے تھے۔ایک نسبتاً کم پاٹ والا جس کا پانی تیز اور برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔اس میں پڑے پتھروں پرپیردھرتے وہ پاراترتے تھے اورلگتا تھا جیسے پاؤں کٹ کر بدن سے جدا ہوگئے ہیں۔تیز تیز بھاگ کروہ پار اترے۔آگے بڑااور تیز وتند،گہرادریا شورمچاتا نشیب میں گرتا تھا مگر ہموار سطح کے باوجود کناروں سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔یہاں قدم قدم پہ قدرت جلوہ نما تھی۔ دریا کا رستہ کون روکتا تھا؟ وہ نادیدہ قوت کہاں ہے؟ ان کا جی چاہتا تھا کہ سارے مناظر کواپنی آنکھوں کی پتلیوں میں سمیٹ لیں اور دل میں بھرلیں اور ایسا ہی ہوا بھی تھا۔

''جنت اس سے بڑھ کر کیا ہوگی؟'' انہوں نے متعدد بار یہ بات سوچی تھی۔

''اورجنت اس سے بھی بڑھ کرہوئی تو کیا ہوگی؟''

دریائے سندھ کے کنارے قلع ''خرفوچو'' سر اٹھائے کھڑا تھا۔ صدیوں پرانے اس قلعہ کی دیواریں سیاہ اور بھربھری ہوچکی تھیں اور سندھ اس کی بنیادوں سے سرٹکراتا تھا۔کہنے والے کہتے تھے قلع خرفوچو کی تعمیر میں ہزاروں انسانوں کا خون اس کے سیمنٹ اور گارے میں شامل ہوا ہے۔اس بلند پہاڑی ٹیلے تک نہایت نشیب سے پانی بھربھرکرلانے والی پنہاریاں۔۔۔کتنوں نے اپنی جانیں ہاری ہوں گی اوراب قلع خرفوچوایک کھنڈر تھااوراس کے تعمیر کرنے والے اس کواپنی زندگی کا محفوظ حصار بنانے والے اپنے انجام کوپہنچ چکے تھے۔قلع کا ڈھانچہ دعوت عبرت دیتا تھا اور قلعہ خرفوچو کے قدموں میں سرسبز وادی آبادی تھی ان کے گھروں کے سامنے ہرے بھرے کھیت تھے،باغات تھےاور شفاف پانی پختہ وناپختہ نالیوں میں بہتا تھا۔صاف اور میٹھا پانی ان کے کھیت سراب کرتا تھا اور ان کے کنارے کھیلتے بچوں نے ان کا استقبال کیا اوراپنے گھر والوں کوان کی موجودگی کی اطلاع دے کرکیا جن کے مکینوں نے گھروں سے باہر نکل کر میٹھے دودھ اورنمکین لسی سے ان دواجنبی سیاحوں کی تواضع کی اوروہ ان لوگوں کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ان کے گھروں کی دیواریں پھولوں سے لدی بیلوں سے ڈھکی تھیں اوران کے چہرے شاداب تھے ان کے بچوں کے گالوں پر سیبوں کا گمان گزرتا تھا۔

اوراس شہر میں بہت سے مزارات تھے اور ایک قتل گاہ بھی تھی جو کربلائے معلیٰ کا منی ایچر تھی۔آئمہ معصومین کی قبورمقدسہ اور دیگر زیارات کوکربلا کے انداز میں ترتیب دیا گیا تھا۔قتل گاہ کے ایک وسیع حصے پران فوجی شہدا اور جوانوں کی قبریں ہیں جنہیں طالبان نے شہید کیا تھا اب ان شہدا کی قبروں پر ہر برس فوجی آکر فاتحہ خوانی کرتا ہے اور سلامی دے کر پھول چڑھاتا ہے۔طالبان نے انہیں صرف شہید ہی نہیں کیا تھا بلکہ شہادت کے بعدان کے سراور چہرے پتھروں سے کچل ڈالے تھے جس کی وجہ سے ان کی پہچان بھی ممکن نہیں رہی تھی انہوں نے شہدا کی قبروں پرفاتحہ پڑھتے ہوئے سوچا تھا۔

''علم کی روشنی سے منور دماغ آج بھی صدیوں پہلے کے ظالم اور جاہلانہ رویہ کا حامل انسان ہے۔وہی بربریت،ویسی ہی سفاکی۔ایک طرف وہ کائنات فتح کررہا ہے،چاندستاروں پربستیاں بسانے کے جتن کررہا ہے اور دوسری طرف یہی انسان مذہبی منافرت،نظریاتی مناقشہ اورظلم وجور کے مظاہرے

کرتا ہے۔انسان پرظلم کا یہ حق کس نے دیا؟اور پاکستان کا وہ حکمران جو پنج وقتی نمازی تھا اور ہر لمحہ اسلام کا نام لیتا تھا مگر جس نے سکردو کے ایک مخصوص عقائد رکھنے والے فرقے کے لوگوں میں پھوٹ ڈالنے اوران کے مسلک میں انتشار پیدا کرنے کی غرض سے طالبان کو ان کے ساتھ بھڑا یا تھا۔مقامی لوگوں نے بھر پور مزاحمت کی تھی اوراس کے نتیجے میں شہدا کا یہ قبرستان ظلم و بربریت کی داستان آج بیان کرر ہا تھا اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ان کا دل بوجھل ہوا ان کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے ان شہدا کی قبروں پر ٹپکے اوراب وہ سکردو سے بہترین وقت گزار کے واپس جارہی تھیں۔وہ سکردو سے ہی نہیں، پاکستان سے جارہی تھیں۔اس ملک میں وہ پیدا ہوئی تھیں پلی بڑھی تھیں یہ ان کا ملک تھا مگر اب وہ برطانوی شہری تھیں اوراپنے گھر جارہی تھیں۔اپنے سسرال اورانہیں ایسا ہی دکھ کا احساس ہورہا تھا جیسا لڑکیوں کو مائیکہ چھوڑتے ہوئے ہوتا ہے۔

الماری سے کپڑے نکال کرانہوں نے ترتیب سے سوٹ کیس میں رکھے۔اِدھراُدھر سے چھوٹی موٹی بکھری چیزیں سمیٹیں۔فرجاد کی کتابیں جمع کیں اور الماری میں بچھے اخبار اٹھا کر جھاڑے۔مبادا کوئی ضروری چیز نہ رہ گئی ہو۔ کاغذوں کے بیچ سے انہیں ایک تصویرالٹی رکھی ملی۔انہوں نے تصویر کو اٹھایا اور وہ منجمد ہوکررہ گئیں۔تصویر میں راشدان کی طرف دیکھ کر بیٹھا مسکرار ہا تھا۔

''یہ تصویر یہاں کیسے آئی؟ کیا راشد یہاں آئے تھے؟ یہ فوٹو ان کے پاس ہوتا تھا۔وہ اپنے والٹ میں رکھتے تھے۔پھر یہ یہاں کیسے آیا؟ کیسے رہ گیا؟''انہیں اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا اور وہ کرسی پر بیٹھ کے دیر تک تصویر دیکھتی رہیں۔گزرے وقت کے بے شمار واقعات ایک ایک کرکے ان کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔اور وہ دیر تک تصورات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہیں۔سچ کہا گیا ہے کہ دنیا گول ہے۔وہ رستے جن کو چھوڑ کر ہم آگے بڑھ جاتے ہیں جانے کیسے گھوم گھام کراچانک ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔انہوں نے سوچا۔

''تو راشد تم یہاں آئے ہو اور تم نے اس کمرے میں قیام بھی کیا ہے اوراچھا ہوا کہ مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ تم نے بھی اپنے دل،اپنی زندگی سے مجھے نکال دیا ہے۔''

اس خیال کے ساتھ ان کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ آئی۔انہوں نے قینچی سے اپنی تصویر کے ساتھ سے راشد کی تصویر علیحدہ کی اور بیل بجا کر علی کو بلایا۔

''علی کیا تم ان صاحب کو جانتے ہو؟''انہوں نے راشد کی تصویر علی کو دکھائی۔

''جی۔۔۔جی۔۔۔یہ تو راشد صاحب کی تصویر ہے۔''وہ خوش ہو کر بولا۔

''کیا یہ آپ کے کچھ لگتے ہیں؟''

''نہیں''انہوں نے مختصر جواب دینا ہی مناسب سمجھا۔

''تم راشد صاحب کو کیسے جانتے ہو؟ کیا وہ کبھی یہاں آ کر ٹھہرے تھے؟''انہوں نے پولیس والوں کی طرح انکوائری کی۔

''سر۔۔اوہ میڈم۔۔۔ایک آدھ دن؟ راشد صاحب تو یہاں اسی کمرے میں کئی برس تک ٹھہرے ہیں''علی نے جوش سے کہا۔

''پھر۔۔۔اب کہاں چلے گئے؟''

''میڈم۔۔۔اب وہ اپنے سسرال میں رہتے ہیں۔یہیں سکردو میں۔''

''کیا مطلب؟وہ اپنی فیملی کے ساتھ نہیں تھے کیا؟''انہوں نے انجان بن کے پوچھا۔

''جی وہ پنجاب سے آئے تھے۔کئی سال وہ یونہی پھرتے رہے۔روز کہیں نہ کہیں نکل جاتے تھے پھر یہاں انہوں نے اپنا کاروبار شروع کیا اور پھر شادی کرکے ہمارے ہوٹل سے اپنے سسرال چلے گئے۔''

''اچھا۔۔۔تو یہ تصویر وہ اپنی یہیں بھول گئے ہیں شاید۔۔۔یہ ان کو دے دینا''

''اورکوئی پیغام میڈم؟''

''کیسا پیغام؟ میں تو ان کو جانتی ہی نہیں ہوں۔''وہ لاپرواہی سے جھوٹ بولیں۔

''میرا مطلب ہے وہ کچھ پوچھیں تو؟''

''تو بتا دینا ایک مسافرآئی تھیں۔انہوں نے سکردو کی سیر کی۔وہ یہاں ٹھہریں اوراپنا سامان سمیٹتے ہوئے انہیں الماری میں کاغذوں کے نیچے سے یہ تصویر ملی۔جوانہوں نے مجھے دیدی کہ میں آپ کو پہنچادوں۔غلطی سے یہ یہاں رہ گئی تھی یا آپ بھول گئے تھے شاید۔۔۔''

علی نے تصویر پکڑی اور جانے کے لیے مڑ گیا۔وہ کرسی پر بیٹھی خالی خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہیں۔

''محبت''

تم مجھ سے محبت کرو یا نفرت۔۔۔!

دونوں میرے حق میں ہے۔تم مجھ سے محبت کرتے

ہوتو میں تمہارے دل میں ہوں اور اگر تم مجھ سے

نفرت کرتے ہوتو میں تمہارے دماغ میں۔۔۔!

ولیئم شیکسپیئر

''صبا کی مدحتیں''

حمد

سہانی بارشیں ساری ہیں تیری
خدایا رحمتیں ساری ہیں تیری

تری خاطر میں موتی رولتا ہوں
دعا میں رقتیں ساری ہیں تیری

ترے ہی نام کے سب ہیں وظیفے
ہماری محفلیں ساری ہیں تیری

ترے احساس سے سینے ہیں روشن
دلوں کی دھڑکنیں ساری ہیں تیری

گلِ خوبی کی خوشبو تیری خاطر
صبا کی مدحتیں ساری ہیں تیری

ترے ہی واسطے کاغذ کی سطریں
قلم کی آیتیں ساری ہیں تیری

تری نصرت سے پاکستان فاتح
وطن کی کاوشیں ساری ہیں تیری

محبت کے سفر سارے ہیں تیرے
وفا کی منزلیں ساری ہیں تیری

کہاں سجدے سے ثاقبؔ سر اٹھائے
مبارک ساعتیں ساری ہیں تیری

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

نعتیہ رباعیات

لینے وہاں رحمت کے خزینے جاؤں
روزانہ نہیں تو ہر مہینے جاؤں
اللہ سے یہ مانگتا رہتا ہوں دعا
ہو کوئی سبیل ایسی، مدینے جاؤں

☆

سرکارِ دوعالم ﷺ کا قصیدہ لکھوں
لفظوں میں عقیدت کا جریدہ لکھوں
جی چاہے کہ میں حرفِ الف سے یا تک
سرکار کے اوصافِ حمیدہ لکھوں

☆

دربارِ رسالت ﷺ سے رَسَد ملتی ہے
جو نعت کہوں، اُن کی مدد ملتی ہے
جب ہدیۂ نعت اپنا انہیں پیش کروں
مقبول ہوئی، اُن سے سَنَد ملتی ہے !

نسیمِ سحر
(راولپنڈی)

جنٹل مین ڈرنکس

انل ٹھکر
(بھلی)

علی الصباح اٹھ کر اپنے بنگلے کے صحن میں رنگولی ڈالنا اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ رنگولی ڈالنے میں محو تھی کہ ایک مردانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

Good Morning Madam

اس نے آنکھیں اٹھا کر گردن موڑ کر پیچھے کی جانب دیکھا۔ اس کی پلکیں مسکراتے ہوئے ایسے پھڑ پھڑائیں جیسے تتلی پرواز کرنے کے لیے اپنے پر تولتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ اس لیے عیاں ہوئی کیونکہ اسے معلوم تھا وہ شخص تارا بائی کا گھر والا تھا جو اکثر و بیشتر سفید یونیفارم میں آنکھیں جھکائے وہاں سے گزرتا تھا۔ ابھی جب وہ رنگولی ڈالنے بیٹھ رہی تھی تب وہ وہاں سے جا رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ اچانک لوٹ کیوں آیا؟ کسی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا نہیں، آج مجھ سے بات کرنے کا حوصلہ اس میں کہاں سے آ گیا؟!!

اس کی بیوی تارا بائی جب کبھی یہاں سے گزرتی، اس سے ہنس کر دو باتیں ضرور کر جاتی، ویسے تو غریب کی بستی کی ہر عورت اور مرد کا دستور سا بن گیا تھا کم از کم اتنا تو پوچھ ہی لیتے کیسے ہیں؟ چائے پی؟ اسکول کے آتے جاتے بچے چھوٹے ہوں یا بڑے، لڑکی ہو یا لڑکا نمستے آنٹی، سلام آپا، گڈ مارننگ یا کچھ نہیں تو اپنی مسکراہٹ تو بکھیرتے جاتے۔ خاص طور پر بچوں کے سلام یا مسکراہٹ کے جواب میں وہ انہیں خوب پڑھیں اور پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننے کی نصیحت کرنا نہیں بھولتیں۔ صاف ستھرے لباس کو وہ زیادہ ترجیح دیتیں۔ دوسروں سے اچھا سلوک کرنا، بڑوں کا لحاظ کرنا، والدین کا کہا ماننا، ایسی باتیں وہ پیار سے سمجھاتی۔ اس کی فطرت سے بچے اور بڑے اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

ساٹھ سال کی چوکھٹ پر کھڑی آنٹی پیشہ سے وکیل تھیں۔ وکالت کا پیشہ اختیار کرتے ہی بالوں کو سنوارنے کے جھنجھٹ سے بچنے کے لیے اس نے اپنے بال چھوٹے بنوا لیے تھے۔ اس کے گھر کے ٹھیک سامنے پرائمری سکول تھا۔ آگے چل کر Slum کا علاقہ آباد تھا جہاں کی عورتیں اپنے گھر کے مسائل لے کر اس کے پاس رائے لینے آتیں۔ گھر کا جھگڑا، میاں بیوی کی ان بن، اس طرح کے مسائل کو وہ بڑے دھیان اور شفقت سے سنتی، ان سے ہمدردی جتاتی اور اکثر رائے دیتی کہ گھر کے مسائل گھر میں ہی حل کرنے چاہئیں۔ انہیں پولیس اسٹیشن لے جانا یا عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پریشانیوں کو دعوت دینا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو وہاں تک انہیں آپس میں سمجھا بجھا کر من مٹاؤ دور کر لینا چاہیے۔ اس طرح ان میں صلح کروا دیتی۔ Slum میں کچھ غنڈے قسم کے لوگ بھی بستے تھے مگر وہ اس سے بچ کر ہی چلتے۔ اس سے کبھی پنگا لینے کی ہمت نہیں کرتے وہ جانتے تھے یہ پیار، محبت سے پیش آنے والی وقتِ ضرورت شیرنی بھی بن سکتی ہے۔

رنگولی ڈال کر وہ اٹھی اور اس شخص سے گفتگو کرنے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

کہو؟۔۔۔اس نے پوچھا۔

وہ پس و پیش میں پڑ گیا۔ کہاں سے شروع کرے؟ اُلجھن میں اُس کے منہ سے نکلا۔

''میڈم، میرے بچے آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں وہ چھوٹے تھے تب میں یہاں رہنے آیا تھا اب وہ بڑے ہو گئے ہیں۔''

اس کے تعریفی جملوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک وکیل کی مانند سوال کیا۔

وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

اس غیر متوقع سوال سے وہ سٹپٹا گیا۔ مگر اس نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ لحہ بھر میں سنبھل کر بولا۔

ویسے تو میری گھر والی بھی آپ کے بہت گن گاتی ہے۔ بیٹی بھی آپ کی تعریف کرتے نہیں تھکتی۔ آپ کا بہت احترام کرتی ہے۔ اس نے محسوس کیا یہ شخص ابھی بھی کھل کر بات نہیں کر رہا۔ اپنا مقصد بیان نہیں کر رہا اس نے کہا۔۔۔

بات کیا ہے؟ کھل کر کہو۔

اس نے دیکھا محترمہ نے ناک دبایا ہے، اب تو منہ کھولنا ہی پڑے گا۔ اس نے کہا

وہ۔۔۔میری گھر والی مجھ سے جھگڑتی بہت ہے۔

کیا؟ آپ ویسا کچھ کرتے ہوں گے، ٹھیک سے گھر خرچ کے لیے۔۔۔

نہیں نہیں، میڈم میں تو اپنی پنشن کی رقم اور تنخواہ دونوں اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہوں۔

تو پھر کیا وجہ ہے؟

وہ تھوڑا ہچکچایا پھر بولا۔۔۔

بات یہ ہے میڈم۔۔۔میں روزانہ رات کو سیکسٹی ایم ایل۔۔۔میرا مطلب ہے آدھا پیگ وسکی پیتا ہوں اس لیے۔۔۔

تم بھی عام شرابیوں کی طرح مار پیٹ کرتے۔۔۔

''توبہ توبہ''

اب یہ مت کہنا، چھٹتی ہی نہیں کافر منہ سے لگی ہوئی۔

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ بولا۔۔۔

ایسا نہیں ہے میڈم۔ میں فوج سے ریٹائر ہوا ہوں۔ ہم فوجیوں کو

کہاں کہاں رہنا پڑتا ہے۔کبھی چائنہ بارڈر، کبھی کشمیر کی وادیوں میں تو کبھی کارگل کی برفیلی چوٹیوں پر، ٹھنڈ سے خون منجمد ہوجائے نہ پئیں تو جیئے کیسے؟

مگراب تو فوج میں نہیں ہیں۔

عادت پڑ گئی ہے۔کیا کریں۔ برسوں پی ہے پہلے زندہ رہنے کے لیے پیتے تھے،اب چین کی نیند سونے کے لیے پیتے ہیں۔

فوجی نے جیسے اس کے منہ پر قفل لگادیا۔کچھ لمحات سوچ کر بولی۔

اگر آپ کی بات مان بھی لی جائے تو یہ ایک طرفہ بات ہوگی۔ مجھے آپ کی گھر والی کی بات بھی سننی ہوگی۔ وہ کیا کہتی ہے۔ آپ ایسا کریں انہیں میرے پاس بھیج دیں۔

دوسرے روز شام ڈھلے وہ آنے جانے والوں کا دعا سلام جھیل رہی تھی تبھی تارابائی چائے ہوئی؟ پوچھتے ہوئے بنگلے کا پھاٹک کھول کر داخل ہوئی۔

آؤ آؤ تارابائی کیسی ہو؟ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔تارابائی اس کے قریب زینے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اچھی ہوں۔انہوں نے کہا آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

ہاں، بہت دنوں سے تم نظر نہیں آئیں، وہ یہاں سے جارہے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا۔۔۔تمہارے وہ کرتے کیا ہیں؟ ہمیشہ سفید یونیفارم میں رہتے ہیں۔

وہ I.I.T کے ڈائریکٹر کے ڈرائیور ہیں۔اس نے کچھ فخریہ انداز میں کہا۔

اچھا، اچھا وہ پرسوں یہاں آئے تھے۔کچھ پریشان، مایوس سے نظر آئے۔

تارابائی نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کے پاس آئے تھے؟''

ہاں کچھ دکھی نظر آئے۔

دیوا، دیوا، ایسا کیا دکھ تھا جو آپ کو کہنے آئے!!!

تارابائی کی حیرت دیکھ کر اس نے سوچا اب آہستہ سے بات کہہ دینی چاہیے۔کہا۔۔۔

ایسا کچھ خاص نہیں کہا اتنا کہا تم ان سے ناراض رہتی ہو۔

نہیں تو۔۔۔

خاص کر اس وقت جب وہ رات کو آرام سے سونا چاہتے ہیں۔

اس نے سوچا وہ پاگل تو نہیں ہوگیا نا؟ غیر عورت کے پاس کوئی ایسی باتیں کرتا ہے بھلا!!

حسد نے دل میں کھلبلی مچائی، اپنی ذاتی باتوں کا جب اس نے پٹارا کھولا ہی ہے تو میں چپ کیوں رہوں بولی۔۔۔

روزانہ نہیں۔۔۔وہ چپ ہوگئی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔وہ آگے کچھ کہہ نہ سکی۔انہوں نے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا نہیں۔اس کی سرخی اس کے سر سے گزر گئی۔وہ اپنی دھن میں بولی۔۔۔

مگر کیوں؟ ایسی کیا بات ہے؟ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ روزانہ تھوڑی شراب پیتے ہیں۔کیا شراب پی کر تم سے مار پیٹ کرتے ہیں؟

یہی تو تکلیف ہے۔وہ خاموش سوجاتے ہیں۔

اچھا ہے نا۔اس میں کیا بُرا ہے؟

کیا خاک اچھا ہے؟!!۔۔۔اتنا کہہ کر تارابائی چپ ہوگئی۔ وہ جاتے ہوئے بھی دل کی بات کہہ نہ سکی۔

اس نے سوچا کچھ تو ہے جو تارابائی چھپا رہی ہے۔اس نے تارابائی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو ڈاکٹر اور وکیل سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہیے۔''

بائی صاحب عورت کو اپنی شادی شدہ زندگی میں کیا چاہیے۔سارا دن گھر کے کام سے فرصت ملے تو اس کا گھر والا اس سے دو باتیں پیار سے کرے۔کچھ اپنی کہے کچھ گھر والی کی سنے۔سچ کہہ رہی ہوں نا؟

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔۔۔صحیح کہہ رہی ہو۔

پھر بھگوان نے انسان کو بھوک بھی دی ہے۔ پیٹ کی بھوک اور جسم کی بھوک۔دن میں دو تین مرتبہ پیٹ بھر کر ہم مطمئن ہوجاتے ہیں۔جسم کی بھوک کو بھی کبھی کبھی۔۔۔

میں سمجھ گئی مگر وہ ریٹائرڈ آدمی ہے۔اس سے ایسی امید رکھنا ٹھیک ہے کیا؟

تارابائی ہوا بھرے غبارے کی طرح پھٹ پڑی۔

منہ کالا ہو اس کے بڑھاپے کا۔آدمی ریٹائرڈ ساٹھ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔اس کی عمر تو کوئی عمر ہے کیا ریٹائرڈ ہونے کی؟

کیوں؟ فوج سے ریٹائرڈ نہیں ہوا؟ اس نے پوچھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوا۔تین برس بعد مجھ سے شادی کی۔پندرہ سال کا کمیشن پورا کر کے فوج سے لوٹ آیا۔کتنی ہوئی اس کی عمر؟

حساب کا سوال پوچھتے سن وہ مسکرا کر بولی۔

کتنی؟

تینتیس برس۔تین برس ہوئے فوج سے لوٹ کر۔آج اس کی عمر چھتیس سال کی ہے۔میں ہوں بتیس سال کی۔اس عمر میں لوگ۔۔۔

ایسا ہے تو میں ان سے پوچھوں گی وہ تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں؟

یہ سن کر وہ تلخ ہوگئی۔۔۔

آپ کیا پوچھیں گی اور وہ آپ کو کیا بتائے گا!!! میں بتاتی ہوں اس کا کمینہ پن۔

اس کی بات کی تلخی دیکھ کر حیرت سے وہ سنتی رہی۔ تارا بائی نے نفرت سے اپنی بات آگے بڑھائی۔

وہ جس ڈائریکٹر کے پاس کام کرتا ہے۔ اس علاقے میں ایک رانڈ کے ساتھ اٹکا ہوا ہے۔ وہ کبھی کبھی تو صاحب کے ساتھ ٹور پر جا رہا ہوں کہہ کر اس کے ساتھ گل چھرے اڑاتا ہے۔ اس نے ایک ہی سانس میں یہ سب کچھ کہا۔ ایک لمحہ سانس لینے رکی پھر بولی۔

وہ ویسا نہیں تھا۔ اس رانڈ نے اسے بگاڑا ہے۔ میں اس رانڈ کو چھوڑوں گی نہیں۔ جوتے مار مار کر اس کے چوتڑ لال کر دونگی۔

اس نے سوچا تارا بائی اب بھی اپنے شوہر کو قصوروار نہیں مانتی۔ وہ اس عورت کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شوہر کے لیے اس کے دل میں پیار اب بھی باقی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے شوہر سے حقیقت جان کر اس مسئلہ کا حل ممکن ہے۔

شام کی نرم دھوپ مس اپنے چھوٹے سے باغ کو پانی سے سینچ کر فارغ ہونے کے بعد صبح کی پوجا کے لیے کچھ پھول چُنے پھر بنگلے کے احاطے میں آ کر کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ تارا بائی کا شوہر وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے میڈم کو احاطے میں کرسی پر بیٹھا دیکھا تو بنگلے کے پھاٹک کی جانب مڑا۔ پھاٹک کھول کر اندر آیا۔ انہیں سلام کیا۔ انہوں نے اسے دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے ہاتھ میں تھامی تھیلی پاس میں رکھی۔ ایک لمبا سانس لیا جیسے تھکان دور کر رہا ہو۔

بازار گئے تھے؟ میڈم نے پوچھا۔

جی۔ کچھ گھر کے لیے کچھ اپنے لیے خریداری تھی، کر آیا۔

اچھا ہوا آپ آ گئے۔۔۔ اس کی رسمی گفتگو کو ترک کر کے براہِ راست سیدھے مقصد پر آتے ہوئے کہا۔

دو دن پہلے تارا بائی آئی تھی۔

کیا کہا اس نے؟

شکایت کر رہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کسی دوسری عورت سے تمہارے ناجائز تعلقات ہیں۔

یہ اس کا گمان ہے۔ ایک عام عورت کا وہم کہہ لیجیے۔

اتنا کہہ کر اس نے سرد آہ بھری۔ خاموش خلا میں دیکھتا رہا۔ کچھ لمحات کے بعد بولا۔

اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ ایسے موقع پر ہر عورت ایسا ہی سوچے گی۔

اتنا سب سمجھتے ہیں تو اپنی صفائی میں کچھ کہتے کیوں نہیں۔

یہ میری مجبوری ہے۔

اس نے عدالت میں کسی ملزم سے پوچھنے کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

کیسی مجبوری؟ ایسی کیا بات ہے جو آپ اس سے چھپانا چاہتے ہیں؟

یہ ایک ایسی مجبوری ہے جسے کوئی مرد کسی سے بانٹنا نہیں چاہے گا۔

اسے یہ راز بتا دو۔ ہوسکتا ہے وہ آپ کے متعلق اپنی رائے بدل دے۔

اس نے کہا۔

ممکن ہے۔ وہ اپنی رائے بدل دے مگر اس سے میری قسمت نہیں بدل سکتی۔

اس نے اسے غور سے دیکھا۔ ایک لخطہ اسے خیال آیا اسے کوئی جنسی بیماری تو نہیں؟ ایڈز وغیرہ۔۔۔ مگر اس کی صحت، جلد کا رنگ روپ دیکھیں تو بیماری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے پھر ایسا کیا ہے؟ اس نے کچھ وقفے سے سوچ کر ایک پانسا پھینکتے ہوئے اس کی کہنی پر شہد لگاتے ہوئے کہا۔

دیکھیے۔ آپ کا مسئلہ ہے نیند، چین کی نیند۔ بغیر کسی تُو تُو میں میں سونے کے وقت، کریکٹ؟

بالکل۔ تھوڑی شراب اور چین کی نیند۔ تا کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔

اس نے دیکھا، کُہنی کا شہد کام کر گیا ہے اس نے آگے کہا۔

آپ جو بھولنا چاہتے ہیں اس کی دوا میرے پاس ہے۔

کیا؟!!

بھولنا چاہے ہیں تو وہ بات مجھے بتا دو اور بھول جاؤ۔ آپ کی نیند کا ذمہ میرا۔ اس درد کو اُگل دو نیند خود بخود آ جائے گی۔

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ سوچتا رہا کہے کہ نہ کہے؟ پھر جیسے فیصلہ کر لیا ہو۔ اس نے جھٹ سے جیکٹ کے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔

میڈم۔ میں آٹھ دن کے لیے آدھی بوتل لا کر گھر میں رکھتا ہوں۔ آج ہی خریدی ہے۔

اس نے راستہ کی جانب نگاہ ڈالی۔ راستہ سنسان تھا۔ اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا بوتل منہ سے لگا کر ایک تگڑا گھونٹ حلق میں اتارا۔ بغیر سوڈا یا پانی کے۔ حلق سے سینے میں جیسے آگ اتری ہو۔ منہ سے تیز بو فضا میں تحلیل ہوئی۔
اس نے بوتل جیب میں رکھی۔ آستین سے ہونٹ پونچھے اور کہا۔

وہ سانحہ بڑا دردناک ہے۔ زندگی کے ہر خوش رنگ کو بدرنگ کر دیا۔

وہ سامنے مغرب میں غروب ہو رہے آفتاب کی سرخی پر نظر جمائے رہا۔ جیسے اس سرخی میں اسے وہ گزرا ہوا واقعہ فلم کی مانند نظر آ رہا ہو۔ اچانک اس تصور سے اپنا دھیان ہٹا کر اس نے کہا۔

میں اپنی نیند کا سودا آج آپ سے کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ مجھے

مایوسی کا منہ دیکھنا نہیں پڑے گا۔

آپ بالکل بےفکر رہیے۔ آپ گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔

اس نے ٹھوڑی کے بائیں بازو انگوٹھا رکھا۔ دائیں ہونٹ اور گال کے درمیانی حصے کو ہلکے ہلکے سہلاتے ہوئے تصور کرتا رہا۔ اس عمل کے دوران کا منہ لاشعوری طور پر نصف کھلا ہوا تھا۔ اس نے اپنی حرکت کو کچھ لمحے جاری رکھا پھر بولا۔۔۔ہماری بٹالین ان دنوں گلگت سرحد پر تعینات تھی۔ گلگت چاروں طرف سے پڑوسی ملک کی سرحدوں سے جڑا ہوا ہے۔ ایک طرف چین دوسری طرف افغانستان اور ایک پہلو میں بھارت، ہمیں ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ تھوڑی سی بھی غفلت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ گرما کا موسم رخصت ہونے کو تھا۔ چاروں جانب برفیلی چوٹیاں رہنے سے سردی سال بھر رہتی تھی۔ بدلتے موسم کو دیکھ کر گجر چرواہے جو گرمی کے شروع ہوتے ہی اپنی بھیڑ بکریوں کو میدانی علاقوں میں لے جانے کے فراق میں تھے۔ کچھ چرواہے اپنے ریوڑ لے کر پہاڑ اترنا شروع کر چکے تھے۔ بہت سے چرواہے لوٹنے کی تیاری میں تھے۔ ہمیں اُن پر بھی نظر رکھنے کی تاکید تھی۔ کیونکہ پاس کی سرحد پار گجر برادری والے بستے تھے۔ ان کی شکل وصورت، لباس ایک سا ہوتا تھا۔ ان کے لباس، بولی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کوئی پاس کے ملک کا گجر ہماری سرحد میں جاسوسی کرنے نہ آنے پائے اس کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ یہاں ان گجر چرواہوں کے جانور ہر طرف پھیلے ہوتے تھے۔ کہیں کہیں ان کے عارضی طور پر بنائے گئے تنبو (خیمے) بھی نظر آتے۔ باقی بچے چرواہے پہاڑ اترنے کے لیے سامانِ سفر باندھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں شک وشبہ کا کوئی موقع فراہم نہیں کیا تھا۔ اس لیے ہمیں بھی اطمینان تھا۔

کہتے کہتے وہ رکا۔ اپنا سر کھجلانے لگا۔ اس کے بال کچھ بکھر گئے۔ ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اب تک اس نے جو کچھ کہا وہ کہانی کی تمہید تھی۔ یہ آغاز تھا۔ انجام آگے ہے۔ اس نے کچھ رک کر سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

پہاڑوں پر موسم کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ ایک شام اچانک ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ تھوری دیر میں کالے بادل اُمڈ کر آسمان میں اتر آئے۔ بجلیاں بے لگام گھوڑوں کی طرح یہاں سے وہاں بھاگ دوڑ کرنے لگیں۔ بجلی کے کڑاکے جیسے انسانوں کے کان پھاڑنے کے لیے کوشاں تھے۔ تبھی جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو ویسے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ تقریباً دو گھنٹے تک لگاتار پانی برستا رہا۔ بارش تھمی تو سناٹا چھا گیا مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ آسمان سے روئی کے گالوں جیسی برف گرنے لگی۔ میری ڈیوٹی ختم ہوئی تو دو گھونٹ رم پی اور اپنے سلیپنگ بیگ میں گھُس کر زِپ کھینچ لی اور دُبک کر سو گیا۔ صبح جاگا، دیکھا نیلا آسمان بادلوں کے چند ٹکڑے اپنے دامن میں سمیٹے مسکرا رہا تھا اور چہار سُو سفید برف ہی برف پھیلی ہوئی تھی۔ حدِ نگاہ تک برف کی سفید چادر کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، رات میں بے موسم کی برف باری کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ رات چھ سات فٹ برف گری تھی۔ جس کی وجہ سے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ دو قدم چلے نہیں کہ گھٹنوں یا کمر تک جسم برف میں دھنستا جا رہا تھا۔ میں دو، تین گھونٹ رم کے حلق میں اتار کر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ مگر اس سردی میں دو گھونٹ کیا اثر کرتے!! مگر کچھ سہارا ضرور ملا تھا۔ ہمارے علاقے میں پہاڑ پر بچے چرواہے عجلت میں تھے، وہاں سے نکل جانے کی جلدی میں ان میں افراتفری مچی ہوئی تھی، ہر کوئی اپنے عارضی خیمے (تنبو) اُکھاڑ کر جو کچھ ہاتھ میں آیا سمیٹ کر وہاں سے نکلنے کو بےقرار ہو رہا تھا۔ ہر ایک اپنے ریوڑ کے ساتھ پہاڑ سے اترنے کی جلدی میں تھا، تبھی ایک نوجوان میرے سامنے سے دو سو کے قریب جانوروں کی راہبری کرتا ہوا گزرا۔ ریوڑ کے جانوروں کو صف میں رکھنے کے لیے چرواہوں کے کتے بھونکتے ہوئے ان کی طرف چل رہے تھے۔ ریوڑ کے پیچھے ایک بوڑھا گجر جلد آگے کے بڑھنے کے لیے جانوروں کو ہانکا دیتے ہوئے میرے قریب سے نکلا۔ اس کے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک عورت اپنے کاندھے پر دوڈھائی سال کی بچی کو لئے جس کے پاؤں عورت کے سینے کی جانب تھے، اس بوڑھے کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کے ہمراہ بھی ایک کالا کتا چل رہا تھا۔ کچھ لمحات کے بعد میں نے ایک چیخ سنی۔ میں نے اس سمت دیکھا وہ گجر عورت برف میں اوندھے منہ گری ہوئی تھی وہ اس چھوٹی بچی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی، بچی ڈر کے مارے رو رہی تھی، برف تازہ تھی، ابھی سخت نہیں ہوئی تھی، چھ سات فٹ گہری نرم برف، وہ عورت برف سے نکلنے کے لیے جتنی جدوجہد کرتی اتنا ہی وہ اس میں گہری اترتی جاتی۔ وہ اوندھے منہ گری تھی اوپر کاندھوں پر بچی کا بوجھ وہ سانس لینے کے لیے چھٹ پٹا رہی تھی، میں نے یہ دیکھا تو اس کی جانب دوڑا، میرے جسم کا بھاری یونیفارم وزنی جوتے اور بندوق اس بوجھ سے لدا میں اس کے قریب پہنچا تب تک تو میرا نصف جسم برف میں پھنس گیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ عورت سانس لینے کے لیے جھٹپٹا رہی تھی اچانک اس کا تڑپنا تھم گیا۔ میں نے بندوق پھینک کر اس روتی بچی کو اس کے کاندھوں سے اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اتنے میں اس عورت کے کتے نے میرے قریب آ کر بھونکنا شروع کیا۔ ایک طرف برف میں دھنسا میرا جسم دوسری جانب خوف ناک کتا۔ جانے کب پھاڑ کھائے!! کافی دیر تک اس بچی کو بچانے میں زندگی اور موت کے درمیان جھولتا رہائی کا انتظار کرتا رہا۔ تب پیچھے سے آ رہے ریوڑ والوں نے ہمیں دیکھا، انہوں نے اس بوڑھے گجر کو آوازیں دے کر بلایا۔ انہوں نے بچی کو میرے ہاتھوں سے لیا، ان تجربہ کار گجروں نے اس عورت کے جسم سے اور میرے ہاتھوں میں رسی باندھ کر برف سے کھینچ نکالا۔ عورت اس فانی دنیا سے کوچ کر چکی تھی۔ میرا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ اتنے میں میری بٹالین کے کچھ ساتھی آ گئے۔ مجھے کیمپ میں لایا گیا کیمپ کے ڈاکٹر کی رائے پر فوراً ہیلی کا پٹر طلب کیا گیا اور مجھے سری نگر فوجی ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ جہاں تقریباً تین ماہ میرا علاج چلا۔ میں ان دنوں اپنی پتنی سے فون پر بات کرتا رہا۔ مگر اسے یہ نہیں بتایا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ وہ یہی سمجھتی رہی کہ میرا تبادلہ سری نگر ہوا ہے۔ علاج ہونے کے بعد میرا

باقی صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ کیجیے

''ہم دیکھیں گے''

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

''احمد! ایک بات بتایئے آپ کی شادی ہوگئی۔اظہر جو آپ سے چھوٹے ہیں ان کی بھی شادی ہوگئی بلکہ ان کی شادی تو آپ کی شادی سے بھی پہلے ہوگئی مگر آپی جو آپ سے بھی بڑی ہیں ان کی شادی کا کوئی ذکر نہیں۔''

میں نے آج موقعہ جان کر احمد سے پوچھ ہی لیا۔

احمد نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔احمد نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولے:

''کیا یہ بڑی بات نہیں ہے کہ ہماری شادی ہوگئی۔۔۔''

''تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ میرے خاندان والے ہماری شادی کے لیے بڑی مشکل سے راضی ہوئے تھے مگر کیسے۔۔۔؟ وہ تمہیں معلوم نہیں۔۔۔ آج میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

ایک دن میں ہسپتال سے گھر آیا تو گھر میں سب لوگ جمع تھے۔تایا سائیں، تائی جی، بی بی (پھوپھی) اماں، بابا سائیں وغیرہ۔ مجھے بلایا گیا اور یہ مشترکہ فیصلہ سنایا گیا کہ ''تمہاری شادی جہاں تم چاہ رہے ہو وہاں نہیں ہوسکتی کیونکہ ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادیاں نہیں کی جاتیں۔اور تمہاری پسند تو ہماری زبان اور ہمارے کلچر سے بھی باہر ہے۔''

میں نے جواب میں صرف یہ کہا ''مجھے آپ سب کا فیصلہ منظور ہے مگر آپ لوگ مجھے کبھی شادی کرنے کے لیے نہیں کہیں گے اور اگر آپ لوگوں نے مجھ سے زبردستی کی تو میں یہ گھر یا شاید یہ ملک ہی چھوڑ کر چلا جاؤں۔۔۔''اس کے بعد وہاں سے خاموشی سے چلا گیا۔

بابا سائیں مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کس طرح۔۔۔ انہوں نے سب کو راضی کرلیا۔

دو ہفتے کی خاموشی کے بعد اچانک بابا سائیں مجھ سے بولے۔

''نازیہ کے گھر کب چلنا ہے؟''

''میں خوشی کے مارے ان سے لپٹ گیا اور وہ میرے سر پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگے جیسے میں چھوٹا سا بچہ ہوں۔''

''آپی کے لیے خاندان بھر میں کوئی لڑکا نہیں تھا۔تایا سائیں کے حکم سے ان کی ''حق بخشوائی'' ہوگئی ہے اس لیے کبھی آپی کی شادی کی بات زبان پر نہ لانا۔احمد نے تاکید کی۔''

یہ ''حق بخشوائی'' کیا ہوتی ہے۔میں نے تعجب سے پوچھا۔

''قرآن شریف سے شادی''

''آج بھی یہ فرسودہ رسم و رواج۔۔۔؟''میں نے حیرت سے کہا پھر میں نرم لہجے میں بولی۔

''قرآن شریف اللہ کی کتاب ہے، اس کو پڑھنے کا حکم ہے، سمجھنے کا حکم ہے، اس کے احکامات پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزارنا چاہیے نہ کہ شادی۔۔۔؟''

احمد نے مزید وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور مزید حیرانی میں ڈالتے ہوئے بولے۔

''اور ہاں سنو! سارہ کے لیے بھی خاندان میں کوئی لڑکا نہیں ہے تو تم اس موضوع پر کسی سے بات نہیں کروگی، مجھ سے بھی نہیں۔''احمد نے تاکیداً کہا۔

میرے اندر مجھ سے بات کرنے لگا۔

''یہ کیسا ستم ہے؟ یا اللہ بی بی حوا کی بیٹی کا مقدر کیا یہی ہے؟ میری نظر کے سامنے تاریخ اسلام کی اوّلین خواتین حضرت بی بی خدیجہؓ، حضرت بی بی فاطمہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت اسماءؓ آ گئیں۔ان محترم بیبیوں نے باپردہ ہوتے ہوئے بھی اسلام کے لیے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام نہیں دیئے۔یہ بھی تو عورتیں تھیں۔ ان کے علاوہ ملکہ سبا، ملکہ نور جہاں، چاند بی بی، رضیہ سلطانہ، ملکہ وکٹوریہ۔۔۔اور آج کی عورت جو کسی بھی شعبے میں مردوں سے پیچھے نہیں۔۔۔؟ پھر یہ بے زبان عورتیں، جن کے لیے زمین تنگ اور آسمان بہت بلند ہے۔۔۔ آپی۔۔۔سارہ۔۔۔؟ کیا یہ بی بی حوا کی بیٹیاں نہیں ہیں۔''

''ایک وہ بھی عورتیں ہیں جن کے نام کے سکّے چلتے تھے اور ایک یہ عورتیں جو کچلی ہوئیں، زمانے سے ہاری ہوئیں، دکھیاری، روتی جھینکتیں، اذیت ناک زندگی گزارتی ہوئیں۔''

سارہ پیاری اور بے حد خوبصورت تھی، دبلی پتلی، گورا رنگ، نظروں کے ذریعے دل میں اتر جانے والی خط و خال، بڑی بڑی آنکھیں، بال گھنے اور کمر کو چھونے کی حد تک لمبے۔انٹر سائنس میں تھی ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھ رہی تھی جس کے مجھے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔میرا بس چلتا تو میں اسے اپنی بھابھی بنالیتی مگر یہ ناممکن تھا۔

اس دن لابی میں سے گزرتے ہوئے دیکھا سارہ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے، نوک کر کے اندر چلی گئی۔سارہ مجھے دیکھ کر ایک دم کھڑی ہوگئی۔۔۔ بھابھی آپ! آیئے بیٹھئے۔متحیرانا لہجے میں بولی۔اس کے ہاتھ میں کتاب تھی جیسے ہی وہ کھڑی ہوئی ایک تصویر کتاب سے نیچے گر گئی۔میں نے جھک کر اٹھالی۔

''لڑکے کی تصویر''میں نے دل ہی دل میں سوچا، بڑی حیرانی ہوئی۔

''یہ تصویر۔۔۔''میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

سارہ گھبرا سی گئی پھر بولی ''یہ میری دوست کے بھائی کی ہے، غلطی سے اس نے کتاب میں رکھ دی ہوگی۔''

میں اس کے بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گئی اور پیار سے بولی۔

''یہ تصویر تو صمد کی ہے، ابھی چند دن پہلے ہی گھر آیا تھا۔سب اس

سے اس طرح گھل مل کر بات کر رہے تھے جیسے وہ گھر کا ہی ایک فرد ہو۔" میں تصویر کو پہچان چکی تھی۔

پھر سارہ نے بتایا "میں، صمد اور صمد کی بہن ثنا ہم تینوں نے ایک ہی سکول میں پڑھا ہے۔ صمد مجھ سے اور ثنا سے دو کلاس آگے تھا۔ وہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا بیٹا ہے۔ آٹھویں کلاس سے بابا سائیں کے آفس کے کاموں میں ان کی مدد کرتا ہے۔ اکثر سکول سے سیدھا گھر آ جاتا تھا اور پھر رات میں اپنے گھر جاتا تھا۔ ہم لوگ کب بڑے ہو گئے، کب ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔۔۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ بابا سائیں اور گھر کے سب لوگ اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ بابا سائیں کی اجازت سے یہ کمپیوٹر انجینئرنگ کر رہا ہے حیدر آباد جا کر۔ یہ اس کا دوسرا سال ہے۔ ہم دونوں ایسا خواب دیکھ رہے ہیں جو ناممکن ہے۔ صمد کہتا ہے کہ "اگر تم سے میری شادی نہیں ہوئی تو میں تمام زندگی شادی نہیں کروں گا۔" سارہ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ میں نے وعدے کے مطابق اپنی زبان بند رکھی ہوئی تھی۔

دو ہفتے سے گھر میں ایسی فضا لگتی تھی جیسے کچھ زبردست ہونے والا ہے اچھا یا برا۔۔۔ تایا سائیں بار بار آ رہے تھے، کبھی بی بی ساتھ ہوتیں، کبھی تائی جی اور کبھی تینوں۔۔۔ پھر ایک دن کافی لمبی بیٹھک ہوئی سبھی لوگ اس میں شامل تھے سوائے سارہ کے۔ تایا سائیں نے اعلان کیا "مارچ کی پندرہ تاریخ کو ہم برات لے کر آئیں گے۔"

میرے منہ سے نکلنے ہی والا تھا "کس کی برات" مگر مجھے احمد کی نصیحت یاد آ گئی۔ "تمہیں کسی معاملے میں نہیں بولنا ہے۔" اس کے متعلق ساری باتیں بھی طے ہو گئیں۔ طے کیا ہو گئیں بس تایا سائیں جو بھی بول رہے تھے سب خاموشی سے مان رہے تھے۔ مگر میری سمجھ میں پھر بھی نہیں آیا کہ کس کے متعلق ہو رہا ہے۔ بعد میں احمد نے بتایا سارہ کی شادی تایا سائیں کے بیٹے ہاشم سے ہو رہی ہے۔

"ہاشم سے۔۔۔" میں نے حیرانی سے دوہرایا۔

احمد خاموش رہے۔ میں نے کہا۔

"احمد کیا ہو گیا ہے آپ سب لوگوں کو۔ ہاشم سات آٹھ سال کا ہے اس کی سارہ کے ساتھ شادی کس طرح ہو سکتی ہے۔"

"نازیہ پلیز! اس معاملے میں جب میں خاموش ہوں تو تم بھی خاموش رہو۔ یہ خاندان کے بڑوں کے فیصلے ہیں۔" احمد نے مجھ سے التجائی انداز میں کہا۔

جب سارہ کو پتہ چلا تو اس نے بہت ہنگامہ کیا۔۔۔ وہ کسی صورت راضی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بابا سائیں نے اس سے اکیلے میں بات کی۔ اتفاق کی بات دونوں باپ بیٹیوں کی اس بات چیت کو میرے کانوں نے بھی سن لیا۔

"بیٹی سارہ مجھے بھی پسند نہیں کہ ہاشم سے تمہاری شادی ہو۔ لیکن فرض کرو اگر تمہیں "کاروکاری" کا جھوٹا الزام لگا کر قتل کر دیا جائے؟ تو تم بھی بے قصور ماری جاؤ گی اور جو شخص تمہارے ساتھ مارا جائے گا وہ بھی بے قصور مارا جائے گا اور بدنامی کتنی زبردست ہوگی۔ جو جرم تم نے کیا ہی نہیں اس کی سزا نہ صرف تم کو بلکہ ہم سب کو ملے گی۔ بس یہی سب سوچ کر میں نے "ہاں" کر دی ہے۔"

چند لمحوں کے لیے ایسا سناٹا چھا گیا جیسے "موت" کا ہوتا ہے۔

میرے اندر کسی نے کہا "یہ کارا کاری، کاروکاری اس معاملے میں کہاں سے آ دھمکی۔" پھر میرے اندر ہی کسی نے جواب دیا "اس ملک میں سب کچھ ممکن ہے۔ کبھی کسی نہر کے ریگولیٹر میں پھنسے ہوئے بے جان جسد کو نہیں دیکھا۔۔۔؟ محبت کرنے والے پر گولیوں کی بوچھاڑ یا دونوں کو زندہ جلائے جانے کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔۔۔؟ آج دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے لیکن قبائلی کلچر ہماری زمین میں مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے ہے۔ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔"

"تایا سائیں کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ایک ہفتے پہلے سے ہی شادی کے رسم و رواج شروع ہو گئے تھے۔ تایا سائیں نے کسی چیز میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی۔ پورے گاؤں میں ایک ہفتے پہلے سے چراغاں تھا۔ ناچ، گانا، ڈھول باجے، دھوم دھڑکا۔۔۔ بھنگڑا شنگڑا۔۔۔ سب کچھ۔۔۔"

اسی شور شرابے میں اچانک ایک ایسی خبر گشت کرنے لگی "سارہ غائب ہے" قریبی کنوئیں میں وہ پائی نہیں گئی۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اس نے کنوئیں میں چھلانگ نہیں لگائی۔ میرا ذہن فوری طور پر صمد کی جانب گیا لیکن میری زبان خاموش رہی۔ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں کیونکہ میں ابھی تک سسرال میں "باہر والی" تھی کیونکہ نہ تو ان کی ہم کلچر تھی اور نہ ہی ہم لسان۔۔۔ کوئی اور بھی صمد کے بارے میں کچھ بھی سوچ نہیں رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس کا امریکہ میں ایڈمیشن ہو گیا ہے اور وہ امریکہ جانے کے انتظامات میں لگا ہوا ہے۔ سارہ کی تلاش جاری تھی لیکن اس کو تو جیسے زمین نگل گئی تھی یا پھر آسمان نے اوپر اٹھا لیا تھا۔

تیسرے دن صمد کا نام لیا جانے لگا۔ صمد کے گھر پتہ چلانے سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک ہفتے سے اسلام آباد گیا ہوا ہے امریکہ جانے کے سلسلے میں۔ دو ایک روز بعد یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ سارہ صمد کے ساتھ ہے اور دونوں نے نکاح کر لیا ہے۔ دونوں روپوش ہیں۔

اس افواہ کے نتیجے میں قدیمی قبائلی کلچر کے رکھوالے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں کو مارنے، غرقِ دریا کرنے یا نذرِ آتش کرنے کے لیے۔۔۔ جتنی جلدی ہو سکے۔۔۔ سارہ کے بابا اور ماں کی قرآن شریف پر حلف اٹھا کر جان بخشی کر دی گئی۔

جلدی تو کیا وہ تاخیر سے بھی اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ صمد اور سارہ کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

مہینوں بعد یہ خبر عام ہوئی کہ صمد اور سارہ امریکہ میں پناہ گزیں کی حیثیت سے مقیم ہیں اور شہریت کے لیے ان کی درخواست ضروری مراحل سے گزر رہی ہے۔

میرے اندر کسی نے کہا کہ صمد اور سارہ نے ایک مردہ کلچر کی کہنہ دیوار میں رخنہ ڈال دیا ہے اور صمد ہیں۔۔۔ اور سارہ ہیں۔۔۔ دیوار گرا چاہتی ہے۔۔۔ میں دیکھوں گی۔۔۔ تم دیکھو گے۔۔۔ ہم دیکھیں گے۔

گھروندے انا کے

فیروز عالم
(کیلی فورنیا)

کل پھر شدید برفباری ہوئی ہے، تمام شہر نے ملائم روئی جیسی برف کی چادر اوڑھ لی ہے۔ درخت کی ٹنڈ منڈ شاخوں پر جمی برف ایسی لگتی ہے جیسے یہ شاخیں شیشے کی بنی ہوں۔ عام طور پر تو میں اس موسم سے بہت لطف ہوتی ہوں اور خاص طور سے کھڑکی کے پار برف میں لپٹے ہوئے درخت مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں مگر آج۔ آج میرا دل بیقرار ہے ایک فکر اور ایک تشویش لاحق ہے جس نے اس نظارے کو میرے لئے بے لطف بنا دیا ہے، مجھے بھابی نے بتایا ہے وہ آ رہا ہے۔ وہ جسے میں بھلا چکی تھی، پھر سوچتی ہوں اتنے سالوں کے بعد اسے کیا سوجھی تھی کہ وہ یہاں آئے۔ میری اور اسکی داستان تو ایک بھولی بسری داستان ہو چکی ہے، وہ کیا میرے خیال میں تو اس داستان کے تقریباً سارے ہی کردار نہ صرف اسے بھول گئے ہونگے بلکہ اب تو بہت سے اس دنیا سے سدھار بھی چکے ہونگے۔

چالیس سال بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تو میرے ذہن میں اسکے خدوخال بھی مدھم ہو چکے ہیں۔ پھر اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ یہاں آئے۔ سنا ہے اسکا پوتا یونی ورسٹی آف شکاگو سے فارغ التحصیل ہو رہا ہے اور وہ اسی تقریب میں شرکت کے لئے یہاں آ رہا ہے۔ مگر مجھے کیا، اگر آ بھی رہا ہے تو آئے اور شرکت کے بعد واپس پاکستان چلا جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ بچپن سے میرے بھائیجان اور اس میں اتنی قریبی دوستی تھی کہ یہ ناممکن ہے کہ وہ اس شہر میں آئے اور بھائی جان اس کو ایک شام گھر پر مدعو نہ کریں۔ کیسے کرونگی اسکا سامنا، کیا میں اپنا وقار، اپنی تمکنت اور اپنی انا برقرار رکھ سکونگی۔

شاہد، کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی، کیوں تم اس پرسکون جھیل میں پتھر پھینکنے کے لئے آ دھمکے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے پرسکون ہونے میں دو چار سال نہیں کئی دہائیاں لگی ہیں مگر شاید تمہیں تو اسکا کبھی احساس ہی نہیں تھا کہ دوسروں کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ آج بھی شاید مہمانوں کی اس بھیڑ میں، جب تم شام کے کھانے پر ہمارے یہاں آؤ گے تو میں تو تمہارے لئے قابل توجہ نہیں ہونگی، راستے کا ایک بے قیمت پتھر جسے تم سالوں پہلے ٹھکرا کر آگے بڑھ گئے تھے۔

ایسے لمحات میں گزرے وقت پر نظر ڈالتی ہوں تو سوچتی ہوں کتنا وقت گذر گیا، اب تو زندگی کی شام ہے، اتنا لمبا سفر میں نے تنہا کیسے کاٹ لیا، شاید ماضی کو کریدنے سے اب کچھ حاصل نہیں مگر ایسا لگتا ہے کہ میرے دل کے تہہ خانے میں، کسی چھپے ہوئے تاریک گوشے میں اب بھی ایک آگ سی سلگ رہی ہے جس کی تپش رفتہ رفتہ میرے وجود کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

شاہد، میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کیا کبھی تمہیں بھی میرا خیال آتا ہوگا۔ زندگی کہ اس مقام پر جب ہمارے درمیان ان گنت ماہ وسال کے فاصلے حائل ہو چکے ہیں اور ایک طویل عرصے سے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں ہے، کیا کبھی تم بھی گزرے وقت کو سوچتے ہوگے، کبھی رات کی تنہائیوں میں، کبھی رم جھم برستی بارش میں، کبھی دھندآلود شاموں میں۔۔ تمہیں وہ وقت یاد نہیں آتا، ایک دفعہ بھی نہیں جو ہم نے ساتھ گذارا تھا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں زندگی کے آخری دور میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں، جو میں کبھی تمہیں نہ سنا سکی، محبت کی ادھوری کہانی!!

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اب نہ تو اسکا موقعہ ہے نہ ہی یہ ممکن کہ میں اس ادھوری کہانی کو تمہیں بزبان خود سنا سکوں مگر میں یادوں کی ایک انجمن تو سجا سکتی ہوں جس میں تصور کی آنکھ سے اس وقت کو دوبارہ زندہ کر سکتی ہوں جو میں نے تمہارے ساتھ گذارا تھا۔ شاہد! میں تو تمہاری چاہت میں، تمہارے پیار میں سراپا ڈوبی ہوئی تھی یا پھر مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے چہار طرف محبت کی شبنم برس رہی ہے اور میں اس میں شرابور ہوگئی ہوں، مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ شاید میری ایسی قسمت نہیں کہ میں تمہارے دائمی قرب یا تمہارے وجود کو پا سکوں۔ یوں سمجھو کہ میں تو ایک ایسی دیو داسی کی مانند تھی جو اندھیری رات میں اپنے دیوتا کے قدموں میں دیا جلا کر چپ چاپ الٹے قدموں واپس ہو جاتی ہے اور اس کے دیوتا کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ اسکے پیار میں سلگ رہی ہے۔

شاہد مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب ہم بچے تھے اور تم اپنی امی کے ساتھ چھٹیاں گذارنے ہمارے شہر آتے تھے تو تمہاری ذہانت، چلبلا پن، شرارتیں اور سب سے بڑھ کر تمہاری دلچسپ باتیں یوں تو سبھی غور سے سنا کرتے تھے مگر مانو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے میرے چاروں طرف جادو کا ایک حصار بُن دیا ہے۔ بچپن کے ان دنوں میں میرے اطراف کھینچا ہوا وہ گھیرا کچھ ایسا تھا کہ میں اس میں زندگی بھر کے لئے قید ہو کر رہ گئی اور اس سے باہر نہ نکل سکی۔

وقت آگے بڑھتا رہا اور اسکے ساتھ تمہارے لئے میری پسندیدگی محبت میں بدل گئی ہر سال تمہارے آنے کا انتظار میں عید سے بھی زیادہ بیقراری سے کرتی اور جب تم آ جاتے تو ان دو مہینوں میں میرے لئے دنیا کی ہر کشش، کائنات کی تمام تر خوبصورتی اور زندگی کی تمام تر دلچسپیاں صرف اور صرف تمہاری ذات میں مرکوز ہو کر رہ جاتیں۔ اتفاق سے ہمارا ذوق بھی مشترک تھا ہم گھنٹوں اردو شاعری پر باتیں کرتے، اپنے پسندیدہ شاعروں اور انکے کلام پر بحث کرتے یا کسی نئے شائع ہونے والے ناول پر تبصرہ کرتے۔ ایسے میں ہمارے ہم عمر ساتھی اس خشک گفتگو سے تنگ آ کر ہمیں تنہا چھوڑ دیتے لیکن میں تمہارے بولنے کے انداز، تمہاری آنکھوں میں چمکنے والی ذہانت اور ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ کو محو ہو کر دیکھا کرتی اور جیسے ان میں ڈوب جاتی۔ ایسے میں بارش پڑنا شروع ہو جاتی اور بارش کے قطرے قریب ہی رکھے گملوں میں رکھے پام کے پتوں پر ٹپ ٹپ کی

جلترنگ بجانے لگتے۔فضا میں ایک دھند چھانے لگتی اور میں خوابوں میں کھو جاتی، یہ جاگتی آنکھوں کے خواب تھے۔مجھے ایسا لگتا کہ تم میرا ہاتھ تھامے رنگین دھنک کی شاہراہ پر مستقبل کی جنت کی طرف لئے جا رہے ہو، ہماری اپنی جنت جہاں ہم اپنے ہاتھوں سے موتیوں کا محل بنائینگے۔

اپنے نہایت معمولی سماجی اور معاشی پس منظر کی وجہ سے تمہارے اندر ترقی کی ایک آگ بھڑک رہی تھی، تم ترقی کی اونچی منزلوں کو چھونا چاہتے تھے اور شاید اسی جذبے کی وجہ سے تم نے صوبے بھر میں اول آکر انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔اب تم میں کچھ پختگی آ گئی تھی اور تم ادھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ، بہت خوش دلی سے مجھ سے اپنے مستقبل کا تصور اور اپنے ہونے والے جیون ساتھی کا خیالی پیکر بھی بیان کرنے لگے تھے،شاہد! جب تم ایک خاص افسانوی انداز سے اپنے خیالی محبوب کا خاکہ میرے سامنے کھینچتے تو میں اندر سے لرز جاتی۔میں سوچتی، یااللہ ان خوبیوں میں سے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔تم جس طرح کے چہرے آنکھوں، ہونٹوں اور رنگ وروپ کا تذکرہ کرتے میں تو اسکا پرتو بھی نہ تھی۔میری بدقسمتی تو یہ تھی کہ خدا نے مجھے ایک شفاف دل، بیدار ذہن اور نہایت اعلیٰ ذوق دیا تھا مگر میں ظاہری شکل وصورت میں بالکل عام بلکہ عام سے بھی کمتر لڑکی تھی۔یوں تو میرے سارے بہن بھائی سانولے تھے مگر میں تو کھل کر پختہ رنگ بلکہ کالوں میں شمار ہوتی تھی۔اسکے علاوہ چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔جب تم میرے سامنے بیٹھ کر لمبی لمبی مخروطی انگلیوں کا تذکرہ کرتے تو میں اپنی چھوٹی چھوٹی گاز انگلیوں کو دیکھ کر جلدی سے انہیں اپنے دوپٹے میں چھپا لیتی تھی۔جب تم ایسی بادامی آنکھوں کا ذکر چھیڑتے جنکی گھنی پلکوں کے اٹھنے جھکنے سے صبح وشام کے اوقات مشروط ہوتے تو میں گھبرا کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے بارے میں سوچتی جو چشمے کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اور زیادہ چھوٹی لگنے لگتی تھیں۔مگر میری امیدیں اس لئے ٹوٹنے نہ پاتیں کہ تم ہمیشہ کہتے تھے کہ شانو زندگی کو کامیاب اور پُرمسرت طریقے سے گزارنے کے لئے ذہنی یگانگت اور ذوق کا ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے۔مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میری کسی بات، یا کسی شعر کی تشریح پر جھوم کر کہتے، ذکو واللہ تم جس انداز سے شاعر کے کلام کی روح کو سمجھتی ہو شاید ہی کوئی اور سمجھتا ہوگا۔بھئی تمہارے ساتھ تو گفتگو کر کے لطف ہی آ جاتا ہے۔

اس اثنا میں تم نے انجینئرنگ پاس کر لی تھی۔تمہیں بہت اچھی اور باوقار ملازمت مل گئی تھی اور اب تم ہمارے ہی شہر میں کسی دوست کے ساتھ رہ رہے تھے۔مگر پھر بھی ہفتے میں ایک دو بار ضرور ہمارے یہاں ملنے آتے تھے۔امی مجھے بتاتی تھیں کہ کہ اگر میں نہ ہوتی تو تم جلد ہی چلے جاتے۔اگر میں ہوتی تو باغ میں اپنے پسندیدہ گوشے میں دیر تک بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتے۔میں چپ چاپ بیٹھی تمہاری باتیں سنا کرتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی عقیدت کے پھول تمہارے قدموں میں رکھتی جاتی۔میرے سب بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی، میں نے امی سے سختی سے کہہ دیا تھا کہ میں ایم اے سے پہلے شادی کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتی مگر حقیقت میں، دل ہی دل میں اس لمحے کا انتظار کر رہی تھی جب تمہاری جانب سے مجھے زندگی کا پیغام ملے گا۔

ایک رات جب اپنی میکے واپس آئی ہوئی تھیں انہوں نے مجھ سے کہا تم کیوں شاہد کا انتظار کر رہی ہو۔تمہیں معلوم ہے کہ اس کے ذہن میں شریک حیات کا جو تصور ہے وہ تم نہیں ہو۔میں نے اپی کو ٹال دیا۔میرے ذہن میں بھی یہ وسوسے اٹھتے تھے مگر پھر مجھے خیال آتا تھا کہ تم نے بارہا کہا تھا کہ زندگی کے سفر میں ساتھی کے انتخاب میں تمہارے لئے سب سے اہم بات ذہنی یگانگت اور باہمی ہم آہنگی ہے۔اور یہ کہ دونوں کے خیالات کا مشترک ہونا بہت ضروری ہے۔انہی دنوں میرے ایم اے پاس کرنے کی خوشی میں تم نے مجھے ایک خوبصورت کتاب تحفے میں دی جس پر لکھا تھا ''ذکو کے لئے جو مجھے مجھ سے بھی زیادہ جانتی ہے''

شاہد تمہیں نہیں معلوم تمہارے ایسے ہی الفاظ نے مجھے تمہاری محبت، تمہاری پرستش اور تمہارے ساتھ ایسے بندھن میں باندھ دیا تھا کہ اگر میں چاہتی بھی تو اسے کبھی بھی توڑ نہیں سکتی تھی پھر اچانک ہر چیز الٹ پلٹ گئی، جیسے میری زندگی میں ایک زلزلہ آ گیا۔میں نے سنا کہ تمہارے لئے شہر کی سب سے حسین لڑکی، کسی حور پری کی تلاش شروع ہو گئی ہے بلکہ ظلم یہ کہ جب بھی تم ہمارے یہاں آتے تو میری موجودگی میں یہ روداد سناتے کہ کیسی حسین لڑکیوں کو دیکھا ہے اور کس کس طرح انہیں رد کیا جا چکا ہے۔میں تمہاری اس بے حسی پر خون کے آنسو روتی تھی۔در اصل ان دنوں تم اپنی کامیابی کے ایسے غرور میں چور تھے کہ ہر شخص تمہیں کمتر اور ہیچ نظر آتا تھا۔میری تو جیسے ساری کائنات ہی متزلزل ہو گئی تھی۔

ایک دن تم آئے، میں فوارے کے پاس بیٹھی تھی، یہ تمہاری پسندیدہ جگہ تھی جہاں ہم نے گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کی تھیں۔پس منظر میں فوارے کا پانی جلترنگ بجا رہا تھا، قریب ہی لگی رات کی رانی میں کھلے پھول اپنی جوبن پر تھے اور فضا ایک ٹھنڈی اور میٹھی خوشبو سے بوجھل تھی، تم نے بیٹھتے ہی کسی نئی کتاب کا ذکر چھیڑا۔میرا دل اس میں نہیں لگ رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے دل میں ایک آبلا سا پڑ گیا ہے جو پھوٹنے کے لئے بیقرار ہو۔میں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ تمہارے ہاتھ پر رکھ دیا اور تمہاری جانب ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے لڑکھڑائی زبان سے کہا ''شاہد یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے، کیا تم مجھے بھول گئے ہو، کیا تمہیں میرے دل میرے جذبات کا کوئی خیال نہیں؟'' تم نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گئے پھر مجھ سے کہنے لگے ارے ذکو مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی، تم نے وہ کچھ سمجھ لیا جو میرا مطلب نہ تھا۔مگر ذکو میں تو ہر دفعہ کھل کر تم سے اپنے آئیڈیلز اور مستقبل کے خواب شئر کرتا رہا تھا، ایک اچھے دوست کی طرح بچپن کے ساتھی کی طرح۔۔۔جس سے میں ہر بات بے تکلفی سے شیئر کر سکتا تھا۔۔۔میں سن ہو کر رہ گئی۔تم سچ ہی تو کہہ رہے تھے، کبھی آج تک تم نے براہ راست مجھ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔مگر شاہد خود ہی سوچو کیا محبت کے

لئے الفاظ یا براہ راست اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔کیا جذبات کی کوئی زبان نہیں ہوتی یا آنکھیں دل کی کہانی بیان نہیں کرتیں۔میرے لئے اب کہنے کو رہ ہی کیا گیا تھا، بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی اور مسہری پر گر کر بلک بلک ررونے لگی۔

اس کے بعد میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا، پھر سنا تم سمندر پار چلے گئے، دوڈھائی سال میں ایک آدھ بار واپس آتے تھے۔تمہارے لئے ایک ایسی لڑکی کی تلاش جاری تھی جسکا شاید کوئی وجود ہی نہ تھا شاید ابھی قدرت نے ایسی کوئی لڑکی تخلیق ہی نہیں کی تھی جو تمہارے جمالیاتی معیار پر پوری اترتی۔اس وقت تک ہمارے گھرانوں میں اسقدر دوری ہو چکی تھی کہ تم ہمارے یہاں ملنے بھی نہیں آتے تھے ادھر امی کی ضد کے باوجود میں نے ہمیشہ کیلئے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور محلے کے اسکول میں ٹیچر ہو گئی تھی اور اپنی موجودہ بے کیف زندگی سے مکمل طور پو سمجھوتہ کر لیا تھا لیکن شاید قدرت کے لئے میری آخری آزمائش باقی تھی۔ایک دن میں اسکول سے واپس آئی تو دیکھا تمہاری امّاں آئی ہوئی ہیں وہ مجھ سے بڑے پیار سے ملیں، امی بھی میری طرف بڑے پیار سے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ان کے جانے کے بعد امی نے کہا ذکو، قدرت کے کام بھی نرالے ہوتے ہیں۔آج میں تمہارے لئے خوشی کی خبر لائی ہوں شاہد کی امی تمہارے لئے شادی کا پیغام لیکر آئی تھیں۔یعنی گزشتہ بارہ سال میں اپنی تلاش سے مایوس ہو کر، اورزندگی کے اس مقام پر جب تم کسی کو پسند کر لیتے ہو تو تمہارے ادھیڑ عمر کی وجہ سے لڑکی والے تمہیں رد کر دیتے اب تم میری جانب پلٹے ہو۔مجھے ایسا لگا کہ جیسے وقت نے ،تم نے میرے منہ پر طمانچہ مارا ہو، جیسے میری عزت کا گھروندا جسے میں نے دنیا سے بچا کر رکھا تھا تم نے اسے ایک ہی ٹھوکر میں چکنا چور کر دیا ہو۔مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔میرا دل چاہا کہ ساری کائنات کو جلا کر بھسم کر دوں۔۔میں نے امی سے چیخ کر کہا ’’نہیں۔۔۔نہیں۔۔نہیں‘‘

زندگی اسی طرح رواں دواں رہی، بس وقت ہی تو کاٹنا تھا، میں اکیلی رہ گئی تھی، میرے بڑے بھائی امریکا کا امیگریشن لے کر شکاگو آ کر بس گئے تھے۔چاہتی تو نہیں تھی مگر میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔

مجھے برفباری کے بعد دوسرے دن طلوع ہوتے سورج کا منظر بہت پسند ہے۔جب اسکی سنہری کرنیں برف پوش درختوں کو جگمگاتی ہیں میں اپنے کمرے کی مشرقی کھڑکی سے اسکا نظارہ کرتی ہوں اور اپنے خیالوں میں ڈوب جاتی ہوں میں اس ابھرتے سورج کے ساتھ اپنی ڈوبتی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں، پھر سوچتی ہوں کہ کہیں میں نے تم سے شادی سے انکار کر کے غلطی تو نہیں کی مگر پھر مجھے اس خیال سے ایک گونہ تسکین ملتی ہے کہ زندگی میں مجھے خوشی تو نہ ملی مگر میں اپنی انا اور اپنی عزت نفس تو بچا لائی۔

بقیہ : جنٹل مین ڈرنکس

پندرہ برس کا کمیشن ختم ہونے کا تقریباً ایک ماہ باقی رہ گیا تھا مگر بڑے صاحب کی سفارش سے مجھے ایک ماہ قبل ہی ریلیز کر دیا گیا۔میں گھر لوٹ آیا۔ہم دونوں خوش تھے مگر یہاں آنے کے بعد مجھے احساس ہونے لگا جیسے میری جنسی قوت ختم ہو گئی ہے۔میں نامرد ہو گیا ہوں، کچھ روز وہ سمجھتی رہی میں سفر سے تھکا ہوا ہوں اس دوران مجھے ڈرائیور کی نوکری بھی مل گئی۔میں صاحب کے ہمراہ ٹور پر بھی جانے لگا۔تو اس کے من میں شک ہونے لگا کہ میں اس کی خواہش کو نظر انداز کر رہا ہوں۔میرا کسی اور عورت سے تعلق ہے۔میں ان باتوں سے بچنے کے لیے شراب پی کر جلد سونے کی کوشش کرنے لگا، بس یہی ہے اور کچھ نہیں۔

میڈم سمجھ گئیں۔وہ بولیں۔

دیکھو شراب تو میں نے بھی دو تین مرتبہ پارٹیوں میں پی ہے مگر مجھے کبھی ہضم نہیں ہوئی۔شراب پینے کو میں جنٹل مین ڈرنک کہوں گی۔مگر آپ کی ایک بات سے میں متفق نہیں ہوں۔

اس کے چہرے پر خوشی آئی اور ندارد ہو گئی۔

محترمہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

مگر آپ کی اس بات سے میں متفق نہیں کہ آپ نامرد ہو گئے ہو۔جب تک کہ کسی ماہر ڈاکٹر نے آپ کو نامرد قرار نہیں دیا، کہ آپ اپنے آپ کو نامرد مان لو۔

اتفاقاً انہیں ایک ماہرِ جنسیات ڈاکٹر کا خیال آیا، انہوں نے ان سے فون پر رابطہ کیا وقت لیا دوسرے دن اس کو لے کر وہ اس ڈاکٹر کے شفاخانہ پہنچیں۔ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کیا اس سے اس حادثے کو تفصیل سے سنا اور کہا۔

نامردانگی ان کا وہم ہے، میں گولیاں لکھ دیتا ہوں دو چار روز میں یہ اپنے آپ کو مرد محسوس کرنے لگیں گے۔

کچھ دنوں کے بعد تارا بائی اور اس کے شوہر کو ہاتھوں میں ہاتھ لیے مسکراتے، باتیں کرتے بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تو میڈم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

نادیدہ خوف

صادقہ نواب سحر

(مہاراشٹر)

جلدی جلدی برقعہ پہن کر اور چہرے پر نقاب لگا کر فائزہ نے جیسے ہی گھر سے باہر قدم رکھا،اس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی۔دو سال کا عدیل اپنے دائیں پیر میں چمکیلا اور چلتے وقت چوں چوں کرتے ہوئے روشنی دینے والا جوتا پہنے ماں کے ساتھ باہر جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔اپنے ننگے پیر سے وہ زمین پر پڑی ہوئی مٹّی کو ادھر ادھر پھیلا کر اس کھیل کا لطف لے رہا تھا۔

''ارے!آپ کا بائیں پیر کا جوتا کہاں گیا؟''

''گر گیا۔''عدیل نے پلکیں جھپکائیں۔

''اندر گرا دیا؟اُف!ایک تو دیر ہو رہی ہے۔اس پر...''فائزہ کو اس کی معصومیت پر پیار بھی آرہا تھا اور چڑ بھی۔وہ بڑبڑا کر دروازے پر پڑے تالے کو ہاتھ لگا کر بولی،''جوتا اندر چھوڑ آئے بابو!''

''نہیں،اسکوٹر پر پھینک دیا۔''

''اسکوٹر پر کیوں پھینکا؟''

''اسکوٹر گندا ہے۔چھی!''

''اسکوٹر بد رنگ اور ٹوٹا پھوٹا ہے!! بڑا آیا نزاکت والا! جیب تو فضول چیزوں سے بھری رہتی ہے۔''

گرنار اپارٹمینٹ کے پیچھے کسی کا خالی پلاٹ پڑا ہوا تھا۔جس میں اب گیراج کا کام ہوتا تھا۔درختوں کی ٹہنیوں میں ٹائر لٹکے ہوئے ہوتے تھے۔ایک پھٹا پرانا صوفہ سیٹ اور پلاسٹک بھی پڑی ہوئی تھی۔یہاں سے دن بھر اسکوٹر اور موٹر سائکلیں مرمت کرنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔فائزہ کو یہ آوازیں پسند نہیں تھیں مگر ہال کی یہ بالکنی عدیل کو بہت پسند تھی۔اکثر اپنے کھلونوں کے ساتھ یہاں بیٹھا رہتا تھا۔سامان بھی گراتا رہتا۔

فائزہ نے جھٹ عدیل کے دائیں پیر کا اکلوتا جوتا دروازے کے ساتھ لگے شُو رَیک پر پھینک دیا،ریک میں رکھا ہوا ایک جوڑی جوتا ہاتھ میں اٹھا لیا اور عدیل کو گود میں اٹھا کر لفٹ کی جانب لپکی۔

''سنو بیٹا۔''ایک بوڑھی آواز نے فائزہ کو پلٹنے پر مجبور کیا،''بیٹا ذرا ایک فون لگا دو۔''

فائزہ کا پہلے منزلے پر دوسرا فلیٹ تھا۔پہلے فلیٹ کے مکینوں نے فائزہ کے گھر کی دیوار تک لوہے کی گرِل لگالی تھی۔اس طرح یہ لوگ رات کو تالا لگا کر اپنے گھر کی حفاظت کا بندوبست بھی کر لیتے تھے۔ان کے فلیٹ کے سامنے کی دیوار بھی لوہے کے جنگلے سے محفوظ تھی۔

''سنو بیٹا۔''خاتون نے دوبارہ آواز دی۔

''آپ؟''

''میں اس گھر کے مالک کی ماں ہوں۔''فائزہ نے پچھلے تین برسوں میں پہلی بار اس درمیانی مانگ،کھچڑی بال،گلابی ہونٹ،معمولی قد و قامت اور گورے رنگ کی بزرگ خاتون کو دیکھا تھا۔اس کے کان زیور سے خالی تھے مگر وہ کلائیوں میں سونے کی ایک ایک چوڑی پہنے ہوئے تھی۔اس کا لباس سیدھا سادہ تھا۔وہ پنجابیوں کے انداز میں سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی،جس پر ہلکے بھورے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے تھے۔اسے بغور دیکھتے ہوئے خاتون نے سر پر پڑے دوپٹے کو کانوں کے پیچھے اڑس لیا،دوپٹے کا ایک پلہ سر کے پچھلے حصے میں ڈال کر سینے کو ڈھکتا ہوا دوسرا پلہ بائیں کندھے سے پیٹھ کے پیچھے ٹھیک کیا۔اس کا چھرّ یوں بھرا جسم اس کے کم از کم پچاسی سال کا ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔فائزہ نے اب تک تو اس گھر کے ریٹائرڈ تحصیلدار،ان کی بیوی،ان کے ایک بیٹے،ایک بٹیا اور اُن کے پریوار کو ہی دیکھا تھا۔

''بیٹا،ذرا ایک نمبر لگا دو۔''

''سب کہاں ہیں؟''فائزہ نے پوچھا۔

''پوتڑ بہو بچے کے پیدائش کے سلسلے میں یہاں آئی تھی۔وہ بچے کو لے کر دوبئی لوٹ رہی ہے۔وہ سب انھیں ایئر پورٹ چھوڑنے گئے ہیں۔''

''آپ گھر میں اکیلی ہیں؟''

''اب تک کام والی تھی۔اب وہ پڑوس کی گلی میں میری چھوٹی بہو کے گھر کام کرنے گئی ہے۔بیٹے کی بہو جا رہی تھی اس لیے میں یہاں آگئی تھی۔میں یہاں نہیں رہتی۔چھوٹی بہو کے گھر رہتی ہوں۔''

''بہو کا یا بیٹے کا گھر؟''

وہ چپ رہی۔

''یہ میری چھوٹی بہو کا نمبر ہے۔''وہ فائزہ کو ایک پیپر دیتے ہوئے بولی،''اس کو بولو کہ کام والی سے کام ہو جائے تو بائی کو میرے پاس بھیج دے۔''

فائزہ نے فون ملایا اور کہا،''وہ فون اٹھا نہیں رہی ہیں۔''

''اچھا!''بڑی بی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا،''بچوں کو اسکول چھوڑنے گئی ہوگی۔''

''ہو سکتا ہے۔''فائزہ نے بس جواب دے دیا۔

''مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے.....آپ رک سکیں گی کیا؟''اس نے اپنے دوپٹے کے کنارے سے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور اچانک فائزہ سے پوچھا، ''اس منزلے پر کوئی نہیں ہے؟فلیٹ نمبر تین پر تالا پڑا ہے۔''

''اب مجھے جانا ہوگا۔''فائزہ ہمدردی کے چکّر میں کلاس مِس کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''تھوڑا سا ٹھہر جاؤ۔''

''اچھا!''، فائزہ نے ایک لمحہ سوچا، ''اچھا، بس دس منٹ ٹھہر سکتی ہوں۔''

''آؤ بیٹھ جاؤ۔'' پڑوسن نے جھٹ گرل کا گیٹ کھولا اور سامنے پڑی اکلوتی پلاسٹک کی سفید کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

''آپ بیٹھئے۔'' فائزہ جھجکی۔

''میں ایک اور کرسی لے آتی ہوں۔''

''میں لے آؤں؟'' فائزہ کو بڑی بی پر رحم آ رہا تھا۔

''رہنے دو۔ چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

دونوں ہال کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ فائزہ نے نقاب الٹ دیا۔

بڑی بی فلیٹ کے اندر سے ایک ہوا بند ڈبہ لے آئی اور اس میں سے چار نائس بسکٹس نکال کر عدیل کے ہاتھ میں تھما دئے۔ بچہ جلدی سے ماں کی گود سے اتر گیا اور وہیں ایک گوشے میں بیٹھ کر وہاں پڑے ہوئے کھلونوں سے کھیلنے لگا۔

''گیارہ بج کر دس منٹ!'' فائزہ نے اپنے موبائل میں وقت دیکھ کر پڑوسن کی جانب نظر ڈالی۔

''میں بارہ بجے تک لوٹ آؤں گی۔''

''کہاں جاؤ گی؟''

''میرا قرآن فہمی کا کلاس ہے۔'' بڑی بی چپ ہو گئی۔

''شاباش! جیتی رہو! قرآن کو سمجھ کر پڑھنا تو بڑی اچھی بات ہے۔ بلکہ ہمیں اسے اپنی زندگی میں اتارنا چاہیے۔''

''جی۔ میں چلوں؟''

بڑی بی کے چہرے پر مایوسی کی لہریں تھیں۔

''ایک کام کرتے ہیں۔ تحصیلدار صاحب کو فون لگاتے ہیں۔'' فائزہ نے مشورہ دیا۔

''میرے خیال سے وہ لوگ پہنچتے ہی ہوں گے۔'' وہ ٹیلی فون ڈائری میں بیٹے کے نام کا صفحہ نکالنے لگیں۔

''یہ نمبر ہے میرے بیٹے کا۔'' وہ اطمینان سے بولیں۔

فائزہ اپنے موبائل پر لگاتار تحصیلدار صاحب کا نمبر لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تین بار لگایا۔ تینوں بار 'نو ریپلائی' آیا ہے۔ شاید وہ اجنبی نمبر اٹھاتے نہ ہوں!'' فائزہ کی بات سن کر بڑی بی زبردستی مسکرائیں۔

''گھر کا لینڈ لائن نمبر بند کروا دیا ہے۔ آج کل سب کے ہاتھوں میں موبائل فون ہیں نا!''

''آپ کے پاس موبائل ہوگا!'' فائزہ نے پوچھا۔

''ہاں میرے پاس ہے نا! چارج کرنے کے لئے رکھا ہوا ہے۔''

''خلافِ توقع جواب ملا۔

''ایسا کیجیے، آپ اپنے نمبر سے لگائیے۔''

وہ صوفے کے پیچھے کھڑکی کا پردہ سرکا کر اپنا موبائل اٹھا لائی اور نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگی۔

''فون نہیں لگ رہا ہے بیٹا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اپنے فون سے نمبر لگانے کی دوبارہ کوشش کرتی ہوں۔'' فائزہ نے کوشش جاری رکھی کہ اتنے میں ایک فون آ گیا۔

''آپ کون؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے بیٹے کا فون!'' بڑی بی نے بچوں جیسی خوشی کے ساتھ کہا۔

''جی جی'' فائزہ نے فون بڑی بی کی طرف بڑھا دیا۔

''ہاں بیٹا! میں بول رہی ہوں، امّاں! بہو چلی گئی کیا؟.....جاتے وقت میں اس کو کچھ دینا بھول گئی تھی۔ میری طرف سے اس کے بابو کو دو سو روپے دے دینا۔''

فائزہ کے موبائل سے باتیں کرتے کرتے بڑی بی فلیٹ کے دروازے کے باہر گرل تک پہنچ گئی۔

''سنو بیٹا! مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ گھر میں پڑوسن بیٹھی ہے۔ میں باہر آ کر بات کر رہی ہوں۔'' خاتون نے کہا۔

دو منٹ بعد لوٹ کر خاتون نے فائزہ کو اس کا موبائل لوٹا دیا۔ فائزہ نے موبائل بیگ میں رکھا۔ بچے کے ہاتھ کے کھلونے دوبارہ ان کی جگہ رکھ دیے، بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اور بولی: ''سوا گیارہ بج چکے ہیں۔ مجھے جانا ہوگا۔''

''دیر ہو گئی! جاؤ جاؤ۔ شکریہ۔'' بڑی بی نے فون لوٹاتے ہوئے کہا۔

فائزہ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھی۔

''تم تھوڑا رک نہیں سکتیں کیا بیٹا؟'' پیچھے سے خاتون کی آواز لگائی۔

''نہیں اب میں نہیں رک پاؤں گی۔'' فائزہ نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

وہ خاموشی سے نیچے اتر آئی۔ اپارٹمینٹس کے کمپاؤنڈ سے روڈ کے بائیں طرف مڑنے تک گرل کی جالی سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اسے بے چین کر رہی تھیں۔ فائزہ کے فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

''میں تحصیلدار صاحب کی بیوی بول رہی ہوں۔ ذرا امّاں سے بات کرائیے۔''

''معاف کیجیے۔ میں بلڈنگ سے باہر آ چکی ہوں بلکہ گلی سے باہر رویندر بھارتی اسکول سے بھی آگے نکل چکی ہوں۔'' فائزہ نے جھٹ کہا۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔''

مجھے کلاس کے لئے لیٹ ہو رہا تھا۔

''ہم تھوڑی دیر میں گھر پہنچ رہے ہیں۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں

لگیں گے۔''

''میں اب تک ان کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔''

''دراصل میری دیورانی بچوں کو ٹفن دینے چلی گئی تھی۔ اچھا اللہ حافظ۔ جزاک اللہ خیر۔''

فون بند کر کے فائزہ نے کندھے اچکائے اور اپنے آپ سے بولی، ''مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہیں؟ پتہ نہیں!''

کلاس اٹینڈ کر کے فائزہ ساڑھے بارہ بجے گھر لوٹی۔ عدیل کو پاس کھڑا کر کے تالہ کھولتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے جائزہ لیا۔ پڑوس کے گھر میں چہل پہل تھی۔ گرل کی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ گرل کے پیچھے سے دو شفیق آنکھیں جھانکتی سی محسوس ہوئیں۔ جیسے شکریہ ادا کر رہی ہوں۔

سردی بڑھ رہی تھی۔ عدیل نے اپنے نئے تیز اور نوکیلے دانتوں سے سویٹر میں جگہ جگہ سوراخ کر دیے تھے۔ فائزہ نے شوہر سے سویٹر کے لیے اون کے گولے منگوائے تھے۔

'' تم ایسا کرو کہ جلدی سے نیچے اتر کر اون لے جاؤ۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' شوہر کا فون آتے ہی فائزہ جلدی سے بلڈنگ سے نیچے اتر آئی۔

''امی! گارڈن!'' عدیل نے ماں کی گود سے آواز لگائی۔ باپ کو عدیل پر پیار آیا بولے، ''بیٹا، مجھے ایک فارین کلائینٹ سے ملنے جانا ہے۔ فائزہ تم چلی جاؤ۔ میں تمھیں نہرو گارڈن پر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ رکشا سے لوٹ جانا۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔''

فائزہ کار میں بیٹھ گئی۔

''اچھا سنو!'' شوہر نے ذرا رک کر کہا، میں ہی چھ بجے گارڈن سے تم دونوں کو لے لوں گا۔ ''رکشہ سے مت لوٹنا۔''

''بیٹا!'' واپسی میں لفٹ سے نکلتے ہی فائزہ کو بڑی بی کی آواز سنائی دی۔ اس نے جھٹ دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

پڑوسیوں کے سیفٹی ڈور پر تالہ تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے شوہر سے پوچھا، ''تحصیلدار صاحب کی ماں دکھائی نہیں دیتیں نا!''

''ارے میں تمھیں بتانا بھول گیا۔ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون''، فائزہ نے جھرجھری لی، ''کب ہوا یہ؟''

''اپنی بلڈنگ کے واٹس ایپ گروپ پر خبر تھی۔ آج چوتھا دن ہے۔''

''پڑوس میں میت ہوئی۔ خبر نہیں ہوئی!!''

''انتقال ان کے اپنے گھر میں ہوا تھا۔''

''اپنا گھر!''

''ہاں وہ اپنے گھر میں چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔''

''آج چوتھا دن ہے! یعنی انتقال اسی دن جب وہ مجھ سے ملی تھیں!!''، وہ لرز گئی تھی، ''اسی لیے وہ اتنی بے چین تھیں۔''

''تحصیلدار صاحب کے گھر پُرسے کے لیے جانا چاہیے۔'' شوہر نے کہا۔

''ضرور ہو آیئے۔'' فائزہ بولی۔

''نہیں، تم بھی چلنا۔''

''او کے'' شوہر نے فائزہ کی لرزتی آواز کو محسوس کیا۔

پڑوسیوں کے سیفٹی ڈور پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ایک ہفتہ بعد شوہر نے پڑوسیوں کا سیفٹی ڈور کھلا دیکھ کر پوچھا، ''چلیں ان کے گھر؟''

''نہیں رہنے دیجیے۔'' فائزہ نے کہا۔

''کیوں؟''

''مجھے وہ گرل اچھی نہیں لگتی۔'' فائزہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔

''پینٹنگ کروانے کو کہوں؟'' شوہر بادلِ ناخواستہ مسکرائے۔

''وہ بات نہیں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''......'' شوہر خاموش تھا مگر اس کی نگاہیں منتظر تھیں۔

''مجھے اس کی جالیوں میں سے بڑی بی کی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔'' فائزہ نے اپنی گھنی پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کے سائے تھے۔

''ایسے نہ کہو۔ تحصیلدار صاحب ابھی مغرب کی نماز سے لوٹے ہیں۔ چلو مل آتے ہیں۔''

وہ بادل ناخواستہ بچے کے بال سنوار کر شوہر کے ساتھ گھر سے باہر نکل آئی۔

پڑوس کے سیفٹی ڈور پر لگی گھنٹی عدیل نے بجادی اور جھٹ باپ کی گود سے نیچے اتر گیا۔

''ارے ارے! کیا کر رہے ہو؟''، باپ نے اسے اپنی جانب کھینچا، ''یہاں آؤ! یہ کچرے سے کیا نکال لیا؟''

''نہیں۔ میرا ہے۔''

''تمہارا کیسے ہو گیا؟''

باپ نے اسے دوبارہ گود میں اٹھاتے ہوئے کہا، ''گھٹیا چیزیں منہ میں لے کر اسے چوستے ہو! پھینکو اسے۔''

تبھی دروازہ کھلا۔

''السلام علیکم تحصیلدار صاحب۔''

''وعلیکم السلام۔ آیئے۔''

''لے لیجیے، دروازے کے باہر پڑا تھا۔ بچے نے اٹھا لیا۔''

''میرا ہے۔'' عدیل نے ہاتھ کھینچ لیا۔

باقی صفحہ ۷۸ پر ملاحظہ کیجیے

''خطِ عنبریں''

قرۃ العین طاہرہ
فارسی سے ترجمہ
تابش دہلوی

گر مجھے حاضری ملے، ''چہرہ بہ چہرہ، رُو بہ رُو''
غم تیرا میں بیاں کروں، ''نکتہ بہ نکتہ، مُو بہ مُو''

دِل میں تری تڑپ لیے، مثلِ صبا میں یوں پھروں
''خانہ بہ خانہ، در بہ در، کوچہ بہ کوچہ، کُو بہ کُو''

تیرے فراق میں مری آنکھوں سے ہے رواں دواں
''دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جُو بہ جُو''

عارِض ولب کے دائرے، تیرے یہ عنبریں خطوط
''غنچہ بہ غنچہ، گُل بہ گُل، لالہ بہ لالہ، بُو بہ بُو''

گھائل کیا مجھے ترے ابرُو نے، چشم و خال نے
''طبع بہ طبع، دِل بہ دِل، مہر بہ مہر، خُو بہ خُو''

دِل نے مرے تجھے بُنا زیست کے دائروں میں یوں
''رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پُو بہ پُو''

دِل میں مرے، مرے صنم کچھ بھی نہیں ترے سوا
''صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تُو بہ تُو''

تجھ پہ مری نظر پڑے، چہرہ بہ چہرہ، رو بہ رو
میں ترا غم بیاں کروں، نکتہ بہ نکتہ، مو بہ مو

میں تری دید کے لئے مثلِ صبا رواں دواں . .
خانہ بہ خانہ، در بہ در، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو

ہجر میں تیرے خونِ دل آنکھ سے ہے مری رواں
دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جو بہ جو

یہ تری تنگئ دہن، یہ خطِ روئے عنبریں
غنچہ بہ غنچہ، گل بہ گل، لالہ بہ لالہ، بو بہ بو

ابرو و چشم و خال نے صید کیا ہے مرغِ دل
طبع بہ طبع، دل بہ دل، مہر بہ مہر، خو بہ خو

تیرے ہی لطفِ خاص نے کردئے جان و دل بہم
رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پو بہ پو

قلب میں طاہرہ کے اب کچھ بھی نہیں ترے سوا
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو

غالب عرفان
(کراچی)

مرے شعور کا سنّاٹا میرے بس میں نہ تھا
اگرچہ دشت کہیں کوئی پیش و پس میں نہ تھا

بس ایک لمحہ تکرار نے دیا دھوکا
گزرتا کوئی بھی لمحہ تو دسترس میں نہ تھا

فضا میں اُڑتے ہوئے لکھ رہا تھا اک تاریخ
پرند جو کبھی تہذیب کے قفس میں نہ تھا

بوقتِ آخر شب سمتِ مشرق اُجلائی
پیام کوئی مگر صبح کے جرس میں نہ تھا

جو شہرِ خوف میں شہزادہ مر گیا اُس پر
اثر نسب کا کسی نبض اور نس میں نہ تھا

ادب میں جس کا اچانک اُبھر گیا ہے نام
شمار اُس کا گزشتہ کسی برس میں نہ تھا

خیال و خوب کے گم گشتہ عہد عرفاؔں میں!
یہ خوشبوؤں کا سفر یوں نفس نفس میں نہ تھا

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

عروقِ خستہ کے دست و پا میں جنوں کا شعلہ ابھارنا ہے
فلک کے تارے سے آج ہم کو کوئی شرارا اُتارنا ہے

ہزار مشکل ہے ایک مشکل بہت ہے آگے ہماری منزل
خدا نے چاہا تو خستہ جاں کو صراط پُل سے گزارنا ہے

اداس شاموں کی الجھنیں ہیں ادھورے کاموں کی الجھنیں ہیں
ابھی ہے کمروں کے فرش باقی ابھی مکاں کو اُسارنا ہے

یہی سلیقہ ہے عاشقی کا یہی قرینہ ہے زندگی کا
سمندروں کی طرح جو ہم کو لہو کو اپنے نتھارنا ہے

غریب کیسی ہوئی ہے فطرت عجیب سی ہے ہماری عادت
اُسی کو ہر دم ہے یاد کرنا اُسی کو ہر دم بسارنا ہے

دعائیں راتوں کو کر رہے ہیں اُسی کی خاطر تو مر رہے ہیں
سنوار جس پر پڑی ہوئی ہے وہی نصیبہ سنوارنا ہے

کوئی بھی چارہ نہیں ہے اپنا کوئی ہمارا نہیں ہے اپنا
ہمیں تو دشتِ وفا میں ثاقبؔ کنویں کے اندر پکارنا ہے

○

واصف حسین واصف

(نیویارک)

اسم ہی پڑھنے سے کیا ردِّ بلا ہو جائے گا
ہاں مگر صوفی کا کفّارہ ادا ہو جائے گا

عشق کی تلبیس ہی جب ضابطہ ہوجائے گا
دیکھ لینا شہر سارا بے ردا ہو جائے گا

نیل کے ساحل پہ ساحل راہداری کا وجود
دستِ اعجازِ ہنر سے کیا سے کیا ہوجائے گا

لوح پر تصویرِ عقرب کی سجا دی جائے گی
حادثہ ہونا ہے اک دن، حادثہ ہوجائے گا

چاک پر رقصاں تو ہے یہ سوچ، میرا کوزہ گر
میں اگر ٹوٹا تو غم سے آشنا ہو جائے گا

ٹوٹ جائے گا شبِ ہجراں گدازی کا طلسم
شہرِ دل بھی ایک دن بے ماجرا ہوجائے گا

بے سروسامانیِ جاں بھی عطا ہو جائے گی
ہجر مہکے گا تو غم سے رابطہ ہو جائے گا

○

اختر شاہجہاں پوری

(بھارت)

روبرو تیرے کیا ہو گیا ہوں
سنگ سے آئینہ ہو گیا ہوں

غور سے کوئی سنتا نہیں اب
کیا میں حرفِ دعا ہو گیا ہوں

میرے اندر نہ ڈھونڈو خوشی کو
درد و غم کی فضا ہو گیا ہوں

سب کے وردِ زباں لفظ میرے
جانے کس کی صدا ہو گیا ہوں

دیکھتے سب ہیں پڑھتے نہیں اب
نقش دیوار کا ہو گیا ہوں

سب کے سب اجنبی تو نہیں تھے
میں ہی کیا دوسرا ہو گیا ہوں

کوئی اختؔر مجھے کیا منائے
جب میں خود سے خفا ہو گیا ہوں

○

ہارون الرشید
(بالاکوٹ)

تری جب تک اطاعت کر رہا تھا
تو ہی میری حفاظت کر رہا تھا

وہاں ہر چیز خوشبو ہو رہی تھی
تجھے جب میں تلاوت کر رہا تھا

مری آنکھوں میں سُورج رک گیا تھا
تری جس دم عبادت کر رہا تھا

مری پلکوں سے تو خُوں رس رہا تھا
سخی تو جب سخاوت کر رہا تھا

کوئی تو خوش تھا کوئی رو رہا تھا
میں جس دم گھر سے ہجرت کر رہا تھا

یہ آنکھیں تیرے قدموں میں پڑی تھیں
تری جب میں زیارت کر رہا تھا

○

رضیہ اسماعیل
(یوکے)

(احمد ندیم قاسمی کی زمین میں)

کس طرف آنکھ اٹھاؤں، میں کہاں تک دیکھوں
تو ہی آتا ہے نظر مجھ کو جہاں تک دیکھوں

دور تک بکھرے ہوئے پھول ہیں اور پتے ہیں
میں بہاروں کا سماں عہدِ خزاں تک دیکھوں

تجھ کو شعلے بھی نظر آئے نہ میرے دل کے
میں تو کھلتے ہوئے پھولوں کا دھواں تک دیکھوں

کتنے پہلو ہیں ترے، کتنے ترے چہرے ہیں
تُو مجھے یہ تو بتا تجھ کو کہاں تک دیکھوں

جو نہ ممکن تھا وہ ممکن کی حدوں تک دکھا
میں ترا عکس تہِ آبِ رواں تک دیکھوں

تیرے دیدار کے آداب کی سوگند مجھے
تجھے دیکھوں بھی تو قدموں کے نشاں تک دیکھوں

○

شاہد صدیقی
(کینیڈا)

ہیں حجابات حسن کامل کے
اختلافات حق و باطل کے

چند قطرے تھے خونِ بسمل کے
باغ میں پھول بن گئے کھِل کے

کیا؟ انہیں شرم گیں نگاہوں سے
آپ پُرزے اُڑائینگے دل کے

دل میں رہ کر بھی ہیں نظر سے دور
دل میں ارمان رہ گئے دل کے

بحر و بر کو سمیٹ لیتے ہیں
چند نالے دُکھے ہوئے دل کے

اِن کو پامال یوں نہ کرنا واں
یہ ورق ہیں صحیفہ دل کے

سُن کے شاہد کی داستانِ دل
اُڑ گئے ہوش ساری محفل کے

○

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

خوش ہو گے حسنِ تاج محل ڈھونڈ ڈھونڈ کر
پڑھتے رہو ہماری غزل ڈھونڈ ڈھونڈ کر

جیسے بھی ہیں تمھاری قسم ، بے مثال ہیں
رہ جاؤ گے ہمارا بدل ڈھونڈ ڈھونڈ کر

بہتر ہے آج ہم سے ہی کرلو مکالمہ
پوچھو گے ایک ایک سے کل ڈھونڈ ڈھونڈ کر

آخر ہوا دماغی خلل میں وہ مبتلا
دن رات دوسروں کا خلل ڈھونڈ ڈھونڈ کر

جو زندگی سے کھیل رہے ہیں انھیں کہو
لے جائے گی ضرور اجل ڈھونڈ ڈھونڈ کر

خود مسئلہ ہیں اصل میں کچھ مسئلہ نہیں
ناقابلِ قبول وہ حل ڈھونڈ ڈھونڈ کر

احساسِ کم تری میں بڑھا کر حسب نسب
دلدل میں پھنس گیا وہ کنول ڈھونڈ ڈھونڈ کر

بازارِ فاکہات سے ناکام آؤ گے
بے موسمی یہ خیر کا پھل ڈھونڈ ڈھونڈ کر

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

یہ زندگی کے میلے، دیکھیں گے ایک بار
سب دیکھ سن کے لوٹیں گے ہم اس جہاں کے پار

ہنگامے روز وشب کے ازل سے رواں ہیں یاں
جو کچھ یہاں کریں گے وہ دیکھیں گے ایک بار

تصویر بن رہی ہے عمل کی بھی دم بدم
سب کو دکھائی جائے گی محشر میں ایک بار

منظر کشی عمل کی، بہت پائیدار ہے
مٹنے کے بعد پھر سے ابھرتی ہے بار بار

بولیں گے ہاتھ پاؤں بھی سب ماجرا وہاں
کچھ بھی نہ کہہ سکیں گے جو دیکھیں گے ایک بار

جو لوگ جی رہے ہیں یہاں پر ہوس کے ساتھ
وہ زندگی سمجھتے ہیں بس ہو گی ایک بار

یاں زندگی فریبِ نظر ہے، وہاں نہیں
خبریں اگرچہ کوئی بھی لایا نہ ایک بار

تو ساتھ ہے تو وقت بھی کتنا حسین ہے
سب ساتھ چھوٹ جائیں گے آئیگی جب پکار

آگاہ کرنے آئے تھے کچھ برگزیدہ[1] لوگ
جو پھر کبھی نہ آئیں گے دنیا میں ایک بار

اب دیکھ سن کے اپنی فکر بھی کرو ریاضؔ
موقع نہیں ملے گا کبھی پھر یہ ایک بار

○

[1] پیغمبر

اشرف جاوید

(لاہور)

نہ ہجر ٹلتا ، نہ سیلِ فغاں گزرتا ہے
ٹھہر گیا ہے جو لمحہ ، کہاں گزرتا ہے!

ذرا سی بات طبیعت پہ بوجھ بن جائے
خیالِ یار بھی اب تو گراں گزرتا ہے

ہر ایک دستکِ در بھی اُسی کی لگتی ہے
ہر آنے والے پہ اُس کا گماں گزرتا ہے

وہ رستہ جاتا ہے، آتا نہیں کہیں سے بھی
اُدھر سے قافلہء رفتگاں گزرتا ہے

میانِ دیدہ و دل بھی کٹاؤ جاری ہے
یہاں سے چشمہء آبِ رواں گزرتا ہے

کبھی کبھی چمک اُٹھتا ہے کنجِ تنہائی
کبھی کبھی کوئی شعلہ بہ جاں گزرتا ہے

سروں پہ آن پڑے جانے کب یہ آفت بھی!
سروں سے روز کھلا آسماں گزرتا ہے

زمانہ وہ ، جو گزرتا ہے عشق سے خالی
زمانہ وہ جو مرا رائیگاں گزرتا ہے!

میں اپنے واسطے خود راستہ بناتا ہوں
نہیں گزرتا، جہاں سے جہاں گزرتا ہے

○

سُقُوط

بلراج بخشی
(جموں،کشمیر)

گشت پر نکلی پلٹن پر اچانک باڑ ماری گئی تھی۔

'لیٹ جاؤ.....لیٹو....اور پوزیشن لو.....رینگو.....آڑ لو.....آڑ.....'

لیفٹیننٹ گاشل حلق پھاڑ کر چلاتے ہوئے خود بھی ایک پتھر کی اوٹ میں رینگ گیا۔

وہ چلاّ کر یہ کاشن نہ دیتا تب بھی اس کی پلٹن نے یہی کیا ہوتا۔ کیونکہ میدان میں اترنے سے پہلے اس قسم کی جنگی مشقیں فوجیوں کی فطرت ثانی بن چکی ہوتی ہیں۔

لیکن پہلے ہی ایکشن میں سینکڑوں گولیاں چل گئی تھیں۔ یہ اسپرے فائر تھا۔ ایک ڈیڑھ منٹ تک خودکار رائفلوں کی ریٹ ٹیٹ مسلسل سنائی دیتی رہی۔ پھر فائرنگ بند ہوگئی اور جنگل کا سنّاٹا مزید گہرا لگنے لگا۔ لیفٹیننٹ گاشل نے اپنے ہانپنے پر قابو پاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی ہلچل نہیں تھی۔ اگلے چند لمحے فیصلہ کن ہوسکتے ہیں، اس نے سوچا۔ ابتدائی طور پر حیران کردینے والا دشمن ان کے مکمل خاتمے کے لیے اب ان کی گھیرابندی تنگ کرے گا۔ گاشل نے سر اٹھا کر ہر طرف دیکھا لیکن کہیں کوئی حرکت نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جنگل کا یہ ابدی سکون کبھی نہ ٹوٹا ہو۔ ایک ایک لمحہ ضروری ہے، اس نے سوچا اور پاس پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر زمین کی سطح کے ساتھ ایک جانب نشیب میں اچھال دیا۔ جس جگہ پتھر گرا تھا وہاں کچھ دیر کے لئے کئی اطراف سے فائرنگ ہوئی اور پھر وہی خاموشی۔

ہشیار ہیں، لیفٹیننٹ گاشل نے سر ہلایا۔ لیکن اس نشیب میں پتھر گرنے کی جگہ کو نشان زد کر لینے کا مطلب یہی تھا کہ دشمن ابھی combat زون میں نہیں بلکہ بلندی پر تھا۔ فوری طور پر کچھ کرنا چاہیے، اس نے سوچا۔ لیکن دشمن کی پوزیشن کا اندازہ کیے بنا یہاں سے ہلنا بھی خودکشی ہوتی۔ اس نے ہیلمٹ اتار کر رائفل کی نال کے اگلے سرے پر رکھی اور دونوں ہاتھوں سے رائفل پکڑ کر کہنیوں اور گھٹنوں کے بل چڑھائی کی جانب رینگنے لگا۔ رائفل کی نال پر رکھی ہیلمٹ کی سطح خود اس سے کم سے کم ایک فٹ اونچی تھی۔ تقریباً دس منٹ تک وہ یوں ہی بلندی کی جانب رینگتا رہا اور ایک بڑی چٹان کے پیچھے رک کر سانسیں درست کرنے لگا۔ پھر اس نے غور سے گردونواح کا جائزہ لیا۔ دور دور تک چھدری جھاڑیاں تھیں اور کہیں کہیں چھوٹی سی چٹان کہلانے لائق بڑے بڑے پتھر، جن کے پیچھے، دشمن کے گھات لگا کر بیٹھے ہونے کا امکان ہوسکتا تھا۔

یہاں سے زندہ بچ نکلنا ممکن نہیں، گاشل نے سوچا۔ دشمن نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہوگا۔ لڑ مرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، یا پھر ہتھیار ڈال دو۔ لیفٹیننٹ گاشل نے کچھ دیر سوچا اور پھر فیصلہ کن انداز میں سر ہلا کر ٹرانسیور کا سوئچ آن کیا اور آہستہ سے بولا:

'ہیلو چارلی.....چارلی.....ڈوئیو ریڈمی....چارلی.....اوور.....'

'یس آئی ریڈیو....ایلفا....سر....'

'گڈ.....ڈیمیج رپورٹ.....اینڈ گوئنگ....'

'ہمارے نو آدمی ختم ہوگئے سر.....'

'اسکاؤٹ.....کہاں ہیں؟'

وہ تھوڑی دیر سنتا رہا اور اس نے اطمینان کی سانس لی۔ میمنہ سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا لیکن میسرہ کے دونوں جوڑے محفوظ تھے۔ دراصل فوج کے گشتی دستے کے اگلے سرے پر دونوں اطراف میں بچھو کے بازوؤں کی طرح نیم قوس میں سپاہیوں کے دو دو جوڑے ہوتے ہیں جو فوج سے آگے کچھ فاصلے پر رہ کر چھپتے چھپاتے ہوئے دشمن کی سرگرمی پر نظر رکھتے ہیں اور عقب میں آرہی اپنی فوج کو باقاعدہ آگاہ کرتے ہیں۔

'.....اوکے....چارلی.....دشمن ہمارے دائیں طرف اونچائی پر ہے.....' اس نے کمر پر لگی بیلٹ پر ایک ہولسٹر سے سگنل پسٹل نکالا۔

'.....میں میگنیشیم فلیئر فائر کر رہا ہوں.....انہوں نے ہمیں حیران کیا ہے تو کچھ ہم بھی انہیں حیران کریں.....اپنے آدمیوں سے کہو کہ فلیئر کو دیکھتے ہی دائیں طرف چڑھائی پر رینگیں.....لیکن نو فائرنگ.....یہ چارج ایکشن ہوگا.....فلیئر ختم ہوتے ہی رک کر پوزیشن لے لیں.....اور اگلے فلیئر کا انتظار کریں......ہر فلیئر تیس سیکنڈ کا ہوگا.....کوئی شک؟'

'نو سر.....'

'اوکے.....یہ ہدایتیں پہنچا کر رپورٹ کرو.....اوور.....'

تھوڑی دیر بعد چارلی نے رپورٹ دی تو گاشل نے ٹرانسیور میں کہا:

'اوکے.....چارلی.....بیس سیکنڈ.....نو و و و......فائرنگ.....اینڈ......ریڈی فار چارج ایٹ کمانڈ.....اوو راینڈ آؤٹ.....'

لیفٹیننٹ گاشل نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر سگنل پسٹل کا رخ آسمان کی جانب کر کے فائر کر دیا۔ روشنی کی ایک پتلی سی لکیر بلندی کی جانب بڑھی اور پھر ایک چھاکے کے ساتھ چاروں اطراف میں نیلے رنگ کی تیز روشنی پھیل گئی۔ گاشل نے زیادہ احتیاط کو طاق پر رکھا اور تیزی سے رینگتا چڑھتا چلا گیا۔ یہ وقت زیادہ احتیاط کا تھا بھی نہیں کیونکہ نہ چاہتے ہوئے بھی دشمن کی آنکھیں اس نیلی روشنی کو دیکھ رہی ہوں گی۔ فلیئر کی روشنی تیس سیکنڈ تک فضا میں معلق رہی اور پھر معدوم ہو گئی۔ گاشل نے چند سیکنڈوں بعد ہی ایک اور فائر کیا اور بڑھتا گیا۔ دشمن کی حیرت کا فائدہ اٹھانے کا یہی موقع تھا۔ اور پھر تیسرے فلیئر کی نیلی چکا چوند ختم ہوتے ہی گاشل نے آڑ لے لی اور سانسیں درست کرنے لگا۔ اس نے گھڑی دیکھی، ایک منٹ ہو چکا تھا۔ اس کے جوان بھی سانسیں درست کر چکے ہوں گے، اور اس سے

زیادہ اب پرے باندھنے کا نہ تو وقت تھا نہ گنجائش۔ اس نے رائفل پر سنگین چڑھایا۔ فیصلے کی گھڑی، لیفٹیننٹ کاشل نے سوچا۔

'ریڈی چارلی؟' کاشل نے ٹرانسیور کا سوئچ آن کر کے پوچھا۔

'ریڈی ایلفا...کمانڈ...سر....'

'چاآآآآرج......' وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور پوری قوت سے چلاّتے ہوئے جھک کر خودکار رائفل کے ساتھ کمر کے برابر سے فائرنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے جوان بھی چارج کا آوازۂ جنگ لگاتے ہوئے فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن یہ کوئی طویل جھڑپ نہیں تھی۔ دراصل کاشل کی اس گستاخانہ حکمت عملی نے دشمن کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ مگر صاف طور پر اب مبارزت کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ گرنے لگے۔ ہر طرف سے چیخ و پکار، آہوں اور کراہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انسان کے قدیم ترین مشغلوں میں سے ایک قتل و غارت کے اس سلسلے میں گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں بھی سنائی دے رہی تھی اور سنگینوں کی غچاغچ بھی۔ اور اب پھر خاموشی چھانے لگی جسے کوئی تھکی تھکی سی کراہ مجروح کر دیتی تھی۔

لیفٹیننٹ کاشل ہانپتے ہوئے جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اسے ایک جانب سے ہلکی سی آواز سنائی دی اور وہ جھٹکے سے ادھر مڑا۔ تقریباً تیس گز کے فاصلے پر ایک مسلح دشمن اسے رائفل کی زد پر لیے کھڑا تھا۔ کاشل کے کچھ کرنے سے پہلے ہی دشمن نے وقت ضائع کیے بغیر ٹریگر دبا دیا۔ لیکن خالی آواز آئی، میگزین خالی ہو چکی تھی۔ کاشل نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی رائفل کی نال سیدھی کی۔ یہ الوداعی تقریر کا وقت نہیں تھا اس لیے رائفل کی نال سیدھی کرنے، دشمن پر شست باندھنے اور ٹریگر دبانے کا عمل ایک ہی تسلسل میں تھا۔ لیکن اس بار بھی صرف ٹریگر کی خالی آواز ہی آئی۔ اس کی میگزین بھی خالی تھی۔ لیکن اب میگزین لوڈ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ہولسٹر سے اعشاریہ پینتالیس کا ریوالور نکالنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ بے سوچے ہی بُلٹ پروف جیکٹ کے اندر جھپٹا اور ایک ہینڈ گرنیڈ کے ساتھ سرعت سے باہر آ گیا۔ کاشل کا ہاتھ منہ کے پاس آیا۔ اس نے دانتوں کے ساتھ سیفٹی پن کھینچ کر گرنیڈ کو مسلح کیا اور جیسے ہی پھینکنے کی پوزیشن میں ہاتھ پیچھے گیا اس نے دیکھا کہ دشمن کا ہاتھ بھی گرنیڈ کے ساتھ اسی پوزیشن میں تھا۔

دونوں پلکیں جھپکے بنا ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ کاشل کا دماغ تیزی سے تخمینہ لگانے لگا۔ اگر کسی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تو دوسرا گرنیڈ لانچ کر دے گا۔ اور اگر ایک نے گرنیڈ پھینکنے کی کوشش کی تو دوسرا بھی پھینک دے گا اور اس طرح دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ دونوں کے لیے راہِ بے مفر کی صورت تھی۔ دشمن بھی اسی نتیجے پر پہنچ گیا لگتا تھا کیونکہ اب اس کے ہونٹ ایک تلخ مسکراہٹ کی شکل میں کھنچ کر اس کے دانتوں پر پھیل گئے تھے۔

'کوئی بھی نہیں بچے گا...' مخالف اونچی آواز میں چلاّیا۔ اس نے تیزی سے نیچے جھک کر کچھ اٹھایا اور اسے غور سے دیکھتا ہوا اس کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔

کاشل نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کا انگوٹھا سختی کے ساتھ گرنیڈ کے لیور پر جما ہوا تھا۔ جب تک انگوٹھا لیور پر تھا گرنیڈ پھٹ نہیں سکتا تھا اور لیور پر سے انگوٹھا ہٹاتے ہی گرنیڈ آٹھ سیکنڈ کے اندر پھٹ جاتا۔ اگر وہ لیور پر سے انگوٹھے کا دباؤ ہٹا کر پانچ سیکنڈ کا انتظار کرے تو آخری تین سیکنڈوں میں وہ اسے دشمن پر اچھال سکتا ہے، اس نے سوچا۔ لیکن دشمن بھی اس امکان کو سمجھ گیا تھا اور جلد ہی اس نے مزید قریب آ کر درمیانی فاصلہ بہت کم کر لیا تھا۔ کاشل نے دل ہی دل میں دشمن کے اس فعل کی تعریف کی۔ اب ان کا درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ ان میں سے اگر کوئی بھی گرنیڈ استعمال کرتا تو دونوں کا خاتمہ یقینی تھا کیوں کہ گرنیڈ کا حلقۂ مار آٹھ نو میٹر تو ہوتا ہی ہے۔

'کوئی فائدہ نہیں دوست....' دشمن مزید قریب آ گیا '....میں حساب لگا چکا ہوں....کوئی راستہ نہیں ہے...'

اب ان کے درمیان چھ سات فٹ کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔

'کیا خیال ہے....' دشمن نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا '....دونوں کے مر جانے کا کیا فائدہ.....فتح کا جشن منانے کے لیے ایک تو زندہ رہے....'

کاشل کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

'میرا خیال ہے کہ......سیفٹی پن گرنیڈ میں واپس ڈال دوں تو کوئی نقصان نہیں ہوگا...' دشمن نے کہا

'اوں.....ہوں....ابھی نہیں.....اپنی رائفل زمین پر ڈال دو.....' کاشل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

دشمن نے کچھ سوچا پھر سر ہلاتے ہوئے رائفل زمین پر ڈال دی۔ کاشل نے بھی اس کی تقلید کی اور بولا:

'ریوالور بھی....'

دونوں نے بیلٹ سے اپنے ہولسٹر ہی کھول کر پھینک دیے۔ دشمن نے گرنیڈ کے لیور سے انگوٹھا ہٹایا اور سیفٹی پن واپس ڈال کر گرنیڈ واپس جیب میں ڈال دیا۔ کاشل اس کی کاروائی دیکھتا رہا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے بھی ویسا ہی کیا اور دشمن نے طویل سانس لی۔

'میں زوگو واڈی ہوں.....ایم اے اکونومکس....'

'ایم اے اکونومکس ہونے سے تمہارے جرم کم ہو جاتے ہیں کیا؟' لیفٹیننٹ کاشل کا لہجہ خشک تھا۔

'نہیں.....تمہیں بتانا ضروری ہے کہ ہماری صفوں میں خاصے تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہیں.....محض گنوار نہیں.....ویسے ے ے ے.....' وہ خشخشی داڑھی کو سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا '....تمہارا ایکشن غیر متوقع تھا.....لیکن قابل تعریف.... you took me by surprise.....ورنہ تم سب کا مرنا طے تھا.....لیکن تمہارے ایکشن سے میرے تمام لوگ بھی ختم ہو گئے ..... daring.....تمہارے

سرمایہ دار آقا اپنے کارندوں کو اچھی ٹریننگ دیتے ہیں....'
'میں پیشہ ور سپاہی ہوں....'
'اور میں پیشہ ور انقلابی..... ویسے لیفٹیننٹ ..... یہ کمال کی سچوئشن ہے.....اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہیں تو ہمیں ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں.....لیکن یہ..... یہ چھ سات فٹ کا فاصلہ درمیان میں رکھنا ہوگا تا کہ ہم میں سے کوئی دوسرے پر اچانک حملہ نہ کر دے..... یہ کمال کی دوری پیدا کر دی ہے تمہارے آقاؤں نے....'
'مرنے سے ڈرتے ہو؟' گاشل کی پیشانی پر استفہامیہ بل پڑ گئے۔
'نہیں.....ایک اور لڑائی کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں....'
اچانک گاشل کے ٹرانسیور پر آوازیں آنے لگیں:
'ہیلو.....زیرو نائن.....کالنگ ایلفا.....زیرو نائن کالنگ ایلفا.....اوور....'
گاشل نے سوئچ آن کیا اور دشمن پر سے نظر ہٹائے بغیر صرف یہ کہا:
'اِن گیجڈ.....آوٹ....'
سوئچ آف کر کے وہ جھٹکے سے اٹھا اور بولا:
'یہاں سے نکلو.....اور کوَر ڈھونڈو.....کچھ ہی منٹوں میں ریکی کے لیے جہاز یہاں مکھیوں کے طرح بھنبھنانے لگیں گے.....ان جنگلوں سے واقف ہو؟'
'اچھی طرح....'
'چھتاروں کی طرف چلو.....گھنے درخت.....جن میں شاخیں اور پتے گھنے ہوں....'
زوکو واڈی نے سر ہلایا اور پھر دونوں تیز قدموں سے ایک جانب چلنے لگے۔لیکن ان اطراف میں گھنے درخت تھے ہی نہیں۔ وہ ایک چھوٹی سی گھنی بانسواڑی میں چھپے رہے۔ جہاز آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ دونوں نے اپنا اپنا لایا ہوا کھانا کھایا اور بیٹھ گئے۔
'کیا پروگرام ہے؟' گاشل نے پوچھا۔
'پروگرام؟.....اس نقصان کے..... باوجود.....ہماری جدوجہد جاری رہے گی...' زوکو واڈی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
'میں تمہارے اس وقت کے پروگرام کے بارے میں پوچھ رہا ہوں ......مستقبل کے تمہارے قاتلانہ منصوبوں کے بارے میں نہیں...'
'قاتلانہ منصوبے؟' واڈی نے مجروح لہجے میں کہا' .....ہم لوگ ایک مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں لیفٹیننٹ.....یہ سڑا گلا نظام....'
'بالکل..... بہت بڑا مقصد....' گاشل نے زہریلے لہجے میں کہا' ......اور یہ مقصد صرف سرحدی ریاستوں میں نظر آتا ہے....'
'کیا مطلب؟'
'صرف وہ ریاستیں.....جو ملک کی سرحدوں پر واقع ہیں.....صرف وہاں کے باشندوں کے ساتھ ہی ناانصافیاں، مغربی تہذیب کی بالا دستی.....ظلم..... انسانی حقوق کی پامالی.....اور نہ جانے کیا کیا ہوتا رہتا ہے.....اتنے بڑے ملک میں.....کہیں اور.....کچھ نہیں ہوتا.....کیوں؟'
'یہ تو ہر جگہ ہو رہا ہے...' زوکو واڈی آہستہ سے بولا' مگر تمہیں نظر نہیں آتا.....تمہارے آگے کچھ ٹکڑے پھینک کر تمہیں اس نظام کا محافظ بنا دیا گیا ہے اور بس.....یہ جو تم نے لیفٹیننٹ کی وردی پہن رکھی ہے.....کبھی کسی سیاستدان کے بیٹے نے پہنی ہے؟..... یا کسی سرمایہ دار کے بیٹے نے؟.....تم نے کبھی دیکھا کہ کسی لیڈر یا وڈیرے کا بیٹا..... پولیس کا ڈائریکٹر جنرل یا... یا.....چیف آف آرمی اسٹاف بنا ہو؟ .....وہ نہیں بنتے.....وہ صرف حکمران بنتے ہیں...تمہاری طاقت کے زور پر...تم جیسے عام لوگ ...جو وردی پہننے کے لئے بہت سستے میں مل جاتے ہیں.....جنہیں جمہوریت اور وطن پرستی کا سبق پڑھا کر بندوق تھما دی جاتی ہے کہ ان کے دشمنوں کو مارو.....تو انعام ملے گا..... یا خود مر جاؤ....ایوارڈ ملے گا....آج تم وہی تو کر رہے ہو....'
'لیکچر مت دو....' گاشل کا لہجہ خشک تھا' ....سرمایہ داروں کو ختم کر کے ان کی دولت غریبوں میں تقسیم کریں گے.....اور اپنا مذہبی نظام حکومت بنائیں گے ..... پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہو تم لوگ.....ابھی تم نے کہا کہ پولیس اور فوج میں عام آدمی ہوتے ہیں.....تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری گولی سے جب ایک فوجی مرتا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لیے دس لوگ آ جاتے ہیں.....گاؤں کی زمینیں بیچ کر پچاس پچاس ہزار کی رشوت دے کر.....کب تک مقابلہ کر سکو گے؟.....ہم ہیں نا ان وڈیروں کی حفاظت کے لیے.....اور.....تم ہو ہی کتنے؟'
تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔
'یہاں سے فوراً نکلنے کی کوشش کرو.....' لیفٹیننٹ گاشل بولا' .....انکوائری کے لیے کوئی فوجی ٹکڑی.....کوئی سرچ ٹیم آ رہی ہوگی....'
'ایک دو دن تو کوئی نہیں آئے گا....' زوکو واڈی نے ہنس کر کہا' ....انہیں پتہ ہے کہ ہم یہیں کہیں گھات لگائے چھپے ہوں گے....مزید شکار کے انتظار میں.....ویسے بھی یہاں سے نکل کر کہاں جاؤ گے لیفٹیننٹ؟'
'کیا مطلب؟'
'تمہارے تمام آدمی ختم ہو گئے...مگر تم نے اپنے کمان افسر سے رابطہ نہیں کیا....مر گئے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی...تم بچ گئے...لیکن ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ نہیں کیا....'
گاشل اسے کچھ دیر تک متفکرانہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا:
'میں تمہارے ساتھ ایک عجیب سچوئیشن میں پھنس گیا ہوں....جو ختم ہی نہیں ہو رہی ہے....'
'پر یہ بات تمہارے آقا نہیں مانیں گے...'

'ہوں ں ں ں....شاید تمہارا خیال ٹھیک ہے ....مجھ سے رپورٹ مانگی جائے گی.....کورٹ آف انکوائری ہوگی.....مجھ پر مجرمانہ غفلت کا الزام بھی لگ سکتا ہے...'

گاشل خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگا۔

اچانک ایک تیز رفتار جیٹ طیارہ فائرنگ کرتے ہوئے ان کے سروں پر سے گزر گیا۔دونوں زمین پر اوندھے منہ گر گئے اور سرعت سے رینگتے ہوئے چٹانوں کی اوٹ میں ہو گئے۔جیٹ طیارے نے تین بار پھر لوٹ کر اسی محدود رقبے میں مشین گن سے فائرنگ کی۔ان کے آس پاس کی مٹی اچھلتی رہی یا گولیاں چٹانوں سے ٹکراتی رہیں۔خطرہ یہ تھا کہ چٹانوں سے ٹکرا کر کوئی اچٹتی ہوئی گولی انہیں نہ لگ جائے۔

جیٹ طیارہ چلا گیا۔

'تم نے دیکھا لیفٹیننٹ.....فائیٹر جیٹ نے اسی علاقے میں فائرنگ کی.....یعنی اسے ٹارگٹ ایریا دیا گیا تھا.....کیسے؟' زوگوواڈی نے زمین پر چت لیٹے لیٹے کہا۔

'اوہ.....اوہ.....' کچھ دیر بعد گاشل کے منہ سے بے اختیار نکلا' .....اسکاؤٹ.....میری بائیں جانب والے اسکاؤٹ نشیب میں تھے.....اور.... محفوظ تھے.....یقیناً انہوں نے ریکی کی ہوگی.....اور ہم دونوں کو سکون سے باتیں کرتے دیکھ کر رپورٹ دے دی ہوگی.....او مائی گاڈ.....وہ تو مجھے واجب القتل قرار دے چکے ہوں گے.....اوہو.....تو.....میرا کورٹ مارشل طے ہے...'

'میں نے غلط تو نہیں کہا تھا.....' زوگوواڈی نے ہلکا سا استہزائیہ قہقہہ لگایا'.....مجبوری کی حالت میں بھی دشمن کے ساتھ بات کرتے دیکھ کر تمہارے سرمایہ دار آقا تم پر غداری کا الزام لگا دیں گے...'

'لیکن.....میرا خیال ہے کہ.....تمہارا بھی کچھ کچھ یہی حال ہے...' لیفٹیننٹ گاشل کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا'...گھاتی حملے میں پیشگی گاڑا لگائے بیٹھا مخالف ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے.....تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ گھات لگانے کے باوجود تمہارے تمام آدمی کھیت رہے.....کیا تم نے حکومت کے ساتھ اپنے لڑاکوں کو مروانے کا سودا کیا تھا؟.....کیا تم بک گئے تھے زوگو؟'

زوگو کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔اب گاشل کے ایک چبھتا ہوا قہقہہ لگانے کی باری تھی۔

'میرے سامنے تو جیل ہے.....اور طویل قانونی لڑائی.....' گاشل کہہ رہا تھا'...لیکن پڑوسی ملک کے تمہارے مددگار گر گئے اور تمہاری مسلح دہشت گرد تنظیمیں تو تمہیں.....تمہارے ہی گاؤں کے لوگوں کے سامنے .....تمہارے دونوں ہاتھ پشت پر.....اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر.....فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیں گے.....تا کہ آئندہ کوئی غداری نہ کرے....'

'تم ٹھیک کہتے ہو....' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

'تو پھر.....مسٹر زوگوواڈی.....ایم اے اکونومکس......اب.....ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے.....کیا خیال ہے؟'

'کیا کرنا چاہیے؟ جلدی کرو.....ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے.....' زوگو بولا۔

'وہیں چلتے ہیں جہاں ہم ملے تھے.....اور وہی کرتے ہیں جو ہم کرنے لگے تھے.....کیوں؟'

زوگو نے کچھ دیر سوچا اور پھر گاشل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

پندرہ منٹوں میں وہ دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

'گرنیڈ.....یا.....ریوالور؟' زوگو نے پوچھا۔

'میرا خیال ہے .....ریوالور مناسب رہے گا.....' گاشل نے زہریلے لہجے میں کہا'.....لاشیں قابلِ شناخت تو رہنی چاہئیں.....ورنہ آخری رسوم کی ادائیگی میں پریشانی ہوگی.....گرنیڈ سے ہونے والے چیتھڑے کون اکٹھے کرتا رہے گا...'

ریوالوروں سمیت دونوں کے ہولسٹر وہیں پڑے تھے۔دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور جھک کر اپنا اپنا ہولسٹر اٹھا کر بیلٹ سے باندھا۔

'مسٹر زوگوواڈی.....ایم اے اکونومکس...' لیفٹیننٹ نے پریڈ گراؤنڈ انداز میں کاشن دیا۔

'یس.....لیفٹیننٹ گاشل ....آؤ....پہلی .... اور آخری بار ہاتھ ملا لیں....'

دونوں نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کیا پھر دونوں کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔

'یس....زوگوواڈی.....گولی دل پر لگے.....سر پر نہیں.....لاش کی شکل خراب نہیں ہونی چاہیے.....میں ذرا صفائی پسند ہوں...'

دونوں کے ہاتھ ہولسٹر کی جانب لپکے اور اگلے ہی پل دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آئے جن کے سیفٹی کیچ وہ ہٹا چکے تھے۔دونوں نے ایک دوسرے پر ریوالور تان لیے۔

'مسٹر زوگوواڈی....ایم اے اکونومکس....' گاشل نے چلا کر کاشن دیا '....ون....ٹو....تھری....فائر....'

دو دھماکے ہوئے اور دو لاشیں زمین پر گر گئیں۔

(لیفٹیننٹ گاشل کو بعد از مرگ بہادری کا تمغہ دیا گیا۔زوگوواڈی کے گاؤں میں اس کی شدت پسند تنظیم نے اس کا مجسمہ لگایا گیا تا کہ وہاں کے لوگوں کو تبدیلیٔ نظام کے لیے ہتھیار اٹھانے کی تحریک ملتی رہے۔)

پاکستانی

ملکیت سنگھ مچھانا
(بھٹنڈا)

سمجھوتہ ایکس پریس جب اٹاری ریلوے اسٹیشن سے چل کر واگہہ سے آگے نکل گئی تو ہرجیت سنگھ کی مسرت وفرحت نقطۂ عروج پہ تھی۔اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ پاکستان کے علاقے میں داخل ہو گیا ہے۔مغربی پنجاب کو دیکھنے کا اس کا برسوں پُرانا خواب حقیقت میں بدل رہا تھا۔

دراصل ہرجیت سنگھ بچپن ہی سے ریڈیو سننے کا بہت شوقین تھا (وہ شوق اب تک قائم ہے)۔ پہلے پہل اس کے پاس خود کا ریڈیو سیٹ نہیں تھا۔اس کے چچا جگا سنگھ کے پاس مرفی کمپنی کا ایک بینڈ کا ریڈیو تھا۔وہ چلتے وقت بار بار تب اس کا دھیان متوجہ کرتا جب اس کے ذریعے پاک افواج کے ہندوستان میں مقید فوجی جوان اپنی سلامتی کی خبر اپنے خاندانوں تک پہنچایا کرتے تھے۔۱۹۷۱ کی جنگ میں اس کے ۹۰ ہزار سے زائد فوجی ہندوستان نے قید کر لئے تھے۔ دوپہر کے وقت ہر روز آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے اسٹیشن سے یہ نشریات ہوتی تھیں اور متعدد فوجی اپنی نظر بندی کی تفصیل بیان کرتے تھے تاکہ پاکستان میں رہ رہے متعلقین کو ان کے زندہ ہونے کی خبر ہو جائے۔ ہرجیت یہ پروگرام بڑی پابندی سے سنا کرتا تھا،اس طرح رفتہ رفتہ ریڈیو سے اس کی کشش بڑھتی چلی گئی۔اس وقت وہ چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔اگلے سال اس وقت وہ خود کا ریڈیو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جب وہ اور اس کا والد گدڑ بہہ منڈی کے عین قریب ایک گاؤں میں اس کی پھوپھی کو اس کے سسرال چھوڑ کر واپس آ رہے تھے، اس کے والد نے شہر نما اس قصبے سے ایک فلپس کمپنی کا ریڈیو خرید کر اس کے سپرد کر دیا تب اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔وہ اس کو گلے میں لٹکا کر بس میں بیٹھ گیا اور گھر تک اُسے 'ٹیوں ٹیوں' کرواتا چلا آیا۔ان دنوں لاہور اسٹیشن سے نشر ہونے والا شام کا پنجابی پروگرام 'سوہنی دھرتی' اسے بہت پسند تھا۔اس پروگرام کے میزبان چاچا نظام الدین عرف مرزا اسلم بیگ بہت ہی پُرمعنی اور جوش وخروش سے یہ پروگرام پیش کرتے تھے۔ بعد دوپہر کا پروگرام 'کھیت کھیت ہریالی' مدثر شریف کے حوالے تھا اور صبح کا ایک پنجابی پروگرام 'راوی رنگ' نور جہاں روانی سے پیش کرتی تھیں۔تینوں ہی پروگرام نہایت مقبول ومعروف تھے پر ان سب میں نظام الدین والا پروگرام اول درجے کی نوعیت رکھتا تھا۔ پنجابی ان کی زبان سے آبشار کی طرح بہتی تھی۔وہ پنجابی زبان میں محاوروں اور ضرب المثل کی لغت تھے۔اپنے مذہب کے علاوہ سکھ مذہب کے بھی اچھے گیانی تھے اور اکثر سوہنی دھرتی پروگرام میں بابا گورونانک جی کا عبرت آمیز کلام پیش کرتے تھے اور کہتے تھے کی پاکستان کی سرزمین وہ پاک ومقدس جگہ ہے جہاں بابا گورونانک جیسے پیرو پیغمبر نے جنم لیا ہے۔اس پروگرام کی مندرجہ ذیل سُرِ علامت نہایت دلکش تھی:

'تو ڈب کے زمیناں واہ...لُٹ لے موجاں تے رّج کے کھاہ،
جواناں دیس دِیا...کساناں دیس دِیا۔'

(مطلب اے دیش کے جوان و کسان تو زمین پر اچھی طرح ہل چلا اور پیٹ بھر کر کھا)

لاہور ریڈیو کے دیگر پروگراموں کے علاوہ، پاکستانی وقت کے مطابق شام سات بجے نشر ہونے والا یہ پروگرام 'سوہنی دھرتی' ہرجیت باقاعدگی سے سنتا تھا اور جا بجا اس کی تعریف کرتا تھا جس کی وجہ سے لوگوں نے اسے 'پاکستانی' کہنا شروع کر دیا تھا۔'پاکستانی' کا یہ لقب تمام عمر اس کے دامن سے لپٹا رہا۔سکول وکالج کے زمانے سے لے کر دفتر میں جہاں جہاں اس نے ملازمت کی اس کے ساتھ رہا۔اس پروگرام میں عمدہ زراعت کاری کے بابت معلومات فراہم کرنے کے علاوہ انسانی جسم کو چست و تندرست رکھنے کے لئے وید حکیموں کے نسخے بھی بتائے جاتے تھے اور سامعین کے خطوط کے جوابات بھی دئے جاتے تھے۔بعض سامعین کی طرف سے مشرقی پنجاب کے سامعین سے قلمی دوستی کرنے کی غرض سے اپنا نام وپتہ نشر کروایا جاتا تھا۔اس وقت ہرجیت کو اردو زبان نہیں آتی تھی پر اس نے ایک خط پنجابی گورمکھی میں لکھ کر لاہور ریڈیو اسٹیشن کو ارسال کر دیا۔تقریباً دو ہفتے کے بعد مع نام وپتہ کے اس کا خط بھی نشر ہو گیا۔اس کے جواب میں اس نے پاکستانی پنجاب سے بڑی تعداد میں خطوط وصول پائے۔تمام خط اردو زبان میں رقم کئے ہوئے تھے۔ہرجیت کے محلّے کے نمبردار سردار سمپورن سنگھ جو رشتہ میں اس کے تایا جی کا مقام رکھتے تھے، وہ خطوط ان کے پاس لے گیا۔جب تایا جی انھیں پڑھ رہے تھے تو ان میں سے شیرینی کی سی مٹھاس آ رہی تھی۔ اکثر خطوط بہت خلوص ومحبت سے تحریر کئے ہوئے تھے۔مختلف ناموں والے خطوں میں سے اسے غلام رسول کا خط بہتر لگا۔اس نے ایک خط تایا جی سے لکھوا کر (غلام رسول) کے نام ارسال کر دیا۔اس کے بعد یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ایک دوسرے کی صورت دیکھے بغیر باہمی دوستی میں کشش دن بدن بڑھتی چلی گئی۔دورانِ مراسلت ہرجیت سنگھ نے اردو زبان کی ابتدائی تعلیم بھی حاصل کر لی تاکہ خط نویسی کے لئے روز کسی کی منت سماجت نہ کرنی پڑے۔کالج جانے تک اس نے کہیں نہ کہیں سے یہ بھی پڑھ سُن لیا تھا کہ 'جس نے لاہور نہیں دیکھا سمجھو وہ تو جمیا (پیدا) ہی نہیں ہوا' یہی بات اس کے من میں گھر کر گئی اور ہر وقت گھڑی کی طرح ٹِک ٹِک کرتی رہتی تھی اس لئے اس نے اپنے 'جمّن' (پیدا ہونے کے) اور اپنے دوست غلام رسول سے ملاقات کرنے کے لیے ایک دن پاکستان جانے کی ٹھان لی۔گھر والوں پہ اس کے ارادے تب ظاہر ہوئے جس دن پولیس والے اس کا پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات کی تحقیق کے لئے اس کے پاس آئے۔ والدین نے پاکستان نہ جانے کے لئے اس پہ دباؤ ڈالا کہ وہاں اس کا کون ہے...کس کو ملنے جانا ہے...وہاں کون سی اس کی ماں بیٹھی ہے جو اسے اچھی طرح نہلا دھلا کے اس کے کیشوں کو کنگھی کر دے گی...گاؤں والے تو پہلے ہی اسے 'پاکستانی' کہہ کر

بلاتے تھے... پراس کے اندر تو ایک عجیب شوق جنم لے چکا تھا جو اسے شب وروز چین لینے نہیں دیتا تھا اور وہ بہر صورت مغربی پنجاب میں قدم رکھنا چاہتا تھا۔ ذہنی تصویر و تفریح کے لئے وہ لاہور شہر گھوم پھر کر دیکھنے کا مشتاق تھا جس کی تعریف ریڈیو لاہور اپنے ہفتہ وار پرگرام 'لاہور لاہور ہے' میں کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ گوردوارا ننکانہ صاحب جو بابا گورونانک جی کی جائے پیدائش ہے، پہ سجدہ گزاری کرنا چاہتا تھا جیسا کہ ہر سکھ کی آرزو ہوتی ہے۔ وہ رشتے میں لگتی اپنی پھوپھی کو ملنے کا بھی خواستگار تھا جو بٹوارے کے وقت اس کے گاؤں سے ہجرت کر کے پاکستان چلی گئی تھی اور اس وقت لاہور کے پاس شاہدرہ میں مقیم تھی۔ منہ زور جوانی کسی ندی کے سیلاب کی مانند ہوتی ہے جسے روکنا ناممکن ہوتا ہے۔ الغرض ہرجیت کا جوش وخروش اور اعتقاد و ایمان دیکھ کر والدین نے اسے پاکستان جانے کی اجازت دے دی تو اسے انتہائی خوشی نصیب ہوئی۔ اس کے پاؤں زمیں پہ نہیں لگتے تھے۔ ایک دوست کے والد کی مدد سے اس نے دہلی سے پاکستان کا ویزا لگوایا اور چھٹیوں کا حساب کتاب دیکھ کر اپنی آمد کے بارے میں غلام رسول کو تفصیلاً خط لکھ دیا۔

ہرجیت سنگھ نے ایک دو لوگوں سے مل کر جو پہلے پاکستان کا چکر لگا آئے تھے وہاں کے بارے میں کم وبیش معلومات حاصل کر لیں۔ روانگی کے وقت ماں نے اس کی پیشانی کا بار بار بوسہ لیا۔ اس کی سلامتی کے لئے خصوصی دعا مانگی۔ اس نے بھی ان کے قدموں پہ ماتھا ٹیکنے کے لئے سر جھکایا... اپنے والد سے بغلگیر ہوا تو انھوں نے خاص تاکید کی کہ بیٹا اپنا خیال رکھنا... کہیں کوئی قضیہ کھڑا نہ ہو جائے۔ پھر وہ ضروریات کا رختِ سفر اٹھا کر صبح سویرے طلوعِ آفتاب سے قبل گھر سے چل پڑا۔ اٹاری ریلوے اسٹیشن پر اپنا مال واسباب چیک کروایا اور سمجھوتہ ایکس پریس گاڑی پکڑ لی۔

گاڑی تقریباً خالی تھی۔ بہت کم مسافر تھے۔ پاکستان کی طرف اسٹیشن اولین واگہہ کے مقام پر گاڑی رکی، باقیوں کی طرح اسے بھی نیچے اترنا پڑا۔ پاک حکومت کے اہلکاروں نے خوش باشی سے انھیں خوش آمدید کہا اور سبھی کے پاس پورٹ اور دیگر دستاویزات کی جانچ کی۔ بعد ازاں گاڑی آگے بڑھی۔ اُدھر بھی بالکل اِدھر جیسے لوگ نظر آئے جو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر انھیں دعا سلام کر رہے تھے۔ گاڑی ابھی حدِ رفتار چھو بھی نہ پائی تھی کہ لاہور آ گیا۔ شام کے ساڑھے تین بجے ریل گاڑی کا سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔ وہ لاہور اسٹیشن پہ جا اترا۔ سب سے پہلے اس نے بابا گورونانک دیو جی کی اس مقدس سرزمین کو سجدہ کیا جس پر پیر رکھنے کے لئے وہ ایک طویل عرصے سے شدید منتظر تھا۔ اسٹیشن سے باہر آیا تو غلام رسول کی شناخت کرنے میں اسے ذرا تاخیر نہ ہوئی۔ وہ (غلام رسول) سامنے مجمعِ عام میں اس کے نام کی تختی اٹھائے انتظار کر رہا تھا۔ اس کے سر پہ زرد رنگ کی دستار دیکھ کر جب غلام رسول نے اس کا نام لے کر پکارا تو اس کے منہ سے بھی خود بہ خود نکل گیا ''غلام رسول!'' اور اگلے ہی ثانیہ وہ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ گرد و پیش کھڑے لوگ یہ نظارہ دیکھ کر ایک دم خاموش تھے۔ جب وہ علیحدہ ہوئے تو اس بھیڑ میں سے کئی ایک نے ہرجیت سنگھ کو 'ست سری اکال' کہا اور ہاتھ ملاتے ہوئے خاطر تواضع کی پیشکش کی، اس نے 'پھر کبھی' کہتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

دن بے شک ڈھل رہا تھا پر تمازتِ آفتاب میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ غلام رسول نے اسے اپنی جیپ میں بٹھا لیا اور اپنی دکان کی جانب لے اڑا۔ اس (غلام رسول) کے چہرے کی آب وتاب بتا رہی تھی کہ وہ ان کی ملاقات سے کتنا مسرور تھا۔ غلام رسول لاہور سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پہ واقع اپنے آبائی گاؤں میں مقیم تھا یہاں اس کے ابّا جان اور بڑا بھائی کھیتی باڑی کا پیشہ کرتے تھے۔ اس نے گزشتہ برس بی.اے. کی ڈگری حاصل کی تھی، اس کے بعد فوٹو گرافی کی تربیت حاصل کی اور اب وہ لاہور شہر میں فوٹو گرافی کی دکان چلاتا تھا۔ دکان پہ پہنچ کر غلام رسول نے جیپ ایک طرف کھڑی کی اور چائے کا آرڈر دے کر کہنے لگا ''بائی (بھائی) جی میں نے آج دوپہر کی چائے مِس کر دی سو چاتم آؤ گے اور مل کر چائے کا لطف لینگے... چلو اور سناؤ کوئی دشواری تو نہیں پیش آئی راستے میں؟

ہرجیت نے کہا ''بس! آپ کا دیدار ہو گیا... سب دشواریوں کو بھول گیا ہوں''

اس کا جواب سن کر غلام رسول نے کرسی سے اٹھ کر ایک بار پھر اسے اپنی آغوش میں کس لیا۔ ہرجیت نے دیکھا کہ غلام رسول اس کام میں اتنا منہمک ہے کہ اس کے پاس سر کھجلانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ چائے سے فارغ ہو کر اس نے اپنے کارندوں کو کام سمجھایا اور وہ پھر دوبارہ جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ برق رفتاری سے اس کے گاؤں کی جانب دوڑنے لگی۔ فضا میں بے شک گرماہٹ تھی... ہر فرد پسینے سے شرابور ہوئے جا رہا تھا لیکن جیپ کھلی ہونے کی وجہ سے فراٹے دار ہوا ان سے ٹکرا رہی تھی جس سے ذہن وجسم کو سکون مل رہا تھا۔

غلام رسول نے ہرجیت سنگھ کی آمد کے بارے میں اپنے گھر والوں کو پہلے ہی اطلاع بھجوا دی تھی۔ جب وہ گاؤں پہنچے سرمئی شام پھیلتی جا رہی تھی اور بتیاں روشن ہو چلی تھیں۔ غلام رسول کے گھر پر اس کے خاندان کے علاوہ گاؤں والے بھی ہرجیت سنگھ کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ کار رکتے ہی انھوں نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ غلام رسول نے ہجوم کو ایک طرف ہٹا کر کار کا دروازہ کھلنے کی جگہ بنائی اور ہرجیت سنگھ کو کار سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اتنا بڑا جمگھٹا دیکھ کر ایک بار تو سنگھ صاحب حواس باختہ ہی ہو چلے تھے۔ اتنی گرم جوشی سے استقبال تو ہمارے ہاں کسی وزیر کا نہیں ہوتا جتنا ان لوگوں نے ہرجیت سنگھ کا کیا۔ سن رسیدہ افراد تو اس لئے مسرت آمیز تھے کہ تقسیمِ ہند کے کوئی پینتیس چالیس برس کے بعد ان کے گاؤں میں ایک خوبرو نوجوان 'سردار' آیا ہے جب کہ نوجوان ایک سردار لڑکے کو نگاہِ اوّل سے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے جن کی باہمی گفت وشنید و سرگوشیاں ہرجیت کے کانوں میں پڑ رہی تھیں کہ آج تو وہ سردار کو قریب سے دیکھ لیں اب تک تو ان کے بابت محض درد بھری کہانیاں ہی سنا کرتے تھے۔ غلام رسول

نے اپنے خاندان سے ہرجیت کا تعارف کروایا۔اس کے ابّا جان اور امّی جان کے آگے جب ہرجیت نے سرِتسلیم خم کیا تو انھوں نے اسے اپنی بانہوں میں لے کراس کے والدین کی مانند نِگھا پیار دیا۔اس کے بھائی سے مصافحہ کرتے وقت جب آداب وسلام کیا تو وہ اس سے ہم کنار ہو گئے۔ان کی ہمشیرہ فضا جوان دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھی ہرجیت کو بالکل اپنی بہن جیسی لگی۔اس نے زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور ایسا کرتے وقت اس کے دل نے عجیب سی لرزش محسوس کی تھی۔گاؤں کے باقی لوگ راہ ورسم کے لئے بے جا اظہارِ محبت دکھا رہے تھے غلام رسول ان کے ابّا جان نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا کہ آج آپ جایئے سردار جی طویل مسافت کر کے آئے ہیں، انھیں آرام کی اشد ضرورت ہے....آپ کل مل لینا... باقی اب یہ اپنے پاس ہی ٹھہریں گے کل سے آپ جتنا جی چاہے باتیں کر لینا۔اس وقت کھانا تیار تھا۔امّی جان نے دسترخوان بچھایا، منہ ہاتھ دھو کر ہرجیت نے سارے خاندان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور اسے بہت مزا آیا۔سونے کے لئے اسے غلام رسول کے کمرے میں جگہ ملی۔وہ جلد ہی وہاں جا کر دراز ہو گئے۔کنبہ کے تمام افراد وہیں ان کے پاس آ گئے اور وہ دیر رات تک ہرجیت کی خیر خبر پوچھتے رہے۔غلام رسول کی امّی نے تو ہرجیت کو اپنے پاس بٹھا لیا۔وہ بار ہا اس کے سر پہ بوسہ لیتی رہی۔ ہرجیت سنگھ بہت حیران تھا کہ یار! یہ لوگ بھی ہمارے جیسی ہی بولی بولتے ہیں ....ان کی تہذیب و پہناوے بالکل ہمارے مانند ہیں۔’امّی جان‘ لفظ اس کے لیے مرغوب تر تھا اس لیے وہ غلام رسول کی امّی کو اسی روز سے ’امّی‘ یا ’امّی جان‘ کہنے لگا تھا۔کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔پھر امّی جان سب کو لے کر کمرے سے چلی گئیں۔

اگلے دنوں میں ایک ایک کر کے گاؤں کے تمام لوگ ہرجیت سنگھ کو ملنے آئے...ملنے کیا سمجھو دیکھنے آئے۔دو جاتے تھے تو چار مزید آ جاتے تھے۔وہ بھی حیران تھے کہ ہرجیت کی حرکات وسکنات بھی بالکل ان جیسی ہی ہے۔ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔یہ سلسلہ اس کے وقتِ رخصت تک یوں ہی جاری رہا۔اس ربط وضبط کے دوران غلام رسول اسے گھمانے کے لیے لاہور شہر لے گیا اور اس نے چند دنوں میں نمایاں ترین جگہوں کو نگاہِ بے تاب سے دیکھ لیا۔ایک دن سکھ مذہب کے پانچویں گورو... گورو ارجن دیو جی کی شہادت کی یاد میں بنے گورودوارہ ڈیہرہ صاحب لاہور کے درشن کیے۔غلام رسول حسبِ معمول اسے وہاں چھوڑ کر اپنی دوکان پہ چلا گیا۔گورودوارے کے پاس ہی مینارِ پاکستان ہے جو کاری گری کا ایک بلند و بالا نمونہ ہے۔۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو کل ہند مسلم لیگ نے یہاں بیٹھ کر ایک الگ ملک پاکستان حاصل کرنے کے لئے قرارداد منظور کی تھی ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ کو اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۸ کو یہ بن کر تیار ہو گئی۔۶۲ میٹر کی بلندی والے اس ڈھانچے پر اس وقت کی ۷۰ لاکھ سے زائد رقم خرچ ہوئی تھی۔اس کی بابت تمام تفصیلات مینار پہ درج ہیں۔حب الوطنی کی یہ یادگارِ زمانہ ہرجیت کے من کو چھو گئی۔ملک کوئی بھی ہو...ایسا منظر دیکھ کر ہر شخص پہ جذبۂ حب الوطنی طاری ہونے لگتا ہے ہرجیت سنگھ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔وہاں سے واپسی کے وقت اسے (مینارِ پاکستان) کی چہار دیواری کا گیٹ کہیں نظر نہیں آیا...وہ بھول گیا اور پس و پیش میں پڑ گیا۔پھر اس نے وہاں تفریح کے لیے آئے کچھ نوجوانوں کو مدد کے لیے بلایا۔وہ کہنے لگے کہ سردار جی پہلے ہمارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرو...پھر ہم آپ کو باہر جانے کا راستہ بتائیں گے۔دراصل وہ پہلے ہی سے ہرجیت سنگھ سے ہم کلام ہونے کے لئے کوئی اسکیم بنا رہے تھے کہ انھیں یہ سنہری موقع مل گیا۔اس نے کہا چلو بھئی۔پھنس گیا تو کیا نہ کرتا۔وہ لوگ وہاں پڑے بینچوں پہ بیٹھ گئے۔انھوں نے بہت پیاری پیاری باتیں کی۔ہندوستان اور خصوصاً ہندوستانی پنجاب کی تہذیب وثقافت کے بابت متعدد سوالات کئے۔ہرجیت کے مختصر جوابات سن کر وہ مطمئن ہو گئے اور قلمی دوستی کرنے کے لیے اس کا نام و پتہ مانگنے لگے۔مخصوص اصرار انداز میں کہنے لگے کہ سردار جی! آپ یہاں رہو ہمارے پاس، ہم آپ کو مکان لے کر دیں گے۔ اتنی محبت نثار کرنے کے لیے ہرجیت نے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔پھر انھوں نے اسے راستہ سمجھایا اور وہ سڑک پار کر کے دوبارہ گورودوارہ صاحب میں پہنچ گیا۔

لاہور سے راوی دریا پار کر کے آگے شاہدرہ ٹاؤن آتا ہے۔وہاں پاور ہاؤس کے قریب کچّی آبادی مِل ایریا میں ہرجیت کی پھوپھی جس کا نام امرو تھا رہتی تھی۔اس کے پاس ان کا پتہ نوٹ تھا۔ایسے ہی ایک دن بعد دوپہر کو اس نے لاہور شہر سے وین پکڑی اور پھوپھی کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔آگے جا کر ایک دو جگہ وین بدلی بھی پر کسی وین والے نے اس سے ایک نیا پیسا بھی نہیں لیا۔اور بھیڑ ہونے کے باوجود بہ فرضِ عظیماً انھوں نے ہرجیت کو سیٹ پہ بٹھایا۔ پہلے ہی سے سیٹ پر براجمان ہر شخص اس کے لیے اپنی نشست خالی کرنے کے واسطے تیار ہو گیا۔تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت میں وہ لوگ اس سے اِس طرح ادب واحترام سے پیش آئے جیسے کسی ملک میں کوئی غیر ملکی وزیر یا بادشاہ کو ’گارڈ آف آنر‘ پیش کیا جاتا ہے۔وہ ایسے برتاؤ پر حیران تھا۔وین سے اتر کر وہ پیدل چل پڑا۔بعدازاں اس نے کئی لوگوں سے اپنی پھوپھی کے گھر کے بارے میں پوچھا اور چلتا رہا۔آگے جا کر ایک چوک میں اس نے جب ایک خاصی عمر کے فرد سے اپنے پھوپھا مراد علی کا گھر پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ میرا نام دادو ہے اور میں آپ کے پھوپھا کا بڑا بھائی ہوں۔ہرجیت نے ان کو بہ ادب سلام کیا۔دورانِ گفتگو جب ارد گرد کھڑے لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ انڈیا سے آیا ہے تو وہاں چند منٹوں میں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ایک پھل فروخت کرنے والے نے جھٹ سے سیب کاٹ کر پلیٹ اس کے آگے کر دی...دوسرے نے دودھ کا گلاس پیش کر دیا...تیسرے نے کچھ اور...اور....وہ اتنا کچھ کہاں کھا سکتا تھا...انھوں نے نے تو ہرجیت کی توبہ کرا دی۔چند لمحات میں اتنی شفقت وکرم نوازی...اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔وہ اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا اور اسے ’پاکستانی‘ کہنے والوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ دیکھو یہاں میرے ساتھ کیسا پیار بھرا برتاؤ ہو رہا ہے۔مشرقی پنجاب کے بارے میں معلومات دریافت کرنے کے لیے وہ لوگ کثرت سے بے تاب تھے۔اس نے ان

کے چند سوالات کے جوابات دیے بھی۔ دراصل ان دنوں مشرقی پنجاب میں اگرواد پھیلا ہوا تھا۔ کچھ سکھ تنظیمیں ایک الگ ملک 'خالصتان' حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔ اس لیے پاکستان میں ہرجیت سنگھ جہاں بھی جاتا تھا لوگ اس سے اسی 'لہر' کے بارے میں سوال کرتے تھے اور وہ ان سے یہ کہہ کر نجات پالیتا تھا کہ یہ چند دنوں کا کھیل ہے سب اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا اور وہ کوئی سیاستدان بھی نہیں ہے۔ وہ درخواست کرتا کہ برائے مہربانی آپ مجھ سے ایسے سوالات نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔ کچھ کھا پی لینے کے بعد دادو نے اسے بتایا کہ بیٹا تم تھوڑا آگے آ گئے ہو۔ مراد علی کا گھر پیچھے رہ گیا ہے۔ اس نے ایک لڑکے کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہرجیت کو مراد علی کے گھر تک چھوڑ کے آئے۔ خوشی و مسرت کے اس عالم میں کئی اور لڑکے اس کے ساتھ ہو لیے۔ پانچ سات لڑکے اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں محافظوں کی مانند چل رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اس کی راہ نمائی بھی کر رہے تھے۔ اس قلیل سفر میں اس ٹولی نے عمدہ و قابلِ تحسین گفتگو کی اور مشرقی پنجاب دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ ہرجیت نے انھیں پہلے پاس پورٹ اور پھر دیگر دستاویزات تیار کروانے کا طور طریقہ سمجھایا اور اِدھر آنے کی دعوت دی۔ اس پر وہ خوش ہو گئے۔ تقریباً بیس منٹ میں وہ منڈلی مقامِ مقصود پہ پہنچ گئی... کچی آبادی مِل ایریا، شاہدرہ ٹاؤن۔ ان میں سے ایک لڑکا گھر کے اندر گیا اور باقی ہرجیت سنگھ کے پاس باہر دروازے پر ہی رکے رہے۔ چند منٹ کے بعد ایک ۶۰ برس کی عمر کے قریب کا آدمی باہر آیا جس کے بارے میں اسے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اسکے پھوپھا مراد علی صاحب ہیں۔ ہرجیت نے ان کو ست شری اکال... سلام کہا۔ بعدازاں اپنا تعارف کرایا تو اس نے ہرجیت کو کس کر اپنی بغل میں لے لیا۔ چند لمحات وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ پھر ہرجیت نے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کو الوداع کہا۔ اس کی پھوپھی سماعت سے قاصر تھی۔ جب پھوپھا نے ان کے کان میں ہرجیت سنگھ کی آمد کے بارے میں سرگوشی کی تو وہ فرحت و شادمانی سے حیران ہو گئی، پھر کچھ سنبھلتے ہوئے اس نے ہرجیت کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے گلے لگ کر رونے لگی... زاروقطار روئی... مانو آج وہ دردِ فراق کو ان آنسوؤں میں بہا دینا چاہتی ہو۔ ان میں کچھ آنسو تو خوشی کے مشتر کہ تھے بالآخر اتنے طویل عرصے کے بعد کوئی اس کے مائیکے سے ایک لمبا سفر طے کر کے یہاں آن پہنچا تھا اور وہ بھی انڈیا سے۔ ماحول اتنا غمگین ہو گیا تھا لگتا تھا کہ فی الحقیقت وہاں دریا داغ فراط بہہ رہا ہو۔ پھوپھا نے اس کو تھاما اور ہرجیت سے جدا کیا۔ پھوپھی امر و رفتہ رفتہ نارمل ہو گئی اور اس کے لیے چائے پانی کا انتظام کرنے لگی۔ ان کے تینوں بیٹے کام پر گئے ہوئے تھے۔ مراد علی صاحب ہرجیت کے پاس بیٹھ گیے اور آزادی سے پہلے کی باتیں سنانے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اس کے شہر بھٹنڈہ سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع منڈی رام پورہ پھول میں تھانے دار کے عہدے پہ مامور تھے۔ اپنے بچپن کے یار بیلیوں کو یاد کرنے لگے۔ جن کے نام ان کو ابھی تک یاد تھے۔ اتنے میں پھوپھی چائے لے آئی۔ چائے کے ساتھ وہ ہرجیت کے آباواجداد اور گاؤں کے دیگر لوگوں کے بارے میں استفسار کرتی رہی۔ چائے ختم کرنے کے بعد ہرجیت نے ان سے جانے کی اجازت مانگی تو پھوپھی ایک دن رکنے پہ اصرار کرنے لگی۔ ہرجیت نے کہا کہ اس کے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ اس نے اور بھی کئی جگہوں پر جانا ہے۔ رب نے چاہا تو پھر ملاقات ہوگی۔ اس نے زورا زوری ایک کرتے پاجامے کا کپڑا ہرجیت کو دے دیا پر وہ تو اپنے ساتھ کچھ لے کر ہی نہیں گیا تھا۔ دراصل اسے یقین نہیں تھا کہ پھوپھی سے اتنی آسانی سے ملاقات ہو جائے گی، اس نے اس بات کو ہلکے موڈ میں لیا۔ مگر اس نے پھوپھی کا قرض اس وقت اتار دیا جب وہ کچھ عرصے کے بعد ہندوستانی پنجاب آئی۔ تب ہرجیت نے ان کا دیدار بھی کیا اور ان کو اچھے کپڑے کمبل اور شگون وغیرہ بھی تحفے کے طور پر دے دئے۔ سورج اب غروب ہونے کو تھا۔ ہرجیت نے پھوپھی کی قدم بوسی کی۔ پھوپھی نے اس کی پیشانی کے کئی بوسے لیے اور نم آنکھوں سے اسے وداع کیا۔ واپسی پر بھی جو وین ملی سبھی نے اس کے ساتھ پہلے جیسا بہتر سلوک کیا اور کوئی کرایہ نہیں وصول کیا۔ اس کے علاوہ وہ جہاں بھی گیا... کسی ٹیکے تانگے پر سوار ہوا، کرایہ دینے کے لیے جب نوٹ ان کو تھمانے کی کوشش کی سبھی نے ہاتھ جوڑ دئے اور پیسے لینے سے معذرت ظاہر کی۔ وہ ان اجنبی لوگوں کی مہمان نوازی آج تک بھلا نہیں پایا ہے۔ 'پاکستانی' کہتا ہے کہ اتنا ادب واحترام شاید ہم لوگ ان کو نہ دے پائیں جتنا انھوں نے اس کو دیا تھا۔ غلام رسول مقررہ مقام پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ملتے ہی بولا'' کہاں گم ہو گئے تھے... میری تو مٹھی میں جان آ گئی تھی۔ اتنی دیر لگا دی؟''

''کیا بتاؤں! آج میں اپنی پھوپھی سے مل کر آیا ہوں'' ہرجیت نے خوش ہو کر جواب دیا اور پھر تمام ماجرا اس کو سنا ڈالا۔ پوری کہانی سن کر غلام رسول بہت خوش ہوا۔ جب وہ گاؤں پہنچے اندھیرا ہو چکا تھا۔ ماں بھی رب نے کیا چیز بنائی ہے۔ جب تک اس کے لعل گھر نہ آ جائیں اس کی مضطرب نگاہیں دروازے پر ٹکی رہتی ہیں اور اپنے بیٹوں کو دیکھ کر وہ رب کا شکر ادا کرتی ہے۔ امّی جان کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی کب سے کھانے پہ ان کا انتظار کر رہی تھی۔ کھانا کھاتے وقت دیری کی وجہ سن کر وہ مطمئن ہو گئی۔ ہرجیت اگر اس کشادہ دل خاتون کو مل کر اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا تو وہ بھی اس کا گھر آنا اپنی نیک بختی قرار دیتی تھی۔ غلام رسول سے زیادہ وہ ہرجیت کے لیے فکر مند تھی۔ نت نئے نئے پکوان بنا کر اس کو کھلاتی تھی۔ اس کے سر کے بالوں میں تیل لگا کر اچھی طرح مالش کرتی اور پھر کنگھی کر دیتی۔ غلام رسول کی امّی یہ کام بسر و چشم سے ترجیحی بنیاد پر کرتی تھی۔ کبھی کبھی فضا بھی اس کام کو انجام دینے کی ضد کرتی۔

ہرجیت سنگھ کا زیادہ وقت گاؤں والوں کے ساتھ گفتگو میں صرف ہوتا تھا۔ اِدھر سے ہجرت کر کے گئے عمر رسیدہ اشخاص تقسیمِ ہند کا تذکرہ ایسے کرتے تھے جیسے کوئی خوفناک فلم دیکھ رہا ہو۔ بعد میں افسوس بھی ظاہر کرتے تھے کہ جو کچھ بھی ہوا برا ہوا... پنجاب سکون و قرار میں آباد تھا... انگریز نے دیدہ و دانستہ اس کی تقسیم کر دی اور انھیں اپنے وطن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا پڑا۔ وہاں

کے آبائی لوگ اس گاؤں سے ہجرت کر کے گئے سکھ دوستوں کو بڑی شدت سے یاد کرتے تھے۔ ہرجیت نے ایک بات نوٹ کی کہ ایک نوجوان لڑکی کئی دن سے اس کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولتی تھی۔ اس نے امّی جان سے اس حسین وجمیل لڑکی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ بیٹا یہ سکینہ ہے اور یہ لوگ بھی آپ کی طرف سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں۔ اگلے دن جب وہ سویرے سویرے غسل کرنے کے بعد دھوپ میں اپنے سر کے بال سکھا رہا تھا... سکینہ آدھمکی ''سردار جی! اسلام وعلیکم۔''

''جی وعلیکم اسلام'' اس نے بغیر اوپر دیکھے اس کو فوراً اسی کے انداز میں جواب دے دیا اور جب اپنے چہرے سے زلفیں ہٹا کر دیکھا تو حیران ہو گیا۔'' جی بیٹھیے'' ہرجیت نے اپنی منتشر سانسوں کو یکجا کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ آج تم ہمارے گھر آ جانا'' اس نے 'حکم' سنایا۔

''کیوں؟... ایسی کیا بات ہے'' اس نے اصلیت جاننا چاہی۔

''پتا نہیں... یہ تو میری امّی ہی بتا سکتی ہے... انہوں نے ہی آپ کو بلایا ہے۔''

''امّی کو یہاں بھیج دو... جو بات کرنی ہے اِدھر ہی کر لیں گی۔'' اس نے بات ختم کرنی چاہی۔ آج ہرجیت کی 'امّی' بھی گھر پر نہیں تھیں... کہیں باہر گئی ہوئی تھیں اور غلام رسول بھی نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سکینہ جلد از جلد چلی جائے... کہیں کوئی بکھیڑا نہ کھڑا ہو جائے.... امّی جان کے آنے تک یہ بلائے ناگہاں ٹل جائے تو بہتر ہے۔

''امّی نہیں آسکتیں..... گزشتہ کئی روز سے ان کی طبیعت ناساز ہے۔ لہٰذا امّی نے آپ کو گھر آنے کی سخت تاکید کی ہے۔'' اس نے اپنی طرف سے بات انجام تک پہنچا دی اور چلتی بنی۔

ہرجیت گہری فکر میں ڈوب گیا کہ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جس کے لیے اسے بلایا گیا ہے۔ جان نہ پہچان... پہلے کبھی میل نہ ملاپ... اس نے تو ہرجیت کو پریشانی میں ڈال دیا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے فوراً ان کے گھر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ جانے وہاں کیا سانحہ پیش آ جائے اس لیے امّی کو گھر آنے دو۔ وہ ہی عمدہ مشورہ دیں گی۔ ویسے بھی جب کبھی ہرجیت کو کسی گھر سے دعوت نامہ ملتا تو وہ کبھی بھی وہاں اکیلا نہ جاتا تھا۔ ہمیشہ غلام رسول کی امّی یا ابّا اس کے ہم راہ ہوتے تھے۔ امّی جان مغرب کے بعد گھر آئیں۔ وہ کافی تھکی ماندی تھی اس لیے ہرجیت نے اس وقت امّی جان سے سویرے والے واقعہ کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اگلے دن صبح کے وقت حسبِ معمول وہ غلام رسول کے ساتھ سیر پر نکل گیا پیچھے سے سکینہ آ گئی اور آتے ہی امّی جان سے الجھ پڑی ''خالہ جان کہاں ہے آپ کا سردار بیٹا؟

''سکینہ...؟ کیا بات ہے؟... ہرجیت سے کیا کام ہے؟'' امّی نے کہا۔

''آپ کو پتہ ہی ہے کہ تقسیمِ ہند کو ایک طویل زمانہ گزر گیا ہے پر میری امّی ہے کہ مشرقی پنجاب کے آبائی گاؤں کو ابھی تک بھولی نہیں ہے... ان کو معلوم ہو جائے کہ وہاں سے کوئی شخص اِدھر آیا ہے بس اس کو ملنے کے لیے پریشان ہو جاتی ہے۔ چناں چہ ان کو جس دن سے اس سردار کی آمد کی بھنک لگی ہے وہ اس کو ملنے کے لیے بے قرار ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں، نہیں تو وہ کب کی یہاں آ جاتی اس لیے بار بار مجھے بھیج دیتی ہے کہ جاؤ اس سردار لڑکے کو بلا کر لاؤ پر اس سردار جی کے تو نخرے ہی بہت ہیں... یہ تو جانے پر راضی ہی نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں تم ذرا بیٹھو... وہ سیر سے واپس آنے ہی والے ہیں... میں اس کو آپ کے ساتھ بھیج دیتی ہوں... اب تو خوش ہو۔'' امّی نے اس کو تسلّی بخش جواب دیا۔ اس پر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ سیر سے واپس لوٹ آئے۔ سکینہ کو دیکھتے ہی ہرجیت کو علم ہو گیا کہ وہ کس کام کے لیے آئی ہے۔

''بیٹا ادھر آؤ۔'' امّی نے ہاتھ کے اشارے سے ہرجیت کو بلایا۔ وہ بنا کچھ کہے ان کے پاس چلا گیا۔

''بیٹا تم سکینہ کے ساتھ جاؤ... ان کی امّی آپ کو ملنا چاہتی ہے۔''

''جی... امّی جی'' وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ اس کو امّی نے بھی نوٹ کیا اور وہ بولی:

''بیٹا ڈرنے کی کوئی بات نہیں... بے فکر ہو کر اس کے ساتھ جاؤ۔''

اس نے سکینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تسلّی دی۔

سکینہ ہرجیت کے آگے آگے چل پڑی جو اس کی راہ نمائی کرنے کے لیے پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ اس نے خاموشی سے سکینہ کا تعاقب کیا اور کچھ دیر بعد وہ اس کے گھر پہنچ گئے۔ سکینہ نے دروازہ کھولا تو سامنے برآمدے میں تقریباً پچاس سالہ خاتون چارپائی پر بیٹھی نظر آئی۔ ہرجیت کو دیکھتے ہی اس عورت کی آنکھوں میں بے چینی و بے قراری اچھل پڑی اور وہ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کے چہرے کی آب و تاب دیکھنے لائق تھی۔ ہرجیت نے خراماں خراماں چلتے ہوئے پہلی نگاہ میں ان کے گھر کا جائزہ لیا اور آہستگی سے اس کی طرف آگے بڑھا اور سر جھکایا۔ اس نے بنا کچھ کہے ہرجیت کو اپنے گلے لگا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر آشیرواد دیا۔ بعد ازاں ہرجیت کو قریب پڑی دوسری چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہرجیت نے دیکھا کہ وہ بہت جذباتی ہو گئی ہیں اور کوئی گفتگو نہیں کر پا رہی اس لیے وہ خود ہی ان سے مخاطب ہوا۔

''اور سناؤ ماں جی کیا حال ہے آپ کا؟... کیسے یاد کیا؟''

''مشرقی پنجاب میں تیرا کون سا ضلع اور کون سا گاؤں ہے بیٹا؟ اس نے خاموشی توڑی۔

''جی ضلع جلندھر میں گاؤں ہری پُر ہے''

''جو کبھی پُر سے سنا ہوا ہے؟''

''بالکل پر آپ کو کیسے معلوم ہے؟'' ہرجیت نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے بنا مزید سوال کئے اٹھ کر ہرجیت کو ایک بار پھر اپنے سینے سے لگا لیا....پھر ان کے منہ سے صرف یہ جملہ نکلا'' ہائے میں مر جاؤں! میرا پُتر! میں صدقے! میں واری...'' ہرجیت کسمسایا لیکن اس کے ہاتھوں کی گرفت سے لگتا تھا کہ وہ (ہرجیت) اس کے لئے کوئی 'خاص' ہے۔ وہ ہرجیت کو اپنی بانہوں کی گرفت سے آزاد کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔ ہرجیت ڈر گیا کہ کہیں وہ دونوں گر نہ پڑیں۔ پھر ہرجیت نے انہیں سنبھالا اور آہستہ سے چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ ابھی اُن سے مزید بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بزرگ خاتون پھر خاموش ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر بہنے لگے تھے۔ ہرجیت کا اشارہ پا کر سکینہ بھاگ کر ایک گلاس پانی لے آئی۔ جب پانی اس کے ہونٹوں کو لگا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے تخیّل میں ہرجیت ابھی بھی اس کی بانہوں میں تھا۔

پھر اس نے کہنا شروع کیا۔'' میرا نام رحمت بی بی ہے۔ ہم لوگ سنتالیس کے بٹوارے کے وقت وہاں سے اٹھ کر آئے تھے۔ میں تیرے گاؤں کے ایک سکھ سردار گوربخش سنگھ کو جانتی ہوں۔ دونوں گاؤں کی حد پر اس کی زمین ہماری زمین کے ساتھ لگتی تھی۔ اس کا کنواں بھی ہمارے قریب ہی تھا۔ وہ روٹی پانی بھی ہمارے ساتھ ہی کھاتا تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا گوردِت سنگھ جس کی عمر اس وقت کوئی سات آٹھ برس کی تھی، وہ بہت پیارا بچّا تھا۔ میں نے کئی بار کنوئیں پر اس کے سر کے بال دھوئے تھے۔ گوربخش سنگھ خدا ترس ایماندار بندہ تھا۔ اس مشکل وقت میں ہم نے اپنا پیسہ ٹکا اس کے حوالے کر دیا تھا۔ جب کچھ ٹکا ٹکائی ہو گئی تو میرے ابّا ایک بار اپنے آبائی گاؤں چلے گئے۔ اس شریف آدمی نے ہماری امانت جوں کی توں ابّا کے سپرد کر دی۔ وہ مسلسل تقسیمِ ہند کے وقت کئے گئے ترکِ وطن کی داستان سناتی رہی۔ ہرجیت کی آنکھیں ان کے چہرے پہ منجمد ہو گئی تھیں۔ زبان گنگ ہو گئی۔ وہ کچھ بھی بول نہیں پا رہا تھا... چوں کہ گوردِت سنگھ اس کا باپ تھا اور گوربخش سنگھ اس کا دادا۔ پھر ہرجیت نے اپنے بکھرے ہوئے سانسوں کو یکجا کر کے ان کو ساری داستان سنائی۔ جب اسے پتہ چلا کہ ہرجیت گوربخش سنگھ کا پوتا ہے تو وہ اور خوش ہوئی۔ پھر اس نے بڑی اپنائیت سے اس کا منہ ماتھا چوما۔ قدرتوقف کے بعد جب نارمل ہوئی تو اپنے خاندان کو فخر سے بتانے لگی کہ دیکھو میرے مائیکے سے کون آیا ہے؟۔ جب کسی خاتون کے مائیکے سے کوئی آئے تو وہ تو ویسے ہی پھولے نہیں سماتی یہاں تو ایک بندہ طویل فاصلہ طے کر کے پہنچا تھا وہ بھی انڈیا سے اس لئے رحمت بی بی کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ انھوں نے ہرجیت کی بہت خدمت کی، وہ اپنا تمام و کمال اس پہ نثار کر دینا چاہتی تھی۔ بارڈر پار سے اسے اتنا پیار ملے گا یہ تو ہرجیت کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ان کے اصرار پر ہرجیت نے وہ رات ان کے گھر پر ہی گزاری.....

غلام رسول کی امّی کو سکینہ مطلع کر آئی تھی کہ ہرجیت آج رات اُن کے یہاں ہی سوئے گا۔ ہرجیت نیم خوابی میں لیٹا رہا۔ رحمت بی بی کو ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے گھر کوئی فرشتہ آ گیا ہو، اس نے رات کو کئی دفعہ اٹھ کر ہرجیت کے منہ سے چادر کا پلّو کھسکا کر اسے جس ممتا بھری نگاہ سے دیکھا اس کو الفاظ میں نہیں بیان کیا جا سکتا۔ اس وقت ہرجیت اپنی ہندوستانی ماں کو یہ بات بتانا چاہتا تھا کہ تم کہتی تھیں پاکستان نہ جاؤ وہاں تیرا کون ہے، دیکھو یہاں تو ممتا کا سمندر اپنی موجوں پر ہے۔ لیل و نہار چار اطراف محبت کی بارش ہو رہی ہے .....وہ بھی موسلا دھار۔

ہرجیت کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں پر محبت کا آبشار رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے غلام رسول کو اپنی روانگی کے بارے میں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ اس دن وہ صبح صادق اٹھ گیا، غسل کیا، ناشتہ لیا اور لوٹنے کو بالکل تیار تھا کہ رحمت بی بی آ گئی۔ اس نے اس (ہرجیت) سے وعدہ لیا تھا کہ جس دن اس کی واپسی ہو وہ ان کو اطلاع ضرور دے گا۔ ہرجیت کو دینے کے لئے ان کے ہاتھ میں ایک رنگدار کھیس اور اس کے اوپر رکھا پچاس روپے کا نوٹ تھا جس پہ بنی قائدِ اعظم محمد علی جناح کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ ہرجیت کے اس سامان کو لینے سے انکار کرنے پر وہ بولی'' دیکھ میرے سونے جیسے پُتر! انکار مت کرنا۔ اللہ کی کرم نوازی سے مجھے ایک مدّت کے بعد کوئی مائیکے والا ملا ہے۔ بھتیجے کا مان تان کرنا تو میرا حق ہے۔''

غلام رسول کے خاندان والوں سے بھی ہرجیت کی بہت عزت افزائی کی گئی۔ تکلف کی تو بات ہی چھوڑ وان کے ذریعہ اٹھوائے گئے الفت و محبت کے وزنی بوروں سے اس 'پاکستانی' کا سر خم ہو رہا تھا۔ یہ حرمت و توقیر کی زنجیر ہی تھی جو ہرجیت کو پاکستان سے واپس لوٹنے سے روک رہی تھی۔ غلام رسول کی امّی اور ابّا نے اس کی خاطر و مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس لیے اس نے کبھی بھی اپنے ہندوستانی ماں باپ کی کمی محسوس نہ کی تھی۔ جب نم آنکھوں سے اس نے امّی ابّا کی قدم بوسی کی تو انھوں نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس کا ماتھا چوم لیا، اس نے چھوٹی بہن فضا کو ڈھیر سارا پیار دیا اور وعدہ کیا کہ وہ بہن کی شادی پر پاکستان ضرور آئے گا اور اپنے ہاتھوں سے اُسے ڈولی میں پائے گا۔ گرد و پیش کھڑے لوگوں کو سلام و ست سری اکال کہا، رحمت بی بی کو بھی جس نے اسے ایک بار پھر اپنی چھاتی سے لگا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ غلام رسول نے واگہہ بارڈر پہ پہنچنے کے لئے جیپ اسٹارٹ کر لی، ہرجیت سنگھ بھی بوجھل قدموں سے آگے بڑھتا ہوا اس کے بغل والی نشست پر جا بیٹھا۔ تمام گاؤں والے اسے ہاتھ ہلا کر چشمِ پرنم سے وداع کر رہے تھے پر رحمت بی بی نے تو اس دم ایک ٹک نظریں ہرجیت پہ ٹکائی ہوئی تھیں وہ ذرا بھی پلک جھپکا نہیں رہی تھی۔ ہرجیت سنگھ کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی ان محبت بھرے انسانوں میں سے ہی ایک انسان ہے اور اس کا مان ہے پاکستانی۔

گرین کارڈ

عامر بیگ
(یو ایس اے)

ایٹی ایسٹ کی سیدھی سنسان سڑک اور میں سیونٹی پر کروز لگائے شکا گو کی جانب محو سفر او ماہا سے نکلے مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو چلا تھا دیو قامت ونڈ ملز سڑک کی دونوں جانب ایستادہ جنکے لمبے مخروطی پر ہوا کے زور سے کبھی تیز اور کبھی سلو موشن میں گھومتے جاتے تھے دور سے ان پر نظریں ٹھہرائے میں سوچوں میں گم چرا گاہوں میں چرتی گائیوں کے گوبر کی سمیل اور مکئی کے کھیتوں کی بھینی بھینی خوشبو گاڑی کے بند شیشوں سے بھی سونگھی جا سکتی تھی سورج کی پہلی کرن نے سبزے کا منہ ابھی دھلایا ہی تھا کہ اٹلانٹا جارجیا سے میجر صاب کی مس کال نے میرے دماغ کی سکرین پر منظر بدلا میجر اسد بشیر سے میری پہلی ملاقات پسکاٹوے نیوجرسی میں انکے چھوٹے بھائی ڈاکٹر آصف بشیر کی ممبر پسکاٹوے بورڈ کی الیکشن کیمپین میں ہوئی تھی جہاں پر میں ڈاکٹر صاحب کا کیمپین مینجر تھا میجر صاب اپنے بھائی کی مدد کو پاکستان سے یہاں کے الیکشن میں جھر لو پھیرنے کی نیت سے آئے ہوئے تھے جلد ہی ان سے بات چیت ہوتے ہوتے لطیفوں اور پھر انکی رنگین زندگی کی رنگیں داستانیں سنتے سنتے دوستی ڈاکٹر صاحب سے بھی مضبوط ہوگئی ایک دن کہنے لگے یار عامر مجھے یہاں کی لائف بڑی پسند آئی ہے تو مجھے کرو دکھتا ہے یہاں پر فیملی کے ساتھ مستقل رہنے کا کوئی جگاڑ تو بتا میں نے کہا رٹگر میں آئی ٹوینٹی نکلواتے ہیں ماسٹرز میں ایڈمشن لے لیں دو سال تک موج کریں پھر وہیں کسی گوری کے ساتھ آئی ڈو آئی ڈو اور ساری عمر کے لیے گوری تیرا گاؤں بڑا پیارا گاتے پھریں بولے نا یار میری بڑی بیٹی کالج میں ہے اس عمر میں گوری کالی نہیں کوئی ڈھنگ کا طریقہ بتاؤ میں تو سمجھا تھا کہ تو واقعی سمجھدار ہے مجھے بھی طیش آ گیا بولا کہ جائیں اپنے بابا خبیث کو یاد کریں اور اسائیلم فائل کر دیں۔ بابا خبیث۔۔؟ انہوں نے ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر ناخنوں سے اپنے تازہ کٹے بالوں کو سر کے پیچھے سے کھرچا۔ ارے یار مشرف کو جس کے آپ ایک عرصہ تک چیلے رہے ہیں اگر گروا اپنے ملک واپس نہیں جا سکتا جہاں دس سال تک سیاہ سفید کا مالک رہا ہو تو آپکو کون الو کا پٹھا واپس برداشت کرے گا بول دیں مجھے وہاں جان کا خطرہ ہے بولے جان کا خطرہ تو مجھے واقعی ہے ایک دفعہ گاؤں جاتے ہوئے میری گاڑی پر فائرنگ بھی ہو چکی ہے جسکا پولیس میں اندراج بھی ہے میں نے کہا تو پھر ملائیں ہاتھ آپ فیوچر میں اپنا قومی ترانہ پاک سر زمین شاد باد کی بجائے دی سٹار سپینگلڈ بینر گانے والے ہیں انہیں میری یہ بات دل کو لگی ایک اٹارنی سے میری جان پہچان تھی بات کی تو تین ہزار کا نسخہ بتایا کہنے لگے یہ تین ہزار تیرے سر سے وار کر اٹارنی کو دے دوں گا پر تیری شخصی گارنٹی بھی درکار ہوگی کچھ دیر سوچ کر میں نے حامی بھر لی اور کہا کہ کیا یاد کریں گے آپ بھی پاک فوج کی خاطر یہ قربانی بھی دینے کو تیار ہوں کاغذات جمع کروا دیئے گئے جلد اٹارنی کو انٹرویو کی کال بھی مل گئی بڑے دن کو میں نے صبح سویرے میجر صاحب کو انکے بھائی کے گھر سے پک کیا اور امیگریشن پہنچ گئے جہاں تھوڑی دیر میں باری آ گئی کیس نمبر کے ساتھ ساتھ ایک پاکستانی نژاد امریکن جج بھی الاٹ ہو گیا اور پھر جج نے ہیرنگ پر تین سال کی ڈیٹ دے دی لو جی میجر صاب اب تین سال تک مزے کریں۔ چند دن کے بعد میجر صاب کے بھی پر نکل آئے بولے جتنی تنخواہ مجھے آرمی سے ملتی تھی اس سے تو پانی کا خرچہ بھی پورا نہیں ہوتا تھا قرضے پے قرضہ چڑھا ہوا ہے فوج سے ملا ہوا پلاٹ بھی گروی رکھا ہے مجھے ہاتھ پاؤں مارنے دے زندگی رہی تو پھر ملیں گے اٹلانٹا جارجیا میں میرا ایک پرانا ہم نوالہ اور ہم پیالہ کا گیس سٹیشن ہے وہاں جا کر اس کے ساتھ کام کروں گا قرض اتارنے کے ساتھ ساتھ گھر والوں کو بھی دانہ دنکا کے لیے کچھ نہ کچھ پیچھے بھیجوں گا میں نے گلے لگا کر گرے ہاؤنڈ میں بٹھا دیا۔ ہر دوسرے دن فون آ جاتا لمبی لمبی باتیں ہوتیں دو سالوں میں نہ صرف قرض اتر گیا گھر والے بھی خوشحال ہو گئے بیوی کی یاد آتی تو اسے فون نہیں کرتے بولتے جہاد کر رہا ہوں ساری عمر موج کی ہے اب کچھ کرنے کا ہے اس دوران میں ایک چکر میری طرف بھی لگا محنت کر کر کے اور راتوں کو جاگ جاگ کر انکی آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے اور بھی گہرے ہو گئے تھے مجھے بڑا ترس آیا میں نے کہا چلیں آپکا منہ گیلا کراتا ہوں بولنے لگے خود چکھتا تک نہیں اور چلا ہے میرا بھلا کرنے تیری بہت سی عادتیں مجھ میں ٹرانسفر ہو چکی ہیں۔ تین سال کے بعد کورٹ کی تاریخ پڑی تو جج نے اگلے دس سال کے بعد کی ڈیٹ دے دی خوشی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت ماحول کو خوشگوار کرنے کے لیے میں نے مستی کی اور کہا اچھا ہے تب تک پانچواں بچہ بھی بڑا ہو چکا ہو گا بولے پر میرے تو چار ہی بچے ہیں ایک لمحے کو تو انہیں میری بات سمجھ نہیں آئی لیکن جب آئی تو ایک بڑی گالی روکتے روکتے ہنسی کا فوارہ جو پھوٹا تو آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اسکے بعد میجر صاحب کی فون کالز میں تواتر برقرار نہیں رہ سکا اب جب انکی کال آئی تو میں چونکا مس کال کے بعد انکی عادت تھی کہ اگر میری طرف سے کال نہیں آئی اور معاملہ سیریس ہے تو ایک اور مس کال ٹھیک پانچ منٹ بعد دوبارہ کرتے میں نے فون ہینڈ فری پر لگا دیا جناب میجر صاب کیا نئی تازہ ہے؟ یار تو نے حج پر میرے لئے دعا کی تھی میں نے کہا میدان عرفات میں جو شخص بھی میرے حافظے میں تھا میں نے سب کو یاد کر کے ان سب کے لئے دل سے اور رو رو کر دعائیں مانگیں تھیں بولے تمہاری دعا قبول ہوگئی میں نے کہا اچھا وہ کیسے کہنے لگے ایک رات ڈیوٹی پر ایک کلا ہاتھ میں گن لئے اندر سٹور میں گھس آیا اور بولا نکال دے جو کچھ بھی ہے میں نے ایک دی پرے جا کر دیوار میں سر لگا ہاتھ سے پستول دور جا گرا میجر صاب پاکستان میں کمانڈوز کو ٹرین کیا کرتے تھے بولے میں نے پولیس کال کر دی اوپر سر پر لگا کیمرا یہ منظر کیچ کر رہا تھا پولیس کا لا اور کیمرے میں محفوظ فلم لیکر چلی گئی اگلی صبح ہر لوکل چینل پر ٹاپ سٹوری گھنٹے گھنٹے کے وقفے سے رات کے واقعہ کی فلم کے ساتھ انگ کومینٹری کسی ایکشن مووی کی طرح ریپیٹ ہو رہی تھی چند دنوں بعد اٹارنی سے بات ہوئی اس نے کال کر کے فلم منگوالی مہینے بھر میں گرین کارڈ میری جیب میں تھا۔

بشرطِ استواری

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

باخبر حلقوں اور ایوانوں میں کئی دنوں سے ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ جُوں جُوں تقریب کا دن نزدیک آرہا ہے ڈُوں ڈُوں لوگوں کے قیافے اور اندازے نجی محفلوں کے علاوہ اخبار کے کالموں اور اکا دُکا ٹاک شوز میں بھی زیرِ بحث آرہے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ صاحب کو اس طرح کی عوامی تقریب میں شریک ہوکر اپنا وقار داؤ پر نہیں لگانا چاہیے جبکہ دوسرے طبقے کی دلیل یہ ہے کہ چار دہائیوں تک جو شخص بندھے ہاتھ اور سِلے ہونٹوں کے ساتھ فرائضِ منصبی نبھاتا رہا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد وہ عوام کے سامنے اپنا نکتہ نظر بیان کرے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں کچھ تجاویز دے۔ قواعد وضوابط میں اصلاح کی جانب توجہ دلائے۔ ہر بات کی تان اس بات پر ٹوٹ رہی ہے کہ چلو جی! تقریب کون سا دُور ہے چند دن بعد بلی تھیلے سے باہر آ جائے گی۔

سامعین کا جوش وخروش اور بے چینی کو بھانپتے ہوئے اسٹیج سیکرٹری نے روسٹرم پر آ کر گرج دار آواز میں منیر نیازی کا مشہور ومعروف شعر:

ادب کی بات ہے ورنہ منیرؔ سوچو تو
جو شخص سنتا ہے، وہ بول بھی تو سکتا ہے

پڑھنے کے بعد اسٹیج پر رکھی چھ میں سے ایک خالی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

سامعینِ محترم انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ مہمانِ خصوصی تشریف لا چکے ہیں اور استقبالیہ تقریبات ادا کی جارہی ہیں۔ اسٹیج سیکرٹری آخری الفاظ مکمل طور پر ادا نہ کر پائے تھے کہ ایک نہایت منحنی، مہذب اور شائستہ شخص آنکھوں پر لگے دبیز چشمے کو درست کرتے ہوئے چند ہمراہیوں کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے اور اسٹیج پر جا کر سامعین کی جانب سلام، آداب اور احترام سے سر جھکاتے ہوئے مذکورہ کرسی کے دائیں ہاتھ میں بیٹھی رعب دار شخصیت کی اجازت سے اپنی کرسی میں بیٹھ گئے۔

اجازت دینے والی شخصیت کے سر کی جنبش سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہوں نا ہوں آج کی تقریب کے صدرِ محفل اُنہیں ہی ہونا چاہیے کیونکہ اُن کی بھاری بھرکم شخصیت اور چہرے کا رعب داب دائیں بائیں بیٹھی شخصیات کی نسبت تنک انداز کا تھا۔

یہ دنیا کی واحد نہ سہی مگر انوکھی اور منفرد تقریب ضرور تھی۔ جس میں ایک ایسے شخص کو خراجِ تحسین پیش کیا جانا تھا جو جس ادارے میں خالی ہاتھ داخل ہو اور سینتیس سال آٹھ ماہ نو دن گزرنے کے بعد اُسی ادارے سے خالی ہاتھ واپس جا رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ طاقتور کرسی اور طاقتور قلم کے باوجود مذکورہ شخص نے کبھی کسی شکل میں نہ خود فائدہ اٹھایا اور نہ کسی کے حق میں بے جا طور پر ہر دو طاقت کا استعمال کیا۔

تقریب کی ابتداء میں اسٹیج سیکرٹری نے موقع کا فائدہ اٹھا کر مہمانِ خصوصی کے تعارف کو تقریر میں بدلنے کی بھرپور کوشش کی جسے اسٹیج پر بیٹھی شخصیات نے دھیمی آوازوں میں تنبیہہ کے انداز میں اختتام کو پہنچایا۔ سب سے پہلے بائیں جانب بیٹھے پہلی کرسی والے صاحب کو دعوت کلام دی گئی۔ دائیں بائیں کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر پرزہ نما چند کاغذ روسٹرم پر رکھتے ہوئے موصوف نے دھیمے لہجے میں تقریر کا آغاز کیا۔ ساتھ ہی ایک چٹ کو بغور دیکھنے کے بعد یہ کہہ کر جیب میں واپس رکھ لیا کہ اسٹیج سیکرٹری صاحب جس تفصیل سے مہمان خصوصی کا تعارف کرا چکے ہیں اُسے دہرا کو میں آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، صاحب جب اس ادارے میں تشریف لائے تو میں معمولی حیثیت کا ملازم تھا۔ میرے قیاس میں بھی نہ تھا کہ میں صاحب سے ہاتھ ملانا تو کیا روبرو بھی ہوسکوں گا مگر حیرت کی اُس وقت انتہا نہ رہی جب صاحب نے بڑے لوگوں سے تعارف کی ابتدا کرنے کے بجائے پچھلی رو میں کھڑے جونیئر لوگوں سے گلے مل کر باری باری خیریت دریافت کی اور بجائے ہمارا نام دریافت کرنے کے ہر کسی کو اپنا نام بتلا کر تعارف کراتے رہے۔

جُوں جُوں گفتگو آگے بڑھتی رہی ڈُوں ڈُوں مقرر کا جوش وجذبہ بڑھتا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک مدت سے اس موقع کے خواہاں تھے اور قسمت نے آج انہیں یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ صاحب موصوف کی ایمانداری، انصاف پسندی، بہادری اور جرأت کے وہ تمام واقعات سامعین کے روبرو پیش کر دیں جو اُن کے مشاہدے میں اس عرصے کے دوران آئے۔

مسئلہ وقت کی قلت کا درپیش تھا سو اسٹیج سیکرٹری نے مختصر رقعہ روسٹرم پر رکھ کر اُن کی توجہ دلائی تو وہ نہایت سعادت مندی کے ساتھ تقریر کو سمیٹتے ہوئے سامعین کا شکریہ ادا کر کے اپنی جگہ جا بیٹھے۔ ایک بار پھر اسٹیج سیکرٹری کی لاٹری نکل آئی مگر اُنہیں وقت اور موقع کا احساس ہوگیا تھا۔ اپنی جانب سے کچھ کہنے کے بجائے دوسرے فاضل مقرر کے تعارف میں چند الفاظ کہہ کر روسٹرم کے دائیں جانب رکھی مخصوص کرسی پر جا بیٹھے۔

دوسرے مقرر شلوار قمیض کے اوپر بھورے رنگ کی واسکٹ اور کھچڑی بالوں کے ساتھ اسٹیج پر آئے تو انہوں نے بلند آواز میں ''السلام علیکم'' کہہ کر گفتگو کی ابتدا کی۔ سب سے پہلے موصوف نے وقت کی قلت کا یہ کہہ کر ذکر کیا کہ صاحب میں جادوگر ہوں نہ شعبدہ باز اور نہ ہی مجھے فنِ تقریر پر کسی طرح کا عبور حاصل ہے۔ آپ ہی بتلایئے ان حالات میں چار دہائیوں پر مشتمل ایسے شخص کی کہانی میں کیونکر بیان کرسکتا ہوں جو ملازمت کے آغاز میں جس گھر میں قیام رکھتا

تھا آج بھی اُسی گھر میں مقیم ہے۔ جس وضع کا مہمان خانہ اور سامانِ آرائش اُن کے گھر میں اُس وقت موجود تھا آج بھی اُسی شکل میں موجود ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اعلیٰ مرتبے کے حامل آج کے مہمانِ خصوصی اور ان کے اہلِ خانہ جن چارپائیوں پر اُن دنوں سوتے تھے آج بھی وہی چارپائیاں ان کے زیرِ استعمال ہیں۔ لفظ چارپائی میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا کیونکہ پلنگ، مسہری یا بیڈ کا گزر کبھی اس گھر میں نہ ہوا۔ حد تو یہ ہے کہ آپ سے نچلے درجے کے افسران کے پاس ایک یا ایک سے زائد نئے ماڈل کی گاڑیاں ہوتی ہیں جبکہ صاحب کے پاس گاڑی کے نام پر کسی قسم کی ذاتی سواری پہلے دن تھی نہ آخری دن۔ ملازمت کے تمام عرصے میں صاحب پبلک ٹرانسپورٹ میں بیٹھ کر دفتر آتے رہے۔ بارہا یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ صاحب جس بس یا ویگن میں آفس کے لیے آرہے ہیں اُسی بس یا ویگن میں وہ ملزم بھی سوار ہیں جنھوں نے صاحب کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔

یہاں تک پہنچتے ہوئے فاضل مقرر کی آواز بھرّا گئی اور وہ جیب سے رومال نکال کر آنکھیں صاف کرتے ہوئے یہ کہہ کر اسٹیج سے واپس چلے گئے ''معافی چاہتا ہوں گفتگو کو مزید جاری رکھنا میرے لیے ممکن نہیں۔''

اس بار اسٹیج سیکرٹری کا لب و لہجہ اور گفتگو فاضل مقرر کی گفتگو کے زیرِ اثر دھیمہ اور مختصر رہا اور وہ تیسرے مقرر کا تعارف کرائے بغیر اُنھیں دعوتِ کلام دے بیٹھے۔ درمیانی عمر کے تیسرے مقرر سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھے۔ غالباً پان یا سگریٹ سے شوق بھی فرماتے تھے اس لیے روسٹرم پر رکھے ڈبے سے ٹشو نکال کر اچھی طرح منہ صاف کرنے کے بعد کھنکار کر گفتگو کچھ اس طرح شروع کی:

''اگر کوئی مجھ سے سرکاری نوکری اختیار کرتے وقت دریافت کرتا کہ تمہارے انتخاب کا جواز کیا ہے؟ تو میرا واضح اور دوٹوک جواب ہوتا حیثیت، مرتبہ اور مقام۔ مگر آج آپ میں سے کوئی مجھ سے یہی سوال دوبارہ پوچھے تو میرا جواب ہرگز ہرگز یہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ میں نے اپنی ملازمت کے انیس سالوں میں صاحب کو دیانت، امانت اور خدمت کے جس عظیم مرتبے پر فائز دیکھا اُس سے نہ صرف میرے نظریات بلکہ زندگی کی بابت فکر بھی تبدیل ہوگئی۔''

زندگی کیا ہے؟ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو چوبیس گھنٹے، صرف چوبیس گھنٹے صاحب کی زندگی کا مشاہدہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ جینا اسی کا نام ہے۔ دو روٹیاں، دو جوڑے کپڑے، ایک بالٹی پانی، ایک چارپائی اور ایک بستر کے بل بوتے بھی زندگی کو کس طرح گزارا جاتا ہے اور اُن لوگوں کی نسبت بہتر انداز میں گزارا جاسکتا ہے جو اسرافِ بے جا کے بل پر زندگی کو پُرلطف و پُرسکون بنانے کی کوشش میں بہت سی انسانی اور اخلاقی حدود کا خیال بھی نہیں کرتے۔ اگر آج میرے پاس وقت اور آپ کی اجازت میسر ہوتی تو میں آپ کو وہ کارنامے ضرور گنواتا جو صاحب نے ملک اور قوم کے مفاد میں انجام دیے۔

فاضل مقرر ابھی بہت کچھ کہنے اور بیان کرنے کی خواہش رکھتے تھے مگر اسٹیج سیکرٹری کی یاددہانی پر شکریہ کے ساتھ اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ اس بار اسٹیج سیکرٹری نے سامعین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک بار پھر شعر کا سہارا لیا:

دے ولولۂ شوق جسے لذّتِ پرواز
کرسکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج

اور چوتھے مقرر کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے بلند آواز میں اُنھیں روسٹرم پر آنے کی دعوت دی۔

مجھے خوشی ہے کہ میرے فاضل دوستوں نے صاحب کی شخصیت کو بہتر انداز میں آپ سے متعارف کرانے کی سعی کی۔ مگر بہت ہی ادب اور احترام کے ساتھ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

اُن کو سے مراد ناچیز ہے یعنی خاکسار کو یہ چیز ناگوار گزری کہ جس پہلو کا خصوصیت سے ذکر ہونا چاہیے تھا اُس کو قطعی فراموش کردیا گیا مثلاً صاحب نے پوری زندگی ذاتی لڑائی جھگڑوں، مار دھاڑ اور قتل و غارت گری کا قلع قمع کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنی توجہ قوم کی تہذیب و تربیت اور اخلاق پر مرکوز رکھی۔ آپ ترجیحاً رشوت، ملاوٹ، اقربا پروری، دھوکہ دہی، وعدہ خلافی اور کمزور و نادار کے حقوق کی نگہبانی کرتے رہے۔ کون سی مچھلی کتنی گندی اور کتنی بڑی ہے اس کی بابت کبھی اُن کے دل میں خیال تک نہ آیا۔

رائج الوقت دھونس، دھاندلی، دھمکی اور غلیظ زبان کی کوئی صنف ایسی نہیں جس کا سامنا صاحب کو نہ کرنا پڑا۔ عزت، عصمت، جان، مال حتیٰ کہ بچوں کی زندگی کو بھی خطرات لاحق رہے۔ بارہا تبادلوں اور افسرِ بے کارِ خاص بننے کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر ایک لمحے کو بھی صاحب کے ماتھے پر شکن یا زبان پر شکوہ تک نہ آیا۔ ماتحت لوگوں کی جانب سے خدشات کے اظہار پر ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا:

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر

گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فاضل مقرر نے بہت سے ایسے مواقعوں کی نشاندہی کی جس میں بڑے حادثے اور بڑے فساد درپیش تھے۔ اس بار بھی اسٹیج سیکرٹری کی مداخلت کے باعث مقرر گفتگو ادھوری چھوڑ کر سامعین کے شکریہ کے ساتھ اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اسٹیج سیکرٹری نے مہمانِ خصوصی کو دعوتِ کلام دینے کے لیے جوں ہی مخاطب کرنا چاہا تو صاحبِ صدر نے بلند آواز میں مہمانِ خصوصی سے پہلے اسٹیج پر آنے کا اعلان کردیا۔

صاحبِ صدر نے مہمانِ خصوصی اور تمام مقررین کی جانب رُخ کر کے اجازت طلب کی اور جیب سے لکھی ہوئی تقریر نکال کر پڑھنا شروع کردی۔

جس وقت انتظامیہ نے موجودہ تقریب کی صدارت کے لیے مجھ سے رجوع کیا تو میرے سامنے دو مسئلے سر ابھار کر کھڑے ہوگئے۔ اوّل میری اہلیت اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ میں صاحب جیسے متقی، پرہیزگار اور ایماندار شخص کے سامنے صدارت کی کرسی پر براجمان ہوجاؤں اور اپنی باری پر خطبۂ

صدارت پیش کروں۔ دوسری مشکل کا سامنا اس لیے درپیش تھا کہ وقت مقررہ پر میری مصروفیت پہلے سے موجود تھیں۔ الحمد اللہ! فیصلہ کرنے میں مجھے قطعاً دشواری پیش نہ آئی۔ صاحب جیسی منصف اور باکردار شخصیت کے لیے ایک مصروفیت تو کیا ہزار مصروفیات قربان کی جاسکتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے فاضل دوستوں نے صاحب کی شخصیت کے حوالے سے بہت سے اہم گوشوں کی نقاب کشائی کر کے صاحب کی شخصیت کے اوصاف نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ میں اسے کوشش ہی کہوں گا کیونکہ صاحب کی شخصیت کے اوصاف کسی ایک نشست، موقع یا محل پر بیان نہیں کیے جاسکتے۔ اس کام کے لیے ایک سے زائد لوگوں اور بہت سے وقت کی ضرورت ہے۔

صاحب کسی ایک شخص کا نام نہیں بلکہ ایک ادارے کا نام ہے۔ ایسے ادارے، جو انسٹی ٹیوٹ کا درجہ رکھتا ہے۔ میری کوشش اور خواہش ہوگی کہ اس طرح کے ادارے اور انسٹی ٹیوٹ ہمارے وطن میں جا بہ جا بن جائیں۔ اس لیے کہ ہم ایک بیمار معاشرہ ہیں اس قدر بیمار کہ جسے علاج نہیں جراحی کی ضرورت ہے اور جراح بھی صاحب جیسا شیر دل اور شیر جگر ہونا چاہیے۔ ایک اہم بات جس کی جانب احباب کی توجہ نہ گئی وہ ہے افسرانِ بالا پر دباؤ۔ جی ہاں جب جب، جہاں جہاں کوئی صاحب جیسا نیک نام افسر مصروفِ کار رہتا ہے تب تب، وہاں وہاں اُس افسر کے ساتھ افسرانِ بالا بھی مشکل میں ہوتے ہیں۔ کونسا الزام ہے جو صاحب کی شخصیت پر نہیں لگایا گیا۔ کون سا دباؤ ہے جو صاحب کی آواز دبانے کے لیے استعمال نہ کیا گیا۔ یقیناً صاحب جس استقامت کے ساتھ کالی بھیڑوں کے سامنے ڈٹے رہے اُس کے لیے اُن کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ اُنہیں جتنی بھی تعظیم دی جائے کم ہے۔ مگر کچھ نہ کچھ صلے کے حقدار وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے تمام تر دھونس، دھاندلی اور دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نہ صرف صاحب کو فری ہینڈ دیا بلکہ ہر ہر قدم پر اُن کی حوصلہ افزائی اور ہمت بڑھاتے رہے۔ کبھی کبھی تو ایسے نازک مقام درپیش ہوتے کہ صاحب کی صفائی میں ڈھال بن کر کھڑا ہونا مشکل ہوجاتا۔ بقول شاعر:

چہرے اجنبی ہو جائیں تو کوئی بات نہیں محسن
لہجے اجنبی ہوں تو بڑی تکلیف دیتے ہیں

صاحب صدر کی تقریر کے اختتام پر اسٹیج سیکرٹری روسٹرم پر آ کر مہمان خصوصی کو پرجوش انداز میں دعوتِ کلام دینا چاہتے تھے مگر اُس سے قبل ہی مہمانِ خصوصی کی تعظیم میں تمام سامعین کھڑے ہوکر تالیاں بجانے لگے۔ بے بسی اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسٹیج سیکرٹری نے کاندھے اچکاتے ہوئے صرف اتنا کہا:

''جو مزاجِ یار میں آئے''

جن لوگوں نے زندگی میں صاحب کو قریب سے نہ دیکھا تھا، اُن کے ذہنوں میں صاحب کی شخصیت سے متعلق اپنے فہم اور مزاج کے مطابق طرح طرح کے نقوش اور خاکے بنے ہوئے تھے جبکہ صاحب کی مرنجا مرنج شخصیت اور پرانی طرز کا لباس دیکھ کر بہت سے لوگوں کو مایوسی ہوئی۔ صاحب نے ایک طائرانہ نظر مخاطبین پر ڈالی اور سر کی ہلکی سے جنبش سے پشت پر بیٹھے ہوئے احباب سے گویا ہوئے۔

احباب اور منتظمین اس امر کے گواہ ہیں کہ میں آج کی تقریب کے حق میں قطعی نہ تھا۔ میں نے خدمت کی ہے نہ کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ سیدھی سیدھی ملازمت کی ہے۔ اور جو ذمہ داری سرکار نے مجھے سونپی تھی اُسے اپنے حلف کے مطابق انجام دیا ہے۔ اس کام کے لیے مجھے سرکار کی جانب سے تنخواہ کی شکل میں معقول معاوضہ ملتا رہا۔ لہٰذا:

''لین دین صاف، محبت پاک''

آپ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ جدید طرزِ زندگی اور نظام انتظام ہمیں انگریزوں کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔ ہم نے اس کی سہولتیں تو اپنا لیں یعنی صاحب بہادر بننے میں کوئی کسر نہ چھوڑی البتہ ذمہ داریوں کی جانب ہم اس طرح اجنبی ہو گئے کہ جس طرح یہ ہمارا نہیں کسی اور کے کرنے کا، کام ہے۔ اس وقت مجھے وہ انگریز خاتون صحافی یاد آ رہی ہیں جس نے اپنے وطن واپس جا کر پاکستان میں تعیناتی کے دوران مطالعے اور مشاہدے پر مبنی کتاب تحریر کی ''Waiting for Allah'' واقعی ہم لوگوں نے اپنی ذمہ داریاں اللہ کے سپرد کر دی ہیں اسی لیے ہمارے وطن کو مملکت خداداد بھی کہا جاتا ہے۔

مقصود یہاں خدمات اور کارناموں کا شمار نہیں مقصود ہے غلطیوں کا شمار، مقصود ہے غلطیوں کا اعتراف:

مجھے اعتراف ہے کہ میں ایک کمزور، ناتواں اور بزدل شخص ہوں۔ اس لیے بڑی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے، چھوٹی مچھلیوں کا شکار کرتا رہا۔

ناجائز منافع، رشوت، چوری، ڈاکہ، دودھ، آٹا، شکر، مصالحوں میں ملاوٹ کرنے والے۔ حلال کے نام پر قوم کو حرام اور ناپاک اشیاء کھلانے والے اصل میں راہ سے بھٹکے ہوئے مسافر ہیں۔

مجھ میں تھوڑی ہمت، جرأت اور احساس ذمہ داری ہوتا تو میں راہ سے بھٹکے ان مسافروں کو تختہ مشق بنانے کے بجائے مچان پہ بیٹھے ان بلند آہنگ رہنماؤں سے آنکھیں چار کرتا جنہوں نے عمل اور عافیت کی راہ سے بھٹکا کر آخرت کے خودساختہ اور سہانے خواب دکھلا کر ان لوگوں کی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کردی ہیں!

کچھ دیر قبل جو لوگ مہمانِ خصوصی کی ہر بات پر جوش و جذبہ سے تالیوں اور نعروں سے ہال کو سر پہ اٹھائے ہوئے تھے اچانک اُن کے کھلے منہ اور اُٹھے ہاتھ حیرت واستعجاب میں ڈوب کر ساکت ہوگئے ہیں۔ وہ کبھی اپنے دائیں دیکھتے ہیں تو کبھی بائیں۔ وہ بولنا چاہتے ہیں مگر بول نہیں پاتے۔ وہ ہاتھ ہلا کر اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں مگر ہاتھوں کو بھی اُن کے ہونٹوں کی طرح چپ لگ

گئی ہے۔

کرسیٔ صدارت پر براجمان شخصیت کے چہرے پر اُڑی ہوائیاں دیکھ کر دیگر مقررین بھی پہلو بدل کر ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

آنکھوں، آنکھوں میں ایک دوسرے سے صورت حال کی سنگینی پر تشویش کا اظہار کرنا چاہتے ہیں مگر پہل کرنے کی ہمت کسی میں نہیں۔

سینوں میں دبی سانسیں آہستہ آہستہ پھر سے بحال ہو رہی ہیں۔ ہوا میں معلق ہاتھ چیونٹی کی رفتار سے حرکت کرنے لگے ہیں۔ طویل وقفے کے بعد مہمانِ خصوصی کے لب ہلتے ہی سامعین کے چہروں کا تناؤ کم ہونے لگا ہے۔

ایسا نہیں۔۔۔کہ وقت ٹھہر گیا ہے۔۔۔یا۔۔۔کائنات کی گردش تھم گئی ہے (مہمان خصوصی نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا)۔۔۔آئے گا۔۔۔وہ وقت ضرور آئے گا۔۔۔آج نہیں تو کل۔۔۔کل نہیں تو پرسوں۔۔۔مگر۔۔۔آئے گا ضرور۔۔۔جب لوگوں کے ہاتھوں میں لوہے کی چھلنیاں ہوں گی۔۔۔جو آنکھ جھپکتے میں گدلے پانی کو شیشے کی طرح صاف، شفاف کر دیں گی۔

چھلنیوں کے سراخ ۔۔۔ چھوٹے ہوں گے۔۔۔ یا۔۔۔ بڑے۔۔۔درمیانے ہوں گے۔۔۔یا۔۔۔مہین۔۔۔اس کی بابت کوئی بھی پیش گوئی کرنا۔۔۔دیوانے کی بڑ کے سوا کچھ نہیں۔۔۔کچھ بھی نہیں۔۔۔!!!

بقیہ : نادیدہ خواب

''تمہارا کیسے ہے! دے دو۔ انکل کا ہے۔'' عدیل رونے لگا۔

''ارے یہ تو پچھلے سال پانی میں گر کر خراب ہو گیا تھا۔ اب بچوں کا کھلونا ہے بس۔'' تحصیلدار صاحب نے پیار سے کہا، ''تمھیں چاہئے کیا؟ لو بیٹا تم رکھ لو۔ لے لو بیٹا۔''

''ذرا ادرک کی چائے بنا لو۔ سر درد ہو رہا ہے۔'' گھر میں داخل ہوتے ہی شوہر نے چائے مانگی۔

''تھوڑی دیر سے بناؤں؟'' فائزہ کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر شوہر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''امی! امی آپ یہ لے لیں۔ لیں نا!'' عدیل نے اپنی امی کو تھام کر اپنا کھلونا ماں کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''فون نہیں لگ رہا ہے بیٹا۔'' فائزہ کے کانوں نے بوڑھی آواز کی سرگوشی سنی۔

''ہاں یاد آیا!''، فائزہ نے اچانک شوہر کی جانب دیکھا اور بولی، ''یہ موبائل اس دن بڑی بی کے ہاتھ میں تھا۔'' اس نے موبائل عدیل کے ہاتھ میں دے دیا۔

بقیہ : تلفظ کی گلکاریاں

سے قبل نہ سُنے تھے۔ مرہم پر زخم لگانے کو ''پلٹس لگانا'' کہتے تھے۔ نیلے رنگ کو اُودا، بیڈ شیٹ کو اُدقچہ، ڈائپر کو پوتڑا، سِنک کو چلمچی، لکڑی کو چوب، ڈسٹ بن کو خاک دان، ڈرائنگ روم کو دیوان خانہ، پولیس والے کو سنتری، سینڈل کو گرگابی، پلیٹ کو رکابی اور پورچ کو ڈیوڑھی اور کوری ڈور کو وارنڈا کہتے تھے۔ زبان کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ ایک مرتبہ کہنے لگے:

''لاہور کے پرانے باسی ''سین'' کی آواز نہیں نکال سکتے۔ وہ اس کی جگہ ''ہ'' کی آواز نکالتے ہیں۔ مثلاً وہ پیسے کو ''پیہے'' کہتے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے جب یہی لوگ سندھ کا نام لیتے تو سین ادا نہ کر پاتے۔ سندھ کو ہند کہہ کر پکارتے۔ گویا ان کے ہاں پورا ہندوستان وادیٔ سندھ ہی تھا۔''

اسی طرح ایک مرتبہ انہوں نے بتایا:

''عربی کا فیل یعنی ہاتھی فارسی میں پیل بن جاتا ہے کیونکہ فارسی داں فے کو پے کے ساتھ بدل دیتے ہیں، اس لیے فیل بان دراصل پیل بان ہے جو کہ ہمارے ہاں پہلوان بن گیا۔''

ان کی عام گفتگو بھی خاصی معنیٰ خیز ہوتی۔ کسی بھی چیز کا ذکر اس انداز میں کرتے کہ زندگی کی عام باتیں اور روزمرہ کی اشیا ایک گہرے اور تہ بہ تہ معانی پہن لیتیں۔ فرض کریں، آپ نے تقی صاحب کے سامنے ''چمچے'' کا ذکر کر دیا، تو وہ کہیں گے۔

''چمچے میں یہ خوبی ہے کہ وہ کسی بھی دیگ میں منہ ڈال سکتا ہے۔ یہ تو ایک چمچہ ہی جانتا ہے کہ چمچ سے چمچہ بننے تک کا سفر کتنا کٹھن ہے۔''

اب آپ ہی بتلایئے زبان سے بے ساختہ یہ جملہ کیوں کر ادا نہ ہو:

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

''عکسِ جمال''

تصوراقبال (اٹک)

اگر وہ ہم سے ناخوش ہیں تو دنیا چھوڑ دیتے ہیں
ہم اُن کے واسطے اپنا اثاثہ چھوڑ دیتے ہیں

جو اک باقی بچا ہے وہ سہارا چھوڑ دیتے ہیں
سمندر مضطرب ہے تو کنارا چھوڑ دیتے ہیں

مہاجر ہیں ہمارا تو ٹھکانہ ہی نہیں کوئی
کبھی وہ بلخ چھوڑا اب بخارہ چھوڑ دیتے ہیں

کتابِ زیست گر وہ چاہتے ہیں نامکمل ہو
تو پھر ہم اُن کی خاطر اک ''سپارہ'' چھوڑ دیتے ہیں

ہمیں معلوم ہوتا ہے پلٹ کر اب نہیں جانا
دیا ہم پھر بھی گھر میں ایک جلتا چھوڑ دیتے ہیں

زمیں کی قید سے جن کو رہائی پھر نہیں ملتی
تو ہم ایسے میں اک چھوٹا سا رستہ چھوڑ دیتے ہیں

ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کسی بھُوکے کا ہر صورت
کبھی کھانا جو کھائیں ہم تو آدھا چھوڑ دیتے ہیں

سُنا ہے اب بہانا ڈھونڈتا ہے رُوٹھنے کا وہ
چلو ہم ایسا کرتے ہیں منانا چھوڑ دیتے ہیں

گوالے کہہ رہے ہیں ''چائے نوشی'' آپ کم کر دیں
تو ہم بھی ''دودھ میں پانی'' ملانا چھوڑ دیتے ہیں

اگر اچھا نہیں لگتا تصوؔر جی تمہیں ملنا
تو ہم بھی ساتھ ایسے میں تمہارا چھوڑ دیتے ہیں

محبت کے سفر پر جا رہے ہو، نا تصوؔر جی
سُنا ہے لوگ رستے میں اکیلا چھوڑ دیتے ہیں

جہانگیراشرف (برمنگھم)

جہاں سے چلا تھا وہی آ گیا
دائروں کا سفر زندگی کھا گیا

بونوں کے شہر میں قدآوری کا شوق
قدآورں کے تن سے سر اڑا گیا

ناگزیر تھا پہلے نہ ہے اب کوئی
قبرستاں سے گزرا تو لگ پتا گیا

لہجے میں عجز لا نہ بن تو خدا
وقت کتنوں کی رعونت پہ خاک پا گیا

جہانگیر جن کے ہاتھوں لٹے ہیں کئی بار پہلے
لباسِ خضر میں وہ حیلہ گر پھر آ گیا

اسدعباس خان (جھنگ)

منہمک ہو کر زمین و آسماں کو دیکھئے
لامکاں ہوتے ہوئے میرے مکاں کو دیکھئے

ہجر ہوتی جا رہی ہیں دم بہ دم اشیاء سبھی
اس جہاں کو دیکھئے دونوں جہاں کو دیکھئے

میرے قلب و جان میں اتری ہوئی ہے کربلا
یا شہیدِ عشق میرے خانداں کو دیکھئے

قافلہ بے قافلہ آتی رہی ہے یہ صدا
خالی خالی راستوں پر ہمرہاں کو دیکھئے

آن پہنچا ہے بالآخر وقت کا وقتِ ظہور
حیرتِ دل حیرتِ کون و مکاں کو دیکھئے

آیت آیت ایک اس کا دیکھئے عکسِ جمال
حجرہ حجرہ ایک اس کے آستاں کو دیکھئے

خوف کا اور بھوک کا دروازہ کھلنا ہے اسؔد
اپنی آنکھوں سے ہماری داستاں کو دیکھئے

○

جنیدآزر (اسلام آباد)

ذرا سی دیر ترا ہات، ہات میں آیا
میں رقص کرتا ہوا اپنی ذات میں آیا
جمود ٹوٹ گیا یک بیک سمندر کا
حنوط برف کا خطہ حیات میں آیا
مجھے اٹھایا تھا سورج کی پہلی کرنوں نے
سحر سے پہلے مرا ذکر رات میں آیا
ترا ہی ذکر رہا شب کے شامیانے میں
اُسی کے ساتھ میں دن کی قنات میں آیا
میں خواب گاہِ تخیل میں ہو گیا بے خود
بلا کا زور جو رنگِ نشاط میں آیا
مرے وجود میں روشن ہوا چراغِ جہاں
میں ایک شب جو ترے التفات میں آیا
تری طلب جو مری خواہشوں میں زندہ ہوئی
مرا جواز تبھی ممکنات میں آیا
صبائے صبح ترے لمس کی ودیعت سے
غبار تھا مرا چہرہ ثبات میں آیا
لئے ہوئے تھا وہ تاثیر آیتوں جیسی
دعا کی طرح مری کائنات میں آیا
یہ روشنائی جو ابھری ہے میرے لفظوں میں
کسی کی آنکھ سے کاجل دوات میں آیا
غلام کرنے کو نکلا تھا وقت کی گردش
میں بے سبب تو نہیں سانحات میں آیا
تجھے میں خود سے ملاؤں گا ایک دن آزر
مرا جنوں جو کبھی احتیاط میں آیا

ابراہیم عدیل (جھنگ)

فصلِ جنوں کے جوش میں اعلان کر دیا
جیون کا لحہ لحہ اسے دان کر دیا
تم نے بھی اپنی ذات پہ ڈالے کئی حجاب
تم نے بھی رنگ ونور کا بحران کر دیا
اترے زمینِ گل پہ عجب شبنمی قدم
تازہ ہر ایک پھول کا ایمان کر دیا
نکلا پرندِ روح یہ کیسی اڑان پر
چشمِ دیارِ جسم کو حیران کر دیا
بھیجا گیا سفر پہ ہمیں خواہشوں کے دیس
خستہ شکستہ سانس کو سامان کر دیا
چوما ہے پھر کسی نے ستم کی صلیب کو
اونچا زمانے بھر میں مرا مان کر دیا
اس آس پہ کہ تیری جھلک تو ملے کہیں
اک جیتا جاگتا بدن بے جان کر دیا
سیلِ اجل چراغِ سخن لے گیا عدیل
کیسے بتاؤں کیا مرا نقصان کر دیا

زیبا سعید (کراچی)

خود ہم نے اپنے ہاتھوں سفینے ڈبو دیے
وہ ہیرے جیسے لوگ تھے جو ہم نے کھو دیئے
یہ تھا کمالِ ضبط کہ اک آہ بھی نہ کی
شدت غموں کی دیکھ کے پتھر بھی رو دیئے
غیروں نے آ کے زخموں پہ مرہم رکھا مگر
اپنوں نے پھر سے زخموں میں نشتر چبھو دیئے
کل تک محبتوں کے امیں تھے جو راستے
لوگوں نے ان پہ خارِ مغیلاں ہیں بو دیئے
ہم نے بھی زندگی کا بھرم اس طرح رکھا
الزام سب قبول کیے اس نے جو دیئے
زیبا کی داستاں بھی بڑی دل خراش ہے
دیکھا جو رُوئے یار تو اوسان کھو دیئے

○

فرح کامران
(نیوجرسی سٹی)

تمھارے پیکرِ خودسر میں ڈھل بھی سکتی ہوں
میں بات کرنے کا لہجہ بدل بھی سکتی ہوں

اس اعتماد سے رکھا ہے آسماں پہ قدم
کہ اب گری تو میں گرکر سنبھل بھی سکتی ہوں

میں تیری اونچی حویلی میں قید رہ کر بھی
ترے حصار سے باہر نکل بھی سکتی ہوں

چٹان بن کے مقابل ہوں بدنظر کے لئے
کسی کے پیار میں لیکن پگھل بھی سکتی ہوں

حسینیت ہے مرا دین اور زباں زینب
علم اٹھا کے میں شعلوں پہ چل بھی سکتی ہوں

○

شاداب صدیقی
(کراچی)

اس جہانِ غم سے میں کہاں جاؤں
غم ہی غم ہیں ہر طرف جہاں جاؤں

لطف سے خالی بے اماں جاؤں
لے کے اپنا قلبِ خونچکاں جاؤں

چین سے رہنے نہیں دیتی زمیں
تُو بتا اے آسماں کہاں جاؤں

دل نہیں لگتا مرا تیرے بغیر
چھوڑ کر کیوں تجھکو مہرباں جاؤں

گھر کے سارے لوگ ہوں مشتاقِ دید
لوٹ کر جب اپنے آشیاں جاؤں

کیا تجھے اے ہم نشیں گوارا ہے
اٹھ کے تیری بزم سے فغاں جاؤں

پوچھتی ہے احتجاجاً فصلِ گُل
چھوڑ کر کیا گلستاں خزاں جاؤں

ہو قلم میں دریا کی روانی سی
پیار کی جب لکھنے داستاں جاؤں

دارِ فانی سے کس حال میں شادابؔ
غمزدہ جاؤں کہ شادماں جاؤں

○

مظہر بخاری
(میاں چنوں)

حسن کے دام سے نکل آیا
طوقِ دشنام سے نکل آیا

رات آرام سے گزاروں گا
دن کے ہنگام سے نکل آیا

گھر کی تنہائی مار دیتی مجھے
میں کسی کام سے نکل آیا

خطِ ہست و بود کم تھا مجھے
سو کوئے خام سے نکل آیا

میں دعا رفتگاں کو دیتا ہوا
شیوۂ عام سے نکل آیا

بارِ آئندگاں اُٹھائے ہوئے
عشق انجام سے نکل آیا

○

شہلانقوی

(نیویارک)

وہ لمحہ کربِ مسلسل ہے آ گہی پر اب
عذاب آئے گا ایسا نہ زندگی پر اب

کبھی خیال کی تتلی مری سہیلی تھی
پتنگے باقی ہیں اس بجھتی روشنی پر اب

وہ سبز سایوں کا بن اس میں کوکتی کوئل
ہے سوکھے پتوں کا اک شور خامشی پر اب

تمہارے قرب کا لمحہ حیات کا حاصل
نثار کرتے ہیں صدیاں اسی گھڑی پر اب

نگاہِ آبلہ پا راہ میں بھٹکتی ہے
امید باقی رہی کیسے دوستی پر اب

میں آسمان کو چھو کر زمیں پر آئی ہوں
نہ طعنہ زن ہو کوئی میری بے بسی پر اب

ہر ایک صبح یہ سورج طلوع ہوتا ہے
تو شام خون ہے کیوں اس کی عاجزی پر اب

کوئی چراغ جلاؤ کہیں اجالا کرو
کوئی حصار بنے بڑھتی تیرگی پر اب

کبھی دعا کو تری رحمتیں سمیٹتی تھیں
نہیں غرور کسی بندہ پروری پر اب

○

اسداعوان

(سرگودھا)

یہ تیرا گھر یہ تیرا کاروبار چلتا رہے
ہر اک طرح سے یہ دار و مدار چلتا رہے

اداسیوں کے گھنے جنگلوں کے سائے میں
تھکن سے چور کوئی اشک بار چلتا رہے

بھرم نہ ٹوٹے تعلق میں ایک دوجے کا
ہمیشہ مجھ پہ تیرا اختیار چلتا رہے

مری نگاہ رہے صرف اپنے قاتل پر
گلو پہ خنجرِ بے آبدار چلتا رہے

نہ پُرسہ دار کوئی ہے نہ غم گسار کوئی
مگر یہ دیدۂ تر سوگوار چلتا رہے

خدا کرے کہ رہے چشمِ پارسا سے الگ
درست سمت پہ یہ مے گسار چلتا رہے

میں چاہتا ہوں کہ شہرِ حریفِ جاں میں اسدؔ
مرے جلو میں یہ میرا نگار چلتا رہے

○

نویدسروش

(میرپورخاص)

ساری یادیں لے آیا ہوں میں صحن و رہ داری سے
لا نہ سکا میں اپنے دل کو کمرے کی الماری سے

میرے گھر کی ساری دھرتی بنجر بنجر تھی لیکن
تخمِ خواہش بویا میں نے ہر طرح تیاری سے

سب سے رشتے ناتے رکھے خوب نبھائے ہیں میں نے
ہر رستے پر قدم رکھے ہیں میں نے ہشیاری سے

دل کو کرچی کرچی کر کے زخم دیے ہیں مجھ کو
جو مجھ پر جادو کرتا تھا بے حد دل داری سے

جن کے چہروں پر لکھا تھا کل شب کا جو افسانہ
لگتے رہے کل دن بھر مجھ کو لوگ وہ سب اخباری سے

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

ہمارے سجدوں سے رب کی عطائیں ساتھ رہتی ہیں
خلوصِ دل سے مانگی سب دعائیں ساتھ رہتی ہیں

کسی لمبی مسافت کی قبائیں ساتھ رہتی ہیں
اور بَن کے بادباں اُڑتی رِدائیں ساتھ رہتی ہیں

کہیں پہ پھول کھلتے ہیں، کہیں پہ پتے گرتے ہیں
جو سمجھیں تو یہ موسم کی اَدائیں ساتھ رہتی ہیں

اگرچہ بادِ بہاری سے تو مانوس سب ہی ہیں
مگر کچھ اجنبی سی بھی ہوائیں ساتھ رہتی ہیں

برس کر جو گلستانوں کو جُوں شاداب سا کر دیں
وہی تو ہیں جو رستوں میں گھٹائیں ساتھ رہتی ہیں

بہت انمول سا جذبہ ہے جب اظہار پاتا ہے
تو یوں لگتا ہے کہ جیسے وفائیں ساتھ رہتی ہیں

یہ کیا الہام ہے یا کشف یا وجدان ہے کیا
کبھی جو نہ سنی ہوں وہ صدائیں ساتھ رہتی ہیں

○

شریف شیوہ

(لاہور)

کیوں نہ آنکھوں سے بہے غم کے اثر سے پانی
حبس بڑھ جائے تو لازم ہے کہ برسے پانی

ایسے بازار میں انسان کی قیمت کیا ہے
مہنگا بکتا ہو جہاں خونِ جگر سے پانی

کچّے گھر ہی نہیں پکّے بھی متاثر ہوں گے
اب کے سیلاب کا گزرے گا جدھر سے پانی

زندگی تو یہ کہاں چھوڑ گئی ہے مجھکو!
چھاؤں ہے سر سے جدا، دُور نظر سے پانی

جس کو ٹھکرا دے تری چشمِ عنایت ساقی
مانگنے جائے پیاسا وہ کدھر سے پانی

نیند سے جاگو، کرو ہوش اے بستی والو!
ورنہ ممکن ہے گزر جائے یہ سر سے پانی

شیوہ اس دور میں ایسے ہے وفا کی اُمید
دُھوپ میں جیسے کوئی مانگے شرر سے پانی

○

شہباز راجہ

(سرگودھا)

پڑے ہیں دشت میں آشفتہ سر نہیں جاتے
یہ کون لوگ ہیں جو اپنے گھر نہیں جاتے

اگرچہ جانے کی ضد ہے تو سوچتے کیوں ہو
بچھڑنے والے کبھی سوچ کر نہیں جاتے

خدا کسی کو لگائے نہ دل کے روگ کبھی
کہ روگ دل کے لگے عمر بھر نہیں جاتے

گئے زمانوں کی باتیں تھیں اب پرانی ہوئیں
کسی کے ہجر میں اب لوگ مر نہیں جاتے

کوئی تو ایسے حوادث ہوئے ہیں بستی میں
جو ہنستے چہروں کی آنکھوں سے ڈر نہیں جاتے

نہ جاؤ چھوڑ کے تم مجھ کو ایسی حالت میں
مریض چھوڑ کے تو چارہ گر نہیں جاتے

خود اپنا آپ گنوایا ہے میں نے رستوں میں
مری حیات سے لیکن سفر نہیں جاتے

پرندے جاتے ہیں اشجار کی طرف شہبازؔ
کبھی پرندوں کی جانب شجر نہیں جاتے

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یوایس اے)

قسط......۲۵

ان کی باتیں سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے تھے لیکن میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ سریت نے مجھے چھ سیٹوں والے کاپٹر میں بیٹھنے کو کہا تو میں جان بوجھ کر جنگلیوں کے انداز میں کاپٹر کی سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے سیٹ کے پاس فرش پر بیٹھا تو سب ہنس پڑے۔ سریت نے ہنستے ہوئے مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور میری سیٹ بیلٹ باندھی۔ سٹیو پائیلٹ کی سیٹ پر بیٹھا اور ڈالیا اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی۔ کالا جان ان کے پیچھے اور سریت میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا۔ کاپٹر ہوا میں اُڑا تو سریت نے مجھے کہا، مہاراج ہم اکبر بادشاہ کے چھوڑے ہوئے فتح پور سیکری کے محل میں جس جگہ کھدائی کر رہے ہیں وہاں حد سے زیادہ سانپ ہیں۔ ہم سانپ مارنے کی بجائے بنوں بی بی کے ڈیرے والوں کو تحفے کے طور پر دینا چاہتے ہیں۔ کھدائی کے وقت جب سانپ نکلیں تو آپ پکڑ پکڑ کر جمع کرنے کے بعد ان کو اپنے ساتھ بنوں بی بی کے ڈیرے پر لائیں گے۔ جی اچھا، میں نے خوش ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے بتانے کے بعد سریت نے ان لوگوں کے لیے ہماری باتوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو جان نے سریت سے پوچھا، تم نے اسے مرنے والے سپیروں کے بارے میں نہ بتا کر اچھا ہی کیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ڈر جائے۔ تمہارے خیال میں اسے تمہاری بات کا یقین آ گیا ہے؟ اور کیا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ سانپوں کی جان بچا کر انہیں سندر بن میں بنوں بی بی کے ڈیرے پر لانے کی خبر سے اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس کے جیون کی سب سے بڑی خواہش ہوگی کہ یہ کسی طرح سانپوں کی مدد کرے اور ہم اسے یہ موقع فراہم کر رہے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ اگر میں دورانِ سفر اپنی آنکھیں کھلی رکھوں گا تو یہ لوگ ایک دوسرے سے کھل کر بات نہیں کریں گے اور منزل پر پہنچنے سے پہلے میں ان لوگوں اور ان کی نیت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان کر اپنا آئندہ لائحہ عمل بھی تیار کرنا چاہتا تھا اس لیے ان کی بات کا جواب دے کر میں نے آنکھیں نیم وا کر کے مراقبے کا سوانگ رچا لیا تھا۔ میری آنکھیں اگرچہ مراقبے کے سوانگ میں بند تھیں لیکن میرے سارے حواس کانوں میں جمع ہو کر ان کی باتیں سن رہے تھے۔ مجھے غافل دیکھ کر انہوں نے اپنی باتیں شروع کر دیں۔ یہ کب تک مراقبے میں رہے گا؟ جان نے سریت سے پوچھا تو سریت نے جواب دیا جب تک ہم اسے نہیں اٹھائیں گے۔ میں اس کو سانپوں کی کچھاڑ میں پھینکنے سے پہلے تجربے کے طور پر سانپوں کا ردِعمل دیکھنے کے لیے اس پر چند جنگلی سانپ چھوڑنا چاہتا ہوں، کالے نے سریت سے کہا۔ لیکن تم جنگلی سانپ کہاں سے لاؤ گے؟ سریت کی بجائے ڈالیا نے کالے سے پوچھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کو سونے کے لیے اسی کمرے میں رکھا جائے جہاں سے مسلسل سانپ نکل کر باہر آ رہے ہیں، گورے نے کہا۔ ہاں یہ خیال بُرا نہیں، سریت نے جواب دیا۔ لیکن اس جگہ تو بستر وستر نہیں ہے یہ بیچارہ کہاں سوئے گا؟ ڈالیا نے پوچھا۔ شمان سونے کے لیے بستر اور تکیوں کا سہارا نہیں لیتے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس نے ہمارے ساتھ آنے سے پہلے اپنے ساتھ کوئی سامان نہیں لیا تھا۔ یہ تو ہمارے ساتھ اسی چیتھڑے میں چل پڑتا اگر ہم اس کو لنگی نہ دیتے۔ جان نے پوچھا اس کے کھانے پینے کا کیا کریں گے؟ یہ لوگ آگ پر پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے۔ تازہ سبزیاں اور پھل کھاتے ہیں۔ جو ہمارے پاس اس کے لیے وافر مقدار میں موجود ہیں، سریت نے جواب دیا تو ڈالیا نے کہا اس لیے یہ ہم سب سے زیادہ صحت مند نظر آ رہا ہے۔

ڈالیا نے سریت سے پوچھا، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جو کام سپیروں کے لیے اتنا مشکل ہے ان شمانوں کے لیے کیوں کر آسان ہے۔ کیا یہ لوگ سپیرے نہیں ہیں؟ سریت بولا، سپیرے مداریوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ سانپ پکڑتے ہیں اور سانپوں کا تماشہ دکھاتے ہیں اور سپیرے سانپوں سے ڈسے جاتے ہیں۔ شمان ناگ دیوی اور دیوتا کی پوجا کرتے ہیں اور سانپوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ سانپ شمانوں کو نہیں ڈستے۔ سٹیو نے پوچھا، یہ تمہارا خیال ہے یا کسی کی پھیلائی ہوئی افواہ۔ نہ یہ میرا خیال ہے اور نہ ہی یہ کسی کی پھیلائی ہوئی افواہ۔ یہ سچ ہے، سریت نے جواب دیا۔ مجھے تو جب تک کسی بات کا سائنسی ثبوت نہ ملے میں یقین نہیں کرتا۔ کیا ایک سائنس دان ہونے کے ناطے تم ان باتوں پر یقین رکھتے ہو؟ کالا بولا۔ سریت نے جواب دیا، مجھے ذاتی طور پر اتنا تجربہ تو نہیں لیکن یہ بات ہمارے ہاں صدیوں سے مانی جاتی ہے کہ شمان کو نہ سانپ کاٹتے ہیں اور نہ ہی سندر بن کا کوئی جانور ان کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اگر تمہاری بات سچ نہ ہوئی تو؟ گورے نے سریت سے پوچھا۔ تو ہم چند شمانوں کی قربانی دینے سے گریز نہیں کریں گے، سریت ہنس کر بولا۔ اس پر تینوں ہنس دئے۔ اگر یہ بات سچ ہوئی اور اس نے تمام سانپوں پر قابو پا لیا تو؟ جان نے پوچھا۔ تو سانپ ہمارے راستے سے ہٹ جائیں گے اور ہم اسے سانپوں کے ساتھ سندر بن چھوڑ آئیں گے، سریت کے بجائے گورے نے جواب دیا۔

مردہ سپیروں کے لواحقین کو چند سو ڈالر دے کر ہماری جان چھوٹ گئی تھی اگر یہ مر گیا تو تمہارے خیال کے مطابق اس کا کوئی والی وارث یا رشتہ دار نہیں ہوگا جو اس کی کھوج میں ہمارے پیچھے آئے گا؟ کالے جان نے سریت سے پوچھا تو سریت نے جواب دیا، نہیں۔ دراصل غربت کی وجہ سے والدین اپنے بچوں کو چھوٹی عمر سے ہی بنوں بی بی کی سیوا میں چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہاں انہیں کام کاج کئے بغیر مفت کا کھانا پینا ملتا ہے۔ جس بوڑھے نے اسے ہمارے ساتھ بھیجا ہے اُسے اس شمان کا اصلی نام تک معلوم نہیں ہوگا اور یہ

تک معلوم نہیں ہوگا کہ اس کے ڈیرے میں کُل کتنے شان موجود ہیں۔ ڈالیا بولی، ہم اس کا نام پوچھنا بھول گئے ہیں۔ سریت نے جواب دیا، یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اس کا اپنا کوئی نام ہی نہ ہو۔ ڈیرے کے تمام لوگ شان کہلاتے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی نام نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو وہ اپنا نام استعمال نہ کرنے کی وجہ سے بھول جاتے ہیں۔ جب یہ اٹھے گا تو میں تم لوگوں کے سامنے اس کا نام پوچھوں گا اور تم خود ہی دیکھ لینا۔ بنوں بی بی کے ڈیرے پر موجود کوئی شان ایک دوسرے سے بات نہیں کرتا۔ سب مالا جپنے میں مگن رہتے ہیں۔ اگر یہ واپس نہ گیا تو ڈیرے میں کوئی اس کی کمی محسوس نہیں کرے گا؟

اگر یہ پہلے سپیروں کی طرح مر مرا گیا تو کیا ڈیرے والا بوڑھا کسی اور شان کو ہمارے ساتھ بھجوانے پر رضامند ہو جائے گا؟ جان نے سریت سے پوچھا۔ ہاں بالکل۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہمیں یہاں آ کر ایک ایک کر کے دس شان لے جانے پڑیں گے تو بھی یہ بوڑھا انکار نہیں کرے گا۔ اور اگر اس نے ہم سے پوچھا کہ پہلے شان کہاں ہیں تو ہم اسے کیا جواب دیں گے؟ گورا سٹیو بولا۔ شان کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کرتے صرف جواب دیتے ہیں۔ وہ کبھی گفتگو کا آغاز بھی نہیں کرتے۔ اگر تم اس کے پاس رہ کر دس سال بھی نہیں بولو گے تو یہ بھی تم سے نہیں بولے گا۔ سریت نے بات آگے بڑھائی۔ ہم نے ہر بار یہی کہنا ہے کہ سانپوں کو بچانے کے لیے ہم ایک شان کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں اور وہ بوڑھا کوئی سوال پوچھے بنا ایک شان ہمارے ساتھ کر دے گا۔ یہ بات عجیب ضرور ہے لیکن پھر بھی یقین کرنے کو جی چاہتا ہے، جان نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ کیا ان شانوں میں کوئی خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں؟ ڈالیا نے سریت سے پوچھا تو سریت بولا، سائنسی بنیادوں پر ان میں کوئی ایسی صلاحیت نہیں ہوتی ویسے ان کے بارے میں کئی حیران کن باتیں مشہور ہیں لیکن میں ان پر یقین نہیں رکھتا۔ مجھے کوئی ایسی مثال دو، ڈالیا نے کہا۔ مثال کے طور پر ان کے بارے میں مشہور ہے کہ خطرناک جنگلی جانور ان کی آنکھوں کی تاب نہ لا کر ان کا راستہ چھوڑ دیتے ہیں، سریت کی بات پر ڈالیا نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا، میں نے پہلی نظر میں دیکھ کر اس شان کی آنکھوں کی مقناطیسیت محسوس کر لی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات نہیں کر سکوں گی۔ تمہیں اس سے بات کرنے کو کس نے کہا ہے، کالا ہنس کر بولا۔ ہر کنوارے مرد کی آنکھیں تمہیں ایسے ہی لگتی ہیں۔ دیکھو تم پھر میری توہین کر رہے ہو، ڈالیا نے غصے میں کہا، سٹیو نے بیچ میں دخل اندازی کرتے ہوئے کہا، چلو دفع کرو ان باتوں کو۔ ہمیں اپنے ٹارگٹ سے نہیں ہٹنا چاہیے۔

ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کھدائی والی جگہ سے بے شمار سانپ نکل رہے ہیں جو سپیروں کے بس کا روگ نہیں معلوم ہوتے جس کی وجہ سے چند سپیروں کی موت بھی واقع ہو چکی ہے۔ پھر ان کو سریت یا کسی اور کے ذریعے بنوں بی بی کے شانوں کا علم ہوا اور یہ ہمارے ہاں آتے تھے۔ کم از کم ابتدائی گفتگو سے سانپوں کے بارے میں ان کی نیت بھی ٹھیک تھی کہ مارنے کی بجائے سانپوں کو وہاں سے پکڑ کر بنوں بی بی کے ڈیرے یا کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔ لیکن انہیں شانوں کی ہتک کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہ لوگ پیار سے کہتے تو مجھے ان کے کام آ کر واقعی مسرت ہوتی۔ ایک جانب یہ ہماری مدد کے خواستگار تھے اور دوسری جانب یہ ہمارا مذاق بھی اڑا رہے تھے۔ لڑکی ان سب سے سلجھی ہوئی لگتی تھی جبکہ تینوں مرد میرا مسلسل مذاق اڑائے جا رہے تھے۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں سانپوں کی خاطر ان کے کام آؤں گا۔ لیکن مجھے ان کی مذاق اُڑانے کی عادت بالکل نہیں بھائی تھی اس لیے میں ان سے اپنا فاصلہ برقرار رکھ کر کام کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ ان کے کام آنے کے بعد خاموشی سے بنوں بی بی کے ڈیرے پر واپس چلا جاؤں گا۔

دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمارا کاپٹر زمین پر اترنے لگا تو سریت نے مجھے ٹہوکا دے کر کہا ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں سرکار، میں نے آنکھیں کھولیں تو سریت نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے جواباً اس کی جانب ایسے دیکھا جیسے اس نے مجھ سے کوئی عجیب سا سوال کیا ہو۔ سریت نے اپنے ساتھیوں کی جانب فاتحانہ انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو دیکھا! میں نے تمہیں غلط تو نہیں کہا تھا۔ جس کے جواب میں سب نے اپنی گردن ہلائی۔ پھر سریت نے مجھے کہا، یہ ہماری منزل ہے۔ کاپٹر اس وقت تک زمین پر اُتر چکا تھا لیکن اس کے پنکھے اب بھی چل رہے تھے جس کی وجہ سے آس پاس کی مٹی اڑنے لگی تھی۔ ہم اس وقت تک کاپٹر میں بیٹھے رہے جب تک کاپٹر کے پنکھے مکمل طور پر رک نہیں گئے۔ سریت نے میری سیٹ بیلٹ کھولی اور میں کالی کو اپنے گرد لپیٹے لنگوٹ سنبھالے ان لوگوں کے پیچھے باہر نکلا۔ کاپٹر سے اترنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ ہم کسی میدان میں اتریں گے جہاں جگہ جگہ گڑھے کھدے ہوں گے اور مزدور ٹولیوں میں بٹے کام میں مصروف ہوں گے۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ ہم کسی میدان یا کھدائی کے مقام کی بجائے ایک پرانے محل نما کھنڈر میں اترے تھے۔ فتح پور سیکری میں یہ اکبر بادشاہ کا وہ محل تھا جسے اس نے بڑی چاہ سے بنوا کر چھوڑ دیا تھا۔ اس جگہ ہو کا عالم تھا۔ لیکن کھنڈر بتا رہے تھے کہ اس محل کی عمارت واقعی کبھی اپنی عظمت کی مثال آپ ہو گی۔

سریت نے مجھے کہا، سرکار آپ میرے ساتھ آئیں باقی لوگ ایک طرف چلنے لگے اور میں سریت کے پیچھے۔ ہم کھنڈر کے گیٹ نما دروازے سے نکل کر ایک ٹوٹے پھوٹے ہال میں داخل ہوئے۔ اس ہال میں چند کمرے تھے جن پر دروازوں کی بجائے ٹاٹ کے پردے ٹنگے تھے۔ ہم پردہ ہٹا کر ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں ایک دیوار اندر کی جانب تھی جس میں ایک بڑا سا سوراخ تھا جہاں سے انسان گزر سکتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ لوگ اندر سے سرنگ کھود رہے ہوں۔ سریت بولا، آپ اس کمرے میں آرام کریں میں آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔

کمرے میں دو بینیں اور دو پوٹلیاں بھی پڑی تھیں۔ شاید یہ ان سپیروں کی تھیں جن کی موت کے بارے یہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ سریت کے

جانے کے بعد میں نے پوٹلیوں کو کھولا تو اس میں مجھے رات کی رانی اور کچھ منکے ہاتھ آئے۔رات کی رانی، منکے اور بین کا مل جانا میرے لیے اچھا شگون تھا۔وہیں زمین پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ نہ جانے مجھے یہاں کتنی دیر رکنا پڑے۔اگر یہاں سانپوں کا آلنا ہوا تو مجھے وہ صاف کرنے میں ایک دن سے زیادہ نہیں لگنا چاہیے۔ ایک آلنے میں عموماً پندرہ بیس سانپ ہوتے ہیں۔اگر چند ایک سانپ اب تک نکل گئے ہوں گے تو دس پندرہ باقی ہونے چاہئیں جن کو جمع کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے۔ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ سریت ایک ٹرے میں سبزیاں اور پھل لے آیا، سرکار آپ کچھ کھا کر آج کی رات یہاں آرام کریں۔ہم صبح آپ کو کام سمجھا دیں گے۔اگر آپ کو رفع حاجت کے لیے جانا ہو تو اس کمرے کے سامنے چلے جائیں۔سریت کے جانے کے بعد میں نے کچھ پھل کھائے اور زمین پر لیٹ کر کالی سے باتیں کرنے کے بعد اپنے بازو کے تکیے پر سر رکھ کر سو گیا۔

صبح آنکھ جلدی کھلی تو خود کو کالی کے پاس وہیں لیٹے پایا جہاں سویا تھا۔کمرے سے باہر نکل کر دیکھا تو سورج ابھی نہیں نکلا تھا اس لیے واپس آ کر مراقبے میں بیٹھ گیا۔نہ جانے کتنی دیر بعد سریت نے مجھے ہلا کر ہوشیار کیا۔آنکھیں کھولیں تو سامنے چاروں میزبان کھڑے تھے۔سریت نے پوچھا، مہاراج رات کو سانپوں نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟ میں نے جواب دیا، بالکل نہیں۔پھر اس نے کہا، ہم لوگ تیار ہیں۔اگر آپ کو تیار ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہو تو ہمیں بتائیں۔ہم آپ کا انتظار کر لیں گے۔میں نے جواب دیا، نہیں! میں تیار ہوں۔ مجھے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ اس نے دیوار کے سوراخ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، ہم اس سرنگ کے راستے محل کے تہہ خانے کی جانب کھود رہے ہیں۔ پچھلے ایک ہفتے سے مسلسل سانپ نمودار ہو رہے ہیں۔اس لیے ہم نے کھودائی کا کام بند کروا دیا ہے۔کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ اندر جا کر دیکھ آئیں۔اگر آپ کو سانپ نظر آئیں تو پکڑ لیں اور نظر نہ آئیں تو ہمیں بتا دیں تا کہ ہم اندر جا کر اپنا کام دوبارہ شروع کر دیں۔ہم چاہتے ہیں کہ کھدائی کے دوران آپ ہمارے ساتھ رہیں۔اگر اس دوران سانپ نکلیں تو آپ انہیں پکڑ کر جمع کرتے جائیں میں نے کہا، ٹھیک ہے میں اندر جا کر دیکھ آتا ہوں۔سریت نے مجھے ایک سفید لباس دیتے ہوئے کہا، آپ یہ کپڑے پہن لیں۔ یہ جراثیم کُش لباس آپ کو باہر کے جراثیم سے محفوظ رکھیں گے۔ہم نہیں چاہتے کہ کھدائی کے مقام پر نامعلوم جراثیم آپ کو نقصان پہنچائیں۔میں نے کپڑے بدلے تو سریت نے میرے سر پر ایک پٹے کی مدد سے ایک بیٹری والا بلب باندھتے ہوئے کہا، اندر اندھیرا ہوگا۔یہ بلب آپ کی راہ میں روشنی کرے گا۔میں اپنے سر پر بلب والا پٹا باندھے دیوار کے سوراخ سے اندر داخل ہوا، سوراخ ڈھلوان کی جانب جا رہا تھا۔جیسے جیسے میں نیچے جا رہا تھا راستہ تنگ اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔مجھے سرنگ میں کوئی سانپ نہیں ملا۔ سرنگ کے آخر میں میرے سامنے ایک دروازہ آ گیا۔دروازہ ایک کمرے میں کھلا کمرے میں داخل ہوا تو ہاں مجھے ایک پرانی مسہری نظر آئی جس کے پاس ایک جائے نماز بچھی تھی اور پاس ایک لوٹا رکھا تھا۔قریب ایک ڈرم پڑا تھا جس میں کچھ بوسیدہ سامان رکھا ہوا تھا۔جائے نماز پر قیمتی کپڑوں میں ملبوس ایک ڈھانچہ سربسجود پڑا تھا۔یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کسی سے چھپ چھپا کر یہاں رہ رہا تھا اور اسی دوران موت سے ہمکنار ہوا تھا۔میں نے خود سے پوچھا، یہ کون تھا اور یہاں کیا کر رہا تھا؟

لیکن اس ڈھانچے سے متعلق جاننے کا مسئلہ میرا نہیں کسی اور کا تھا اس لیے میں نے کمرے میں چاروں جانب نظریں دوڑائیں لیکن مجھے سانپ کہیں نظر نہیں آئے۔آس پاس کوئی سانپ نہ دیکھ کر میں واپس آیا اور سریت کو بتایا کہ مجھے سانپ کہیں نظر نہیں آئے۔میرے دیکھتے ہی دیکھتے چاروں میزبانوں نے خود بھی سفید جراثیم کُش لباس پہنا اور انہوں نے بھی اپنے سروں کے گرد ویسے ہی پٹوں سے بلب باندھے جیسے میرے سر پر باندھا تھا۔اس لباس میں ہم خلا باز لگ رہے تھے۔انہوں نے مجھے آگے چلنے کو کہا تو میں نے اپنے ساتھ بین لے جانے کی خواہش ظاہر کی۔انہوں نے مجھے اجازت دی اور میں ہاتھ میں بین لیے ان کے آگے چلتا ہوا اسی کمرے میں پہنچا اور کونے میں بیٹھ گیا۔ان لوگوں نے آپس میں باتیں شروع کر دیں۔ان کی آپس کی گفتگو سے مجھے معلوم ہوا کہ کمرے میں موجود ڈھانچہ مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کے بھائی دارالشکوہ کا تھا۔ تاریخی اعتبار سے شاہجہاں اپنے بیٹے دارالشکوہ کو اپنا جانشین مقرر کر چکا تھا لیکن اورنگزیب نے اپنے دو بھائیوں کی مدد سے ۱۶۵۷ء میں اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرنے کے بعد اقتدار پر قبضہ کر لیا۔شاہجہاں بھاگ کر آگرہ چلا گیا جہاں اس کے جرنیل جے سنگھ نے غداری کر کے اسے اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ دارالشکوہ بھاگ کر پنجاب چلا گیا جہاں اس کی مخبری مہاراجہ دلگیر سنگھ نے کر دی۔ گرفتاری کے بعد دارالشکوہ کو پنجاب سے دلی تک پابجولاں اورنگ زیب کے جشنِ تاجپوشی میں ایک قیدی کی حیثیت سے دربارِ شاہی میں حاضر کیا گیا۔کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ بادشاہ نے اپنے بھائی کو ۳۰۔اگست ۱۶۵۹ء کو مروا دیا تھا لیکن اس کی لاش کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

اورنگزیب کے مرنے کے بعد اس کے ابراہیم نامی ملازمِ خاص نے دارالشکوہ کے عبرت ناک آخری ایام سے پردہ ہٹایا تھا۔تاریخ کے مطابق دارالشکوہ کو قتل کرنے کی بجائے اورنگزیب نے اسے ایک لوٹا، ایک جائے نماز، ایک ڈرم میں کھانے پینے کا سامان اور ایک مسہری دے کر کہیں نظر بند کر دیا تھا۔کمرے میں ہوا کے لیے ایک سوراخ رکھا گیا اور کمرے کے چاروں طرف سانپ بچھو اور دوسرے حشرات الارض چھوڑ دیئے گئے۔ابراہیم یہ نہیں بتا سکا تھا کہ دارالشکوہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں کہاں مقید تھا یا نظر بند تھا اور اس کی موت کہاں واقع ہوئی تھی۔امریکی آثار قدیمہ کی یہ ٹولی اب تک چھ جگہوں پر کھدائی کر کے دارالشکوہ کی باقیات تلاش کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔فتحپور سیکری کے اس ویران محل کے تہہ خانے میں دارالشکوہ کی موجودگی کے بارے میں اس ٹولی نے اورنگزیب کی اس تحریر سے قیاس لگایا تھا جس کی رو سے دارالشکوہ اپنے دادا جہانگیر کا چہیتا تھا۔جہانگیر نے

شاہجہاں کو اپنے پوتے دارالشکوہ کو جانشین بنانے کی تاکید کی تھی۔ایک اور روایت کے مطابق دارالشکوہ کی شکل اپنے پردادا اکبر اعظم سے ملتی تھی اس لیے جہانگیر اسے پسند کرتا تھا۔وجہ جو بھی تھی یہ بات واضح تھی کہ اورنگزیب نے اپنے بھائی کو پردادا کے متروک محل کے تہہ خانے میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا جہاں اس کی موت سجدے کی حالت میں ہوئی تھی۔ہندوستان کی تاریخ کا ایک ناقابلِ یقین باب اس وقت میری نظروں کے سامنے کھل رہا تھا۔چاروں میزبان کسی شے کو ہاتھ لگائے بنا کمرے میں موجود ساز وسامان کی کئی زاویوں سے تصاویر اتارتے رہے۔مسہری کے قریب ہونے کی وجہ سے ڈھانچے کی تصاویر لینا مشکل ہو رہا تھا۔ڈھانچے کی تصاویر اتارنے کے لیے انہوں نے مسہری کو ایک جانب ہٹانے کی کوشش کی تو وہ وزنی ہونے کی وجہ سے نہیں ہلی۔سریت نے ان سے کہا، میں باہر سے مزدور لے کر آتا ہوں۔سریت وہاں سے نکلا تو موٹے جان نے ڈالیا اور سٹیو کی مدد سے ایک زوردار دھکا دے کر مسہری کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے لیے اپنی پوری توانائی لگائی تو مسہری اپنی جگہ سے فرش کی ایک اینٹ کو اکھاڑتے ہوئے سرکی۔

مسہری سرکنے کی دیر تھی کہ فرش کے سوراخ سے کئی سانپ تیزی سے نکل کر تینوں امریکیوں پر ایسے حملہ آور ہوئے جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتا چھیڑنے سے مکھیاں پاگل ہو کر چھتے سے حملہ آور ہوتی ہیں۔یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ نہ کسی کو بھاگنے کا وقت نہیں ملا اور نہ مجھے سوچنے کا۔ان کی خوفناک چیخوں نے مجھے کمرے کی صورت حال سے آگاہی دی۔اتنے زیادہ سانپ ایک ساتھ دیکھے تو میں نے کھلی آنکھوں سے بین بجانا شروع کر دی۔بین کی آواز سے سانپوں کے حولے میں ٹھہراؤ آ گیا اور وہ امریکیوں کو چھوڑ کر میرے گرد جمع ہو کر ایسے بیٹھنے لگے جیسے مداری کے گرد تماش بین۔امریکی کبھی مجھے بین بجاتے اور کبھی سانپوں کو میرے سامنے خاموشی سے بیٹھا دیکھنے میں محو ہو کر اپنی جگہ منجمد ہو گئے تھے۔میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں باہر نکل جانے کو کہا۔میرے اشارے نے جیسے انہیں حیرت کدے سے نکالا اور انہوں نے باہر کی جانب دوڑ لگائی۔ان کے نکلنے کے بعد میں نے سانپوں کی جانب توجہ دی۔میرے آگے پندرہ کے لگ بھگ کریٹ سانپ بیٹھے تھے۔تین فٹ لمبا کریٹ سانپ ہندوستان کے چار زہریلے ترین سانپوں میں شمار کیا جاتا ہے۔یہ سانپ کریٹ اس لیے کہلاتا ہے کہ اس کی رنگت کریٹے کے درخت کے تنے سے ملتی جلتی ہے۔یہ سانپ زہریلا ہونے کے ساتھ ساتھ پھرتیلا بھی ہوتا ہے اور غصے کی حالت میں ایک سے زیادہ بار کاٹتا ہے۔اس لحاظ سے یہ سانپ شیش ناگ سے بھی زیادہ خطرناک تصور کیا جاتا ہے۔اس سانپ کی ایک آدھ کاٹ سے تو انسان کے بچنے کے آثار ہوتے ہیں لیکن زیادہ بار کاٹنے سے بچنے کی امید کم سے کم تر جاتی ہے۔میں نے ایک ہاتھ سے بین بجاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ایک ایک کر کے سانپ آہستگی سے پاس پڑے ہوئے ڈرم میں ڈالنا شروع کر دیئے۔تمام سانپوں کو ڈرم میں ڈال کر میں نے اپنے جسم سے جراثیم کش سوٹ اتارا اور ڈرم کے منہ پر باندھ دیا۔اس کے بعد میں نے مسہری کے فرش سے نیچے دیکھا تو مجھے ایک سوراخ نظر آیا جہاں مسہری کے پائے کے نیچے کالے جان نے زور لگا کر مسہری ہلا کر سانپوں کو مشتعل کیا تھا۔اپنے سر کے بلب کی روشنی سے سوراخ کے اندر دیکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے وہاں نیچے ایک اور کمرہ تھا جہاں سے سانپ نکل کر آ رہے تھے۔

یہاں کچھ اور کام کرنے سے پہلے میں باہر جا کر سانپ کے ڈسے تینوں امریکیوں کو دیکھنا چاہتا تھا اس لیے میں نے اس سوراخ کا منہ ڈرم سے بند کیا اور کمرے سے نکل کر سرنگ کے راستے باہر آیا تو تینوں امریکی فرش پر پڑے کراہ رہے تھے اور سریت ان کے جسم سے جراثیم کش کپڑے اتار چکا تھا۔میں نے سریت سے کہا، جتنی جلدی ہو سکے بازار سے زندہ مرغیاں لے آؤ۔کتنی؟ اس نے پوچھا۔جتنی زیادہ اور جتنی جلدی لے کر آ سکتے ہو لے آؤ۔اگر ایک جگہ سے بہت ساری مرغیاں نہ ملیں تو جتنی بھی ملیں کسی کے ہاتھ بھجوانے میں دیر نہ کرنا۔کیوں؟ اس نے دوسرا سوال کیا۔بس جاؤ، یہ سوال و جواب کا وقت نہیں ہے، میں نے اسے سختی سے کہا۔کسی کو اپنے ساتھ لیتے جاؤ اور جتنی جلدی ہو سکے اُس کے ہاتھ کچھ نہ کچھ مرغیاں بھجوا دو۔اور ہاں اگر کہیں سے ببول کے کانٹے لا سکتے ہو تو وہ بھی لیتے آنا۔جی اچھا کہہ کر سریت نے پاس کھڑی ہوئی گاڑی میں دو مزدور اپنے ساتھ لے کر گاڑی آگے بڑھائی تو میں نے تینوں امریکیوں کی جانب توجہ دی جو زمین پر لیٹے درد سے بری طرح کراہ رہے تھے۔

اس افراتفری کے عالم میں میں نے اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ میں ان لوگوں کی نظروں میں انگریزی زبان سے نابلد تھا۔تینوں میں کالے کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی اس لیے میں نے قریب بیٹھ کر جان سے انگریزی میں مخاطب ہو کر کہا، ہلنا مت! بس اسی حالت میں پڑے رہو اور مجھے بتاؤ کہ تمہیں سانپوں نے کہاں کہاں کاٹا ہے۔اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا، ہر جگہ کاٹا ہے۔اس کے کراہنے میں مجھے حیرت کا عنصر صاف نظر آتا تھا۔اسے میرے خالص برطانوی لہجے میں انگریزی بولنے پر اس قدر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ درد کی کیفیت کے باوجود اپنی حیرت کو نہ چھپا سکا تھا۔لیکن میرے پاس اس کی حیرت دور کرنے کا وقت نہیں تھا۔میں نے انڈرویئر کے علاوہ اس کے تمام کپڑے پھاڑ کر اس کا جسم دیکھا۔اس کی بات بجا تھی۔اس کے جسم پر میں نے دس جگہوں پر سانپ کی کاٹ کے نشان دیکھے۔اسے انتظار کرنے کو کہہ کر میں گورے سٹیو کی جانب متوجہ ہوا اور اس سے وہی سوال کیا۔اس نے جواب دیا، میری دونوں ٹانگوں میں آگ لگی ہے۔میں نے اس کی پتلون کاٹ ڈالی۔اس کے دائیں ٹخنے اور بائیں گھٹنے پر کاٹ کے دو نشان تھے۔پھر ڈالیا کی طرف متوجہ ہوا جو درد کی شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو چکی تھی۔اسے اٹھا کر میں سامنے والے کمرے میں لے گیا۔اسے زمین پر آہستہ سے لٹا کر اس کے کپڑے پھاڑ کر جسم سے علیحدہ کیے تو مجھے اس کی بائیں ران پر کاٹ کے دو نشان نظر آئے اور کاٹ کا ایک نشان اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر ملا۔میں نے اس کی کاٹ پر منکے لگائے اور اپنی لنگی پھاڑ کر آدھی سے اس کا

جسم ڈھانپااور آدھی لنگی باندھ کر باہر آ گیا۔

باہر نکل کر دیکھا تو ایک مزدور چھ مرغیاں لے آیا تھا۔ میں نے جان سے کہا، خواہ تمہیں کتنا شدید درد ہو اب تم بالکل نہیں ہلو گے کیونکہ تمہارے ہلنے سے مرغیاں پھڑ پھڑائیں گی جس سے تمہارے اندر کا زہر نکلنے میں دیر لگے گی۔ ساتھ ہی میں نے پاس کھڑے ہوئے تین مزدوروں سے کہا، دونوں ہاتھوں میں ایک ایک مرغی لے کر مرغیوں کی اعضا رفع حاجت (Cloacal aperture) کو جان کے جسم پر سانپ کے زخم کے اوپر مضبوطی سے جما کر رکھو۔ تین مزدوروں نے اپنی ڈیوٹی سنبھالی تو میں نے کچھ منکے جان کے باقی زخموں پر لگانا شروع کر دیے۔ ایسے میں سریت بیس زندہ مرغیوں کا ایک ٹوکرہ لے کر آ پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ببول کی ایک شاخ میرے حوالے کر دی۔ ایک مزدور کو ببول کی شاخ دے کر میں نے کانٹے توڑنے کو کہا اور ٹوکرے سے مرغیاں لے کر میں نے دو مرغیاں سریت کو اور دو اس کے ساتھ آنے والے مزدور کو دے کر انہیں مرغیاں جان کے جسم پر سانپ کی بقیہ کاٹ پر رکھنے کو کہا۔ سٹیو اس وقت ہشیار تھا اس لیے اسے دو مرغیاں پکڑا کر اپنے زخم پر رکھنے کو کہا اور اس کی باقی کاٹوں پر منکے لگائے۔ سریت نے مجھے انگریزی بولتا سن لیا تھا جس کے نتیجے میں اس کا چہرہ ندامت کے پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔

انہیں وہیں چھوڑ کر میں کمرے میں ڈالیا کے پاس گیا۔ وہ اب بھی بے ہوش تھی لیکن اس کے جسم سے منکے گر چکے تھے۔ میں نے اور منکے لگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں چپکے اس لیے منکوں کی بجائے کاٹ کے زخموں پر ببول کے کانٹے گاڑ دیے۔ مجھے لڑکی کے بارے میں تسلی تھی کہ وہ صرف تین بار ڈسی گئی تھی اور اس کی بے ہوشی میں سانپ کے زہر سے زیادہ سانپ کے خوف کا ہاتھ تھا۔ اس کی بے ہوشی میرے لیے اچھی تھی کیونکہ میں دوسروں کو پر توجہ دے سکتا تھا۔ اس کے جسم کو ڈھانپ کر میں ایک بار پھر باہر آیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر کالے اور موٹے جان کی تھی جس کے جسم پر کاٹ کے دس نشان تھے۔ جان کے زخموں سے زہر چوس کر چار مرغیاں مر چکی تھیں۔ میں نے مزدوروں کو زندہ مرغیاں زخموں پر دوبارہ رکھنے کو کہا۔ پھر سٹیو کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر درد کی سرخی مدہم پڑ گئی تھی، اس کے زخم پر ایک مرغی دم توڑ رہی تھی اور دوسری مرغی کی حالت پتلی تھی۔ میں نے وہاں بھی نیم مردہ مرغی کی بجائے تازہ مرغی تبدیل کر دی اور اس سے پوچھا اب تم کیسے ہو؟ وہ بولا، ٹانگوں کی جلن ختم تو نہیں ہوئی، ماند ضرور پڑ گئی ہے۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا، بس تم اپنی جگہ سے مت ہلو۔ کیوں؟ اس نے پوچھا۔ ہلنے سے تمہارے خون کا دوران تیز ہو جائے گا جس سے زہر جسم میں جلدی پھیلے گا۔ میں پھیلنے سے پہلے تمہارے جسم سے سارا زہر نچوڑنا چاہتا ہوں۔

پھر میں جان کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کے جسم سے زہر چوس کر چھ مرغیاں مر چکی تھیں اور اس وقت تین مزدور اور سریت ہاتھوں میں آٹھ مرغیاں لئے اس کے آس پاس موجود تھے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار کم ہو چکے تھے۔ لیکن اس کی حالت اب بھی پتلی تھی۔ میں نے اس کی ایک کاٹ میں ببول کا کانٹا گاڑتے ہوئے کہا، کانٹوں کو اپنے جسم سے مت نکالنا۔ سریت نے مجھ سے شاید جان کی موجودگی کی وجہ سے انگریزی میں پوچھا، ان کانٹوں کے زخم میں گاڑنے کی کیا وجہ ہے؟ میں نے جواب دیا، سانپ کی ایک سے زیادہ کاٹ سے جسم سے سارا زہر نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ کانٹے کسی چوسنی کی طرح گردش کرتے ہوئے خون سے مسلسل زہر چوستے رہیں گے۔ سریت بولا، تم منکے کی بجائے مرغیوں کا استعمال کیوں کر رہے ہو؟ ایک سے زیادہ کاٹ پر منکے کم موثر ہوتے ہیں اور ان کو کریٹ سانپ نے کاٹا تھا۔ اس سانپ کا زہر چربی میں حل (Fat Soluble) ہوتا ہے اور اگر یہ زہر جسم میں تیس منٹ سے زیادہ رہ جائے تو جسم کی چربی میں حل ہو کر انسان کو اندر سے آہستہ آہستہ مارتا رہتا ہے۔ جس سے ایک تو بچنے کی امید کم ہو جاتی ہے اور اگر انسان بچ بھی جائے تو یہ زہر جسم پر مستقل مضر اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پھیلنے سے پہلے ان کے جسم سے زہر نکال لوں۔ ایسے میں جان کے جسم پر زہر چوس کر تین اور مرغیاں نیم مردہ ہو گئیں اور دو نے دم توڑ دیا۔ میں نے وہاں بھی مرغیاں تبدیل کروا دیں۔ جان کی حالت اب سنبھلنا شروع ہو گئی تھی۔

سٹیو بھی اب پہلے سے بہتر لگ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں بھی ندامت کی پرچھائیاں تھیں لیکن وہ خاموش تھا۔ اس کے جسم پر رکھی ہوئی مرغیاں ابھی تک چاک و چوبند تھیں۔ میں نے کاٹ کے زخموں پر منکے لگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں چپکے۔ کچھ کہے بنا میں نے اس کے زخموں پر بھی ببول کے کانٹے گاڑ دیے۔ کیونکہ اس نے سریت کے ساتھ میری گفتگو سن لی تھی اس لیے اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ ان سے فارغ ہو کر میں ایک بار پھر کمرے میں ڈالیا کے پاس گیا تو وہ ہوش میں آ چکی تھی۔ سب سے پہلے میں نے اجازت کے بغیر اس کے کپڑے پھاڑنے پر معذرت کرتے ہوئے کہا، اگر میں آپ کے کپڑے پھاڑنے کی بجائے ہوش میں آنے کا انتظار کرتا تو میں آپ کے جسم سے سانپوں کا زہر جلدی نہ نکال سکتا۔ جو آپ کی صحت کے لیے مضر ہوتا۔ پھر میں نے کاٹ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا، آپ کو تین سانپوں نے کاٹا تھا لیکن کاٹ گہری نہیں تھی منکوں نے زہر نکال دیا ہے۔ اپنے جسم میں کانٹے لگے رہنے دیں پھر میں نے اسے جسم میں کانٹے گاڑے رہنے کی وجہ بھی بتائی۔ اس کے بعد میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے اسے بتایا، سٹیو اور جان بھی باہر پڑے ہیں اور دونوں کی حالت آپ سے زیادہ خراب ہے۔ جان کو سانپوں نے دس بار کاٹا ہے اور سٹیو کو چار بار۔ ان کے جسم سے بھی زہر نکالا جا رہا ہے۔ میری بات پر توجہ دینے کے ساتھ مجھے برطانوی لہجے میں انگریزی میں بولتا سن کر وہ مسکرانے لگی لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔

اسے وہیں چھوڑ کر میں ایک بار پھر باہر آیا۔ جان کی حالت اب بہت بہتر دکھائی دے رہی تھی۔ جو مرغیاں میں نے اس کے جسم پر کچھ دیر پہلے رکھی

تھیں وہ ابھی تک ہشاش بشاش تھیں۔ جان کے جسم سے تمام مرغیاں ہٹا کر میں نے اس کے جسم پر کاٹ کے تمام زخموں پر بھی ببول کے کانٹے لگا کر دونوں سے پوچھا، تم لوگ کہاں رہ رہے ہو؟ ہم لوگوں نے محل سے باہر مسجد کے پاس ٹینٹ لگائے ہوئے ہیں، سریت بولا۔ اگر تم لوگ ہولے ہولے چل کر اپنے ٹینٹ میں جا سکتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن تم اگلے چوبیس گھنٹے بغیر ہلے ان کانٹوں کو اپنے جسم میں برداشت کیے بستر پر لیٹے رہو گے۔ اگر تم میرا کہنا مان لو گے تو کل تک تمہارا جسم کریٹے سانپ کی زہر سے مستقل طور پر آزاد ہو جائے گا۔ کیا ہمیں مرغیوں کی طرح کانٹے بھی تبدیل کرنے ہوں گے؟ جان نے پوچھا۔ نہیں، میں نے جواب دیا۔ کانٹے مسلسل زہر چوستے رہتے ہیں جبکہ مردہ مرغیاں زہر چوسنا بند کر دیتی ہیں۔ پھر میں نے سریت سے کہا، تمام مری اور ادھ مری مرغیاں کوڑے پر پھینکنے کی بجائے زمین میں دفن کروا دو یا کسی ڈرم میں ڈال کر جلا دو۔ کیوں؟ جان نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، کوڑے پر پھینکی ہوئی مردہ مرغیاں غریب لوگ اٹھا کر گھر میں پکا کے کھاتے ہیں۔ جن مزدوروں سے کہہ کر مرغیاں اپنے سامنے دفن کروانا ان مزدوروں کو بھی بتانا کہ یہ مرغیاں کھانے سے ان کے جسم میں سانپ کا زہر داخل ہو جائے گا۔ اور ہاں! ڈالیا کو اپنے ٹینٹ تک جانے سے پہلے باہر نکلنے کے لیے کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔ بے ہوشی کے عالم میں اس کا علاج کرنے کے لیے مجھے اس کے کپڑے پھاڑنے پڑے تھے۔ سریت اٹھتے ہوئے بولا، جی اچھا! میں اس کے لیے کپڑے لاتا ہوں۔

جان اور سٹیو اٹھتے ہوئے بولے، ہم اپنے ٹینٹ میں جا کر لیٹتے ہیں۔ میں نے انہیں ایک اور ہدایت دیتے ہوئے کہا! اگلے چوبیس گھنٹوں میں تم تینوں نہ شراب پینا اور نہ ہی مرغن غذا کھانا۔ وہ کیوں؟ جان نے پوچھا۔ شراب کی خون میں موجودگی سے سانپ کا زہر دس گنا تیز ہو جاتا ہے اور زہر روغن میں شامل ہو ہوتا ہے جو تمہاری روغنی غذا میں حل کر تمہارے جسم سے چپک کر رہ جائے گا۔ وہ ابھی کمرے سے نہیں نکلے تھے کہ میں نے تینوں سے مخاطب ہو کر کہا، ڈھانچے والے کمرے کے نیچے ایک اور کمرہ ہے جہاں ان سانپوں کا آلنا معلوم پڑتا ہے۔ میں سوراخ کو بڑا کر کے اندر جا کر دیکھ آتا ہوں۔ جان بولا، بھئی اب تو تم ہی ہمارے انچارج ہو جیسا مناسب سمجھو کرو اور ہمیں جیسا حکم دو گے ہم ویسا ہی کریں گے۔ سٹیو نے گرہ لگائی، میں جان کی تائید کرتا ہوں۔ تم نے چند منٹوں میں ہمارے لیے جو کچھ کیا ہے اور جس تیزی اور سوجھ بوجھ سے کیا ہے اس نے ہمیں سانپوں کے بارے میں تمہارے علم کا قائل کر دیا ہے۔ میں نے جواب دیا، آپ کا شکریہ۔ میں نے وہی فرض ادا کیا ہے جس کی وجہ سے آپ مجھے سندر بن سے یہاں لائے تھے۔ جان نے کچھ سوچ کر کہا، ہمیں وہاں جانے کی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے کل تک کے لیے سارا کام ملتوی کر دیتے ہیں اور پھر سانپوں کو بھی چوبیس گھنٹوں میں پُرسکون ہونے کا وقت مل جائے گا۔ جان کی بات درست تھی۔ نہ جانے وہاں کتنے سانپ تھے اور اب جب کہ ان کا آلنا ہل چکا تھا تو وہ بپھرے پھرتے ہوں گے۔ انہیں پُرسکون ہونے کے لیے کچھ وقت دینا ضروری تھا اس لیے میں نے حامی بھرتے ہوئے کہا، آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں باقی کام کل کریں گے۔

سریت نے چند منٹ بعد چادر لا کر میرے حوالے کر دی۔ چادر لئے کمرے میں گیا تو ڈالیا کی آنکھیں بند تھیں۔ میں کچھ کہے بنا کمرے سے نکلنے لگا تو پیچھے سے اس کی آواز آئی۔ میں باہوش ہوں۔ کہو کیا بات ہے؟ میں نے اس کے ہاتھ پر چادر رکھی اور کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا، یہ چادر اپنے گرد لپیٹ کر اپنے ٹینٹ میں جا کر اگلے چوبیس گھنٹے آرام کریں اور آج کے لیے کانٹے جسم میں برداشت کر لیں تا کہ یہ آپ کے جسم سے سانپوں کا زہر مکمل طور پر چوس لیں۔ اپنے بدن کے گرد چادر لپیٹ کر وہ باہر نکلی۔ اپنی لنگوٹی کا جو حصہ پھاڑ کر میں نے اس پر ڈالا تھا وہ اس کے کندھوں پر رکھا تھا۔ ڈالیا نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور میرے بائیں کان کے قریب منہ کر کے آہستہ سے شکریہ کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

تمام لوگ جا چکے تھے اور مجھے کل تک کے لیے کچھ نہیں کرنا تھا اس لیے میں بھی اسی کمرے کی جانب روانہ ہو گیا جہاں کل رات زمین پر سویا تھا۔ ابھی کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ سریت داخل ہو کر میرے قدموں پر گر کر رو رو کر اپنے اور اپنے امریکی ساتھیوں کی جانب سے میرے بارے میں اپنے غیر انسانی رویے پر مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ میں نے اسے اٹھا کر گلے لگاتے ہوئے کہا، گزری ہوئی باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ بولا، جان اور سٹیو بھی تم سے سخت شرمندہ ہیں۔ وہ تم سے ذاتی طور پر معافی مانگنا چاہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ تم یہاں نہ رہو بلکہ ہمارے ساتھ ٹینٹ میں رہو۔ میں نے اسے بازو میں بھرتے ہوئے کہا، چلو۔ محل سے باہر مسجد کے سامنے تین ٹینٹ لگے تھے ہم پہلے ٹینٹ میں داخل ہوئے جہاں دو بستر لگے تھے۔ ایک پر جان اور دوسرے پر سٹیو لیٹا تھا۔ دونوں نے سریت کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھا تو میں نے کہا، بس میری ایک گزارش ہے کہ کسی بھی انسان کو خواہ وہ شکل وصورت یا لباس سے کتنا ہی کم تر کیوں نہ لگے، حقیر نہ سمجھیں۔ جان بولا، تمہیں یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ آج مجھے زندگی نے وہ سبق سکھایا ہے جسے میں قبر میں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ سٹیو بولا، میں اپنی زندگی میں کبھی کسی سے اتنا شرمندہ نہیں ہوا جتنا آج تم سے ہوا ہوں۔ میں نے کہا، اگر ہم اس واقعے کو ایک بھول سمجھ کر آگے بڑھ جائیں تو ہم سب کے لیے اچھا ہوگا۔

جان نے کہا، ہماری جان بچانے کا بہت بہت شکریہ۔ جس ہوشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آج تم نے ہم سب کا علاج کیا ہے یہ میری سوچ سے بلند تھا۔ اگر یہ حادثہ امریکہ میں ہوا ہوتا تو ایمرجنسی کا عملہ آنے اور ہمیں ہسپتال تک لے جانے تک کم از کم میرا کام تمام ہو جاتا۔ مجھے ہندوستان کے چار بڑے زہریلے سانپوں میں سے ایک نے دس جگہوں پر کاٹا ہے اور میں ابھی تک نہ صرف زندہ بلکہ خود کو ہر لمحہ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ یقین کرو سانپوں کے

ڈسے جانے کے بعد میں جب باہر بھاگا تھا تو مجھے اپنی موت چند لمحوں دور نظر آ رہی تھی۔ سٹیو بولا، تمہارا طریقہ علاج بھی بڑا عجیب تھا، کیا تم مجھے اس طریقے کی سائنسی وجہ اگر کوئی ہے تو بتانا پسند کرو گے؟ میں نے جواب دیا، گردے (Kidenys) نہ ہونے کی وجہ سے پرندے Cloacal aperture کے ذریعے اخراج کے وقت تک فضلے سے پانی اور غیر ہضم شدہ پروٹین واپس چوستے رہتے ہیں۔ سانپ کا زہر بھی پروٹین ہے اور پرندوں Cloacal Aperture کے واپس چوسنے کے اسی عمل کو سپیرے استعمال کرتے ہیں۔ یہ طریقہ علاج سانپ ڈسے جانے کے پہلے چند منٹوں کے اندر اندر کارآمد ہوتا ہے۔ دیر ہونے کے ساتھ اس کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ پندرہ مرغیوں نے اپنی جان دے کر تمہارے اندر کا زہر چوس لیا ہے۔ ببول کے کانٹے میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر لگائے ہیں جیسے آپریشن کر کے سرطان کی گلٹی نکالنے کے بعد حفظِ ماتقدم کے طور پر ڈاکٹر مریض کی کیموتھراپی کرتے ہیں۔

تم یہ کام کب سے کر رہے ہو؟ جان نے پوچھا۔ یہی کچھ کرتے ہوئے ہوش سنبھالا ہے، میں نے جواب دیا۔ اس نے سریت کی جانب رخ کر کے کہا، معاف کرنا سریت! پھر میری جانب رخ کر کے کہا، تمہارا انگریزی لب ولہجہ اور لفاظی سریت سے بہتر ہے۔ اگر تم یہ کام بچپن سے کر رہے ہو تو تم نے انگریزی بول چال اور سانپوں کا سائنسی علم کہاں سے حاصل کیا ہے؟ اس کے پیچھے ایک لمبی سرگزشت ہے جو نہ مجھے سنانے کی تاب ہے اور نہ ہی تم لوگوں کے پاس اتنا وقت ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم فطرت کے بنائے ہوئے کھیل کے چند مہرے ہیں۔ ہاں یہ بات تو ہے، جان نے کہا۔ ویسے اب تم خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟ میں نے پوچھا۔ جس وقت مجھے سانپ نے کاٹا تھا اس وقت مجھے اپنے بدن میں خون کی بجائے آگ گردش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تمہارے علاج کے بعد جسم پر کانٹوں کی چبھن کے علاوہ اور کچھ محسوس نہیں ہو رہا۔ میرا بھی یہی حال ہے، جان نے سٹیو کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ یہ اچھی علامت ہے، میں نے انہیں بتایا۔ اور ہاں! تم کھانا بھی ہمارے ساتھ کھایا کرو گے، سٹیو بولا، ہمیں بتا دو کہ تم کیا کیا نہیں کھاتے تا کہ ہم اپنے باورچی کو پکانے سے منع کر دیں۔ میں نے جواب دیا، میں دراصل جعلی قسم کا شمان ہوں اس لیے ہر چیز کھاتا ہوں۔ جان نے کہا، ارے ہاں! ہم تمہارا نام پوچھنا تو بھول گئے۔ کم از کم نام کی حد تک جعلی شمان نہیں ہوں۔ میرا نام شمان ہی ہے، میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ہماری باتوں کے دوران باورچی نے آ کر سریت سے کھانے کا پوچھا۔ وہ لہجے سے بنگالی لگتا تھا اس لیے میں نے اس سے بنگالی میں بات کرتے ہوئے کہا، آج اور کل تم ہم سب کے لیے سبزیوں کی یخنی بناؤ گے۔ کل کے بعد پھر دیکھی جائے گی۔ وہ چلا گیا تو سریت نے مجھے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا تم بنگالی بھی اہلِ زبان کی طرح بول رہے ہو۔ ہاں، میں چار پانچ زبانیں اور بھی جانتا ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ تم نے میری شراب بند کرا کر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے، جان نے ہنس کر کہا، تمہارے فائدے کے لیے ہی کیا ہے، سٹیو بولا۔ اسی لیے تو میں نے اس کی بات مان لی ہے، جان نے جواب دیا۔

ہم نے کچھ وقت وہیں بیٹھ کر گزارہ اور کھانا بھی اکٹھے کھایا۔ کھانا کیا تھا ابلی ہوئی سبزیاں۔ جان کھاتے کھاتے منہ بنا رہا تھا۔ پھر مجھے کہنے لگا تم نے گوشت خور اور شرابی کو گھاس خور بنا دیا ہے۔ کل سے تم اپنے گوشت اور شراب کی معمولات پر واپس آ سکتے ہو، میں نے جواب دیا۔ وہ سوالات کرتے رہے اور میں حسبِ عادت مختصر جوابات دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہاں سے نکل کر میں سریت کے ساتھ اس کے خیمے میں آیا تو سریت نے میرے لیے دوسرا بستر بچھوا دیا تھا۔ میں نے سریت سے کہا، ایک تو میرے ساتھ سانپ ہے اس لیے میں آپ کے خیمے میں سو کر کوئی مشکل پیدا نہیں کرنا چاہتا اور یہ کہ میں رات کو مراقبے میں رہتا ہوں اس لیے میں خیمے کی بجائے رات بھی وہیں بسر کروں گا جہاں کل کی تھی۔ اس نے میری بات سمجھتے ہوئے اسی کمرے میں بستر بچھوا کر ایک ٹیبل لیمپ بھی رکھوا دیا۔ اپنے کمرے میں آیا تو باہر اندھیرا چھا چکا تھا اور لیمپ روشن تھا۔ مراقبے میں جانے کے لیے میں نے لیمپ بجھا کر کمرے میں اندھیرا کر دیا۔ اندھیرے میں کوبرے کی آنکھیں بلی کی طرح چمکتی ہیں۔ جب میں کالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مراقبہ کرتا ہوں تو کالی اپنا بدن زمین سے اٹھا کر اپنی آنکھیں میری آنکھوں کی اونچائی پر لا کر میرے سامنے ایک فٹ کی دوری پر پھن پھیلائے کسی گھڑیال کے پنڈولم کی طرح تسلسل سے ہوا میں لہراتی رہتی ہے۔ مراقبے کی تیاری میں زمین پر بیٹھ گیا اور کالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ کالی کے ساتھ میرا مراقبہ تقریباً دو تین گھنٹے لمبا ہوتا ہے۔ مجھے مراقبے میں گئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ کالی کی سرسراہٹ میں تسلسل کی جگہ بے چینی آنے لگی جس کی وجہ سے مجھے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی توجہ ایک مرکز پر مبذول کرنے میں مشکل پیش آنے لگی۔ کالی ایسی حرکت آس پاس کسی اور کی موجودگی کی وجہ سے کرتی ہے۔ اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے اپنے پیچھے زمین پر ایک سایہ بیٹھا نظر آیا۔ اتنے گہرے اندھیرے میں یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ کون ہے اس لیے میں نے سٹول کر ٹیبل لیمپ جلانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا، کون ہے؟ بتی بجھی رہنے دیں۔ مجھے اندھیرے میں باتیں کرنا اچھا لگتا ہے، میرے پیچھے سے ڈالیا کی ٹھہری ہوئی آواز آئی۔

مورچہ

سارا دن ایک دوسرے سے لڑائی کے بعد رات کو ایک ہی مورچے میں آرام کرنے والے بااُصول جنگجوؤں کو آسان اُردو میں میاں بیوی کہتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی

خوبروترین ڈوبنے والا

(لاطینی کہانی)

ظفر قریشی (نیویارک)

ساحل پر کھیلنے والے بچوں نے اسے سب سے پہلے دیکھا تھا۔ ایک لمبوترا سا دھبّہ، ڈوبتا، ابھرتا ساحل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بچوں نے اپنے آپ کو یقین دلا دیا تھا کہ دھبّہ دشمن کا بحری جہاز ہے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ اس دھبّے سے نہ کوئی پرچم بلند ہو رہا ہے اور نہ کوئی ایسی چیز ہے جو اسے بحری جہاز ثابت کرتی۔ تب انہوں نے سوچا کہ پھر یہ یقیناً وہیل مچھلی ہے۔ دھبّہ آہستہ آہستہ جب ساحل سے آ لگا اور انہوں نے اس سے چمٹی ہوئی سمندری گھاس، کوڑا کرکٹ اور مردہ جیلی فش کے اعضا، دیگر مچھلیوں کے کانٹے وغیرہ صاف کئے تو دیکھا یہ ایک ڈوبے ہوئے آدمی کی لاش تھی۔

وہ لاش کے ساتھ ساری دوپہر کھیلتے رہے تھے۔ کبھی وہ اسے ساحلی ریت میں دبا دیتے تھے اور کبھی کھود کر باہر نکال لیتے تھے کہ کسی نے انہیں لاش سے کھیلتے دیکھ کر قریبی گاؤں والوں کو مطلع کیا۔ گاؤں سے کچھ لوگ آئے تا کہ اسے اٹھا کر قریب ترین گھر تک پہنچا دیں۔ لاش کو اٹھاتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ یہ لاش ان تمام مُردوں کی لاشوں سے بھاری ہے جو انہوں نے اب تک اٹھائی تھیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس لاش کا وزن کسی گھوڑے کے وزن کے برابر تھا۔ یہ محسوس کر کے انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ شاید اس شخص کو ڈوب کر ہلاک ہوئے بہت دن ہو چکے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ سمندری پانی اس کی ہڈیوں میں اتر چکا تھا۔ جب انہوں نے لاش کو فرش پر رکھا تو انہیں احساس ہوا کہ مردہ شخص گاؤں کے تمام مردوں سے لمبا تھا۔ ان کو اس کے قد آور ہونے کا احساس اس لیے بھی ہوا کہ لاش کو فرش پر رکھنے کے بعد کمرے میں بہت کم جگہ باقی بچی تھی۔ پھر انہوں نے سوچا کہ شاید بعض لوگ ڈوب کر مرنے کے بعد بھی بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ شاید مسلسل بڑے ہوتے رہنا ان کی فطرت ہوتی ہے۔ لاش سے سمندر کی بساندھ آ رہی تھی۔ لاش کی ساخت ظاہر کرتی تھی کہ یہ کسی انسان کی لاش ہے کیونکہ اس کے جسم پر کھال کی جگہ مٹی اور مچھلی کے چھلکے تھے۔

یہ جاننے کے لیے کہ مردہ شخص اجنبی تھا، انہیں اس کا منہ صاف کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ گاؤں لکڑی کے بنے ہوئے بیس گھروں پر مشتمل تھا۔ کچھ گھروں میں پھولوں کے پودے بھی نہیں تھے۔ سارے گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر اور ریگستا نما علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ گھروں کے اطراف میں زمین اتنی قلیل تھی کہ ماؤں کو ہمیشہ خوف ہوتا کہ تیز ہوا ان کے بچوں کو اڑا لے جائے گی اور گاؤں میں گزشتہ برسوں کے دوران جو تھوڑی بہت اموات ہوئی تھیں وہ پہاڑیوں سے گرنے کے سبب ہوئی تھیں لیکن سمندر پرسکون اور خوبصورت تھا۔ پورے گاؤں میں سات کشتیاں تھیں جو گاؤں والوں کے لیے کافی ہیں۔ لہٰذا جب ڈوبے ہوئے شخص کی لاش برآمد ہوئی تو انہیں سرسری طور پر ایک دوسرے کی طرف دیکھنا پڑا تھا کہ متوفی کہیں ان میں سے ایک نہ ہو۔

اس رات وہ مچھلیاں پکڑنے سمندر کی طرف نہیں گئے بلکہ اڑوس پڑوس کے گاؤں دیہات کی جانب نکل گئے کہ معلوم کریں کہ ڈوبنے والا کہیں ان کا آدمی نہ ہو۔ لاش کی دیکھ بھال کرنے کی غرض سے ساری عورتیں اس گھر میں جمع ہو گئیں جس میں لاش رکھی گئی تھی۔ گھاس پھوس کے پھاہے بنا کر انہوں نے ڈوبنے والے کو صاف کرنا شروع کیا۔ انہوں نے لاش کے بالوں میں پھنسے ہوئے سمندری کنکر پتھر نکالے۔ مچھلی صاف کرنے کے اوزاروں سے کھال پر جمی مٹی ہٹائی۔ اس کے لیے انہیں مٹی کھرچنا پڑی۔ لاش کی صفائی کے دوران انہوں نے دیکھا کہ لاش پر اگنے والے پودے اطراف کے سمندری علاقے کے نہیں تھے بلکہ گہرے پانیوں کو پار کرنے کے بعد جو سمندر تھے یہ جڑی بوٹیاں ان ہی کی تھیں۔ لاش کے تن پر موجود کپڑے پھٹے پرانے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے لاش سمندر کی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان سے گزری ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ متوفی نے پروقار طریقے سے موت کو گلے لگایا ہے کیونکہ اس کے چہرے پر اس طرح کی ہوائیاں نہیں اڑ رہی تھیں جیسی دریاؤں میں ڈوبنے والے دیگر افراد کے منہ پر ہوتی ہیں۔ ان دوسرے افراد کے چہرے خستہ حال، ضرورت مند اور بھٹکے ہوؤں کے چہرے ہوتے ہیں۔ جب عورتوں نے صفائی مکمل کر لی تب ان کو اندازہ ہوا کہ مرنے والا کس قسم کا آدمی تھا اور اس انکشاف سے ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔ وہ طویل القامت ترین، طاقتور ترین، صحت مند ترین اور بھرپور مردانہ وجاہت کا حامل شخص تھا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے ایسا آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا بلکہ ان کے ذہنوں میں بھی ایسے کسی مرد کا تصور بھی نہ تھا۔

پورے گاؤں میں انہیں ایک بھی اتنی بڑی مسہری نہیں ملی تھی جس پر اس کی لاش کو لٹایا جا سکتا۔ گاؤں کی عورتوں کو اس کی آخری رسومات کے لیے لکڑی کی بنی ہوئی ایک بڑی میز کی ضرورت تھی جو مضبوط بھی ہو لیکن پورے گاؤں میں ایسی میز بھی نہ ملی۔ گاؤں کے سب سے لمبے فرد کی پتلون بھی اس پر چھوٹی پڑ رہی تھی جبکہ یہی صورتحال قمیض کے ساتھ تھی۔ گاؤں کے موٹے سے موٹے شخص کی قمیض اس پر تنگ تھی۔ بڑے سے بڑے جوتے بھی اسے نہیں آتے تھے۔ اس کی غیر معمولی جسامت سے متاثر ہو کر گاؤں کی عورتوں نے کشتی کے بادبان سے اس کی پتلون اور دلہن کے حجاب سے قمیض تیار کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ جس وقار کے ساتھ اس نے اپنی موت کو قبول کیا ہے وہ موت کے اگلے مرحلے میں برقرار رہے۔ وہ ایک دائرے کی شکل میں لاش کے گرد بیٹھی اس کے کپڑے سی رہی تھیں اور وقتاً فوقتاً لاش پر ایک نظر ڈال لیتی تھیں۔ اس وقت انہیں یوں لگا کہ ہوا کی رفتار مدھم ہو گئی ہے اور سمندر بے چین ہو گیا ہے۔ ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ انہوں نے سوچا

کہ یہ تبدیلی اس مردہ شخص کی وجہ سے آئی ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر یہ شاندار آدمی اس گاؤں کا رہنے والا ہوتا تو اس کے گھر کے دروازے چوڑے، چھت اونچی اور فرش مضبوط ترین ہوتا۔ اس کی مسہری جہاز کے وسطی حصّے کی لکڑی کی بنی ہوتی جبکہ مسہری کا سرہانہ فولادی پٹیوں اور پیچوں سے جوڑا گیا ہوتا۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ پرمسرت زندگی گزار رہی ہوتی۔ ان کا خیال تھا کہ دونوں شوہر اور بیوی کے پاس اتنے اختیارات ہوتے کہ مچھلی پکڑنا ہوتی تو وہ مچھلیوں کو ان کے ناموں سے پکار لیتا تو وہ خود لپکتی ہوئی آ جاتیں۔ متوفی خود اتنا طاقتور تھا کہ اپنی زمین پر کاشت کرتا تو پہاڑوں سے چشمے پھوٹ پڑتے اور وہ پہاڑوں کو گلزار بنا دیتا۔ دل ہی دل میں وہ سامنے پڑی لاش کا موازنہ اپنے شوہروں کی کارکردگی سے کرتیں۔ ان کا خیال ہوتا کہ ایک رات میں یہ شخص اتنا کام کر لیتا کہ ہمارے شوہر زندگی بھر نہ کر پاتے۔ آخر کار ان کی سوچ اس نتیجے پر ختم ہوتی کہ ان کے شوہر کمزور ترین، کمینے ترین اور بے کار ترین مخلوق ثابت ہوتے۔

تمام عورتیں اپنے خیالات میں غرق تھیں کہ ان میں سے وہ عورت جو عمر میں سب سے بڑی تھی، غرض مرنے والے شخص کی لاش کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی: ''اس کا چہرہ بالکل ایستبان (Esteban) کے چہرے جیسا ہے۔''

وہ بالکل صحیح کہہ رہی تھی۔ ان سبھوں نے ایک بار پھر لاش کے چہرے کو ایک نظر دیکھا۔ اس شخص کا کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ان عورتوں میں جو سب سے زیادہ ضدی تھیں وہی سب سے کم عمر بھی تھیں۔ وہ ابھی تک بلکہ مزید کچھ دیر تک اس خوش فہمی میں تھیں کہ متوفی کو جب نئے کپڑے اور نئے چرمی جوتے پہنا کر اس قبر میں لٹایا جائے گا تو اس کا نام ''لوٹارو'' (Lautaro) ہی ہو گا۔ لیکن ان کا تاثر غلط تھا۔ اس سے ان کا غرور جھلکتا تھا۔ پتلون کے لیے کاٹے جانے والے بادبان کا کپڑا ''کینوس'' (Canvas) ناکافی تھا۔ کپڑا صحیح طریقے سے نہیں کاٹا گیا تھا اور اس کی سلائی بھی بہت بری تھی۔ متوفی کے لیے تیار کی جانے والی پتلون بے حد تنگ تھی۔ آنجہانی کے دل کی پوشیدہ قوت اتنی زیادہ تھی کہ اسے پہنائی گئی قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے۔ نصف شب کے بعد چیختی چنگھاڑتی ہوا ٹھنڈی پڑ گئی اور سمندر اسی طرح اونگھنے لگا جیسے وہ بدھ کی دوپہروں کو اونگھا کرتا ہے۔ جو خاموشی چھائی اس نے ان شکوک وشبہات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا کہ ڈوبنے والے کا نام کچھ اور نہیں ایستبان (Esteban) ہی تھا۔ جس عورت نے اسے کپڑے پہنائے تھے جس نے اس کے بالوں میں کنگھی کی تھی، جس نے اس کے ناخن کترے تھے، جس نے اس کی شیو کی تھی، اپنی مایوسی سے بھری جھرجھری روک نہ سکی تھی کیونکہ اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے انہیں لاش کو گھسیٹ کر لے جانا پڑا تھا۔ اس وقت انہیں یہ دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ متوفی کو اس کی دیوہیکل جسامت کتنا ناخوش رکھتی ہو گی کیونکہ موت کے بعد بھی اس کی جسامت نے اسے پریشان کیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسے اپنے تصور کی نگاہ سے زندہ دیکھ رہے تھے۔ ساری زندگی وہ دروازوں میں سے ترچھا ہو کر گزرا کرتا تھا۔ یہ اس کی سزا تھی۔ چھت کی شہتیر سے اس کی کھوپڑی اکثر ٹکرا جاتی تھی۔ کہیں جاتا تو عموماً اپنے پیروں پر ہی کھڑا رہتا۔ کھڑے کھڑے اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اپنے گلابی سمندری شیر کی رنگت کے ہاتھوں کو کہاں رکھے جبکہ خاتون خانہ دوڑ کر اس کے بیٹھنے کے لیے گھر کی مضبوط ترین کرسی تلاش کر لاتی۔ پھر وہ اس سے درخواست کرتی ''ایستبان (Esteban) اس کرسی پر بیٹھو!'' اور وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہی رہتا۔

''پریشان نہ ہوں خاتون۔ میں جہاں ہوں، ٹھیک ہوں۔'' وہ کہتا حالانکہ ساری زندگی اسی طرح کھڑے رہنے سے اس کی ایڑھیاں جلنے لگتیں اور پشت دکھنے لگتی۔ وہ جہاں جاتا اسے یہی کہنا پڑتا: ''کوئی مسئلہ نہیں خاتون۔ میں جہاں ہوں، ٹھیک ہوں۔'' حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ کرسی توڑ بیٹھنے کی شرمندگی سے بچنا چاہتا تھا۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ زندگی میں نہ معلوم کتنی خواتین نے اس سے ''ابھی نہ جاؤ ایستبان! کم از کم کافی تو پیتے جاؤ!'' کہا ہو گا۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ وہی خواتین تھیں جنہوں نے بعد میں کہا ہو گا ''چلو اچھا ہی ہوا لم ڈھینگ چلا گیا۔ خوبرو بے وقوف کہیں کا!''

بعد میں اس کے چہرے کو سورج کی روشنی سے بچانے کے لیے جب منہ پر رومال باندھا گیا تو دیکھنے والوں کو لگا کہ جیسے وہ ہمیشہ سے مردہ تھا۔ بے ضرر اور تنہا، جیسے ان کے اپنے مرد تھے جو اس وقت دل کھول کر رو رہے تھے۔ رونے کا آغاز نوجوان مردوں نے کیا تھا جبکہ دیگر مرد پہلے تو ٹھنڈی سانسیں اور آہیں بھرتے رہے اور پھر آخر میں دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ سبکیوں اور سسکیوں کے ساتھ انہیں مزید رونا آ رہا تھا۔ وہ جتنا روتے تھے اتنا انہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ غرق ہونے والا پرامن شخص ہی ایستبان ہے۔ وہ اس لیے بھی اس کے لیے رو رہے تھے کہ ان کی نظر میں وہ کرّہ ارض کا واحد تنہا بے یارومددگار آدمی تھا جو سب کی خوشی میں اپنی خوشی دیکھتا تھا۔ بے چارا ایستبان!

چنانچہ جب تمام مرد پڑوس کے گاؤں دیہات سے لوٹ کر آئے تو ان کے پاس خبر یہ تھی کہ غرق شدہ یہ انسان ادھر کے کسی گاؤں کا نہیں۔ اس خبر نے عورتوں کو آنسوؤں کے درمیان خوشی کی ایک جھلک دکھا دی تھی۔ ''یا خدا تیرا شکر ہے!'' انہوں نے ایک آہ کے ساتھ کہا ''تو یہ ہمارا ہی ہے!!''

پڑوس کے گاؤں سے واپس آنے والے مردوں نے عورتوں کے رونے دھونے کو صنف نازک کی فطری فضول عادتوں میں سے ایک عادت قرار دیا۔ گاؤں گاؤں جانے اور اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی رات کی مشقت نے انہیں تھکا دیا تھا۔ اب ان کی خواہش تھی کہ جلد از جلد نووارد کو آج ہی کے حبس زدہ لیکن تیز دھوپ والے دن میں سپرد خاک کر دیں۔

انہوں نے چند تختے جوڑ کر اس پر کشتیوں کے مستر دکھمبے لگا کر اسے اتنا مضبوط بنا دیا کہ اس کا وزن سہار سکے۔ وہ ڈوبنے والے شخص کی لاش کو اس

تختے پر ڈال کر، تختے کو کھینچتے ہوئے پہاڑی تک لے جانا چاہتے تھے جہاں سے تختے کو دھکیل کر سمندر برد کر دیا جاتا۔ وہ تختے سے مال بردار جہاز کا لنگر بھی باندھ دینا چاہتے تھے تا کہ جب اسے پہاڑی سے لڑھکایا جائے تو تختہ لاش سمیت ڈوب جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ سمندر کے اس حصّے کی لہریں گہرائی میں حرکت کرتی ہیں۔ اس حصّے میں مچھلیاں نابینا ہوتی ہیں اور وہاں گہرے سمندر میں چھلانگ لگانے والے پیراک مالیخولیا کے مرض میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہاں ڈوبنے والوں کی لاشیں ساحل کی طرف کبھی واپس نہیں آتیں۔
مگر مشکل یہ تھی کہ مرد جتنی جلدی یہ کام کرنا چاہتے تھے عورتیں اس میں رخنہ اندازی کر رہی تھیں۔ وہ پریشان مرغیوں کی طرح اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ کبھی کوئی عورت بہتر موسم کی دعا کا تعویذ ڈوبنے والے شخص کے کپڑوں میں ٹانکنا چاہتی تھی تو کوئی اور عورت ڈوبنے والے کی لاش کی کلائی پر قطب نما باندھنے کی خواہشمند ہوتی۔ مرد چیخ چیخ کر انہیں لاش کے پاس سے ہٹاتے ''او عورت وہاں سے ہٹ جا!''۔ ''اے عورت تو ہمارے راستے میں آ رہی ہے''۔ ''راستہ چھوڑ۔ دیکھ تیری وجہ سے میں ابھی لاش پر گر پڑتا۔'' غرض صورتحال اتنی خراب ہو گئی کہ مردوں کا اپنے جگر پر اعتماد جاتا رہا تھا۔ انہوں نے بڑبڑانا شروع کیا کہ آخر یہ عورتیں چاہتی کیا ہیں؟ لاش پر گرجا گھر سے لائی گئی اتنی اشیاء نچھاور کی گئی تھیں کہ مرد یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ایک اجنبی لاش پر عورتیں اتنی مہربان کیوں ہیں؟ اور پھر ان عورتوں کی بھی کمی نہیں تھی جو پڑھا ہوا روحانی پانی کا چھڑکاؤ لاش پر کرنا چاہتی تھیں۔ کچھ عورتوں نے پادری کی پڑھی ہوئی لوہے کی میخیں ٹھونکنے پر اکتفا کی تھی۔ مردوں کا کہنا تھا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کتنے بالٹی روحانی پانی لاش پر انڈیلا گیا ہے اور کتنی پڑھی ہوئی میخیں لاش کے ارد گرد ٹھوکی گئی ہیں۔ بالآخر لاش کی قسمت میں شارک مچھلیوں کی خوراک بننا ہی ٹھہرا ہے۔ لیکن عورتیں تھیں کہ چرچ سے لائی گئی الابلا چیزیں لاش کی نذر کر رہی تھیں۔ گرتی پڑتی، ٹھوکریں کھاتی ہوئی آتیں اور ٹھنڈی سانس کے ساتھ روحانی اشیاء لاش کے ارد گرد رکھ دیتیں۔ بے شک ان کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوتے لیکن ان کو سرد آہیں بھرتے تو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آخر کار تھک ہار کر مردوں نے غصّے میں چنگھاڑتے ہوئے کہا کہ ایک اجنبی کی لاش کے ساتھ اتنے نخرے تو ہم نے کبھی نہیں دیکھے اور لاش بھی سڑی بسی، پچھلے بدھ کے ٹھنڈے گوشت جیسی!
ایک عورت نے مردوں کی ڈوبنے والے شخص کی لاش کے ساتھ بے اعتنائی کا مظاہرہ دیکھا تو خوفزدہ ہو کر لاش کے منہ پر باندھا رومال کھول کر نکال دیا۔ اس عمل کے بعد لاش کا چہرہ دیکھتے ہی وہاں موجود مرد اور عورتیں حواس باختہ ہو گئے وہ تو واقعی ایستبان تھا۔ اب یہ کہنا قطعی ضروری نہیں ہے کہ وہاں موجود مردوں اور عورتوں نے اسے نہیں پہچانا۔ اگر انہیں بتایا جاتا کہ یہ سر والٹر ریلی (Sir Walter Raleigh) کی لاش ہے تو وہ اسی طرح متاثر ہو جاتے اور یقین کر لیتے اور تصور میں اس کے کندھے پر طوطا بھی بیٹھا دیکھ لیتے۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ دنیا میں ایک ہی ایستبان تھا جو اس وقت پھٹے جوڑ کر بنائے گئے تختے پر وہیل مچھلی کی طرح پڑا تھا۔ نہ اس کے پیروں میں جوتے تھے اور نہ ہی اس کی قمیض اور پتلون اس کی جسامت کے مطابق تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ لاش کے ناخن چھری سے کاٹے گئے ہیں۔
ڈوبنے والے اجنبی کی لاش کے چہرے سے رومال ہٹانے کی دیر تھی کہ دیکھنے والوں کو احساس ہو گیا کہ متوفی شرمندہ تھا۔ وہ شرمسار اس لیے تھا کہ اس کی جسامت اتنی زیادہ تھی کہ وہ اتنا زیادہ بھاری تھا یا وہ اتنا خوبرو تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کا اس طرح تماشا بنایا جائے گا تو وہ کسی ایسی جگہ جا کر ڈوب مرتا جو ذرا پوشیدہ ہوتی بلکہ اس کی جگہ اگر میں ہوتا تو اپنی گردن میں لنگر ڈال کر سمندر کے کنارے واقع کسی اونچی سی پہاڑی سے چھلانگ لگاتا۔ مجھے یقین ہے کہ ہر وہ انسان جو لوگوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا، اور اپنی بدھوار کے دن مرنے والے کے تن و توش کو چھپانا چاہتا ہو وہ یہی کچھ کرتا۔ ڈوبنے والے کے طور طریقے سے بہت کچھ ظاہر ہو گیا تھا حتیٰ کہ وہ مرد بھی جو راتوں کو مچھلیاں پکڑنے نکلتے ہیں اور اپنی بیویوں کی طرف سے شک و شبہے میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں وہ بھی اپنے مردوں کی سمندر میں گزاری طویل راتوں کی تلخیوں کو فراموش کرنے کے لیے ڈوب کر مرنے والوں کے خواب نہ دیکھنے لگ جائیں۔ لیکن ایستبان کی نیت کے خلوص پر شک کرنے کی نہ ان کے پاس کوئی وجہ تھی اور نہ دوسرے مردوں کے پاس اس جھرجھری کو روکنے کا کوئی طریقہ تھا جو انہیں ان کی ہڈیوں کے گودے تک ہلا دیتا تھا۔
چنانچہ یہی وہ چند وجوہ تھیں جن کے سبب ایک اجنبی ڈوبنے والے کو اتنی شان و شوکت کے ساتھ سپردِ سمندر کیا گیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک فراموش شدہ غرق آب نا معلوم شخص کو اتنا شاندار جنازہ ملے گا۔ کچھ عورتیں جو پڑوس کے گاؤں میں جنازے میں استعمال کرنے کے لیے پھول خریدنے گئی تھیں اس گاؤں کی متعدد عورتوں کو ساتھ لے آئی تھیں کیونکہ جو کچھ انہیں بتایا گیا تھا اس پر وہ یقین نہیں کر رہی تھیں۔ جب ان عورتوں نے متوفی کی لاش دیکھی تو مزید پھول لانے کے لیے اپنے گاؤں گئیں۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے لاش پر اتنے پھول ڈالے گئے کہ لاش چھپ ہی گئی اور پھول لانے والے بھی اتنے لوگ ہو گئے کہ لوگ لاش کے قریب سے گزر بھی نہ سکتے تھے۔ جب جنازہ جلوس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا تو منتظمین کو افسوس ہو رہا تھا کہ وہ ڈوبنے والے اجنبی کو ایک بار پھر لاوارث کی طرح سمندر کے سپرد کرنے جا رہے ہیں۔ لہٰذا جلوس میں شامل نمایاں افراد میں سے ایک مرد اور ایک عورت کو متوفی کے ماں باپ کے طور پر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد کچھ اور لوگوں نے اپنے آپ کو اس کے چچا، چچی، تایا، تائی، ماموں، ممانی، خالائیں اور خالو کے طور پر اور کچھ نوجوانوں نے خود کو اس کے کزنوں کے طور پر پیش کیا تا کہ مرنے والے کے ذریعے گاؤں کے تمام باشندے اس کے رشتہ دار بن جائیں۔
کچھ ملاحوں نے جن کا بحری جہاز قریب سے گزر رہا تھا عورتوں کا

بین سن کر تھوڑی دیر کے لیے یہ حقیقت فراموش کر بیٹھے کہ ان کا جہاز بھٹک گیا ہے۔ادھر ساحل پر جمع لوگوں کو بتایا گیا کہ بین سن کر ایک ملاح نے خود کو جہاز کے مرکزی کھمبے سے باندھ لیا تھا کیونکہ بعض پرانے قصّوں میں اس نے سن رکھا تھا کہ خطرے کا بین سن کر یہ کرنے سے خطرہ ٹل جاتا ہے۔اور پھر وہ اپنا جہاز ساحل کے قریب لنگر انداز کر کے جنازے کے جلوس میں شریک ہوئے اور جلوس کے منتظمین سے درخواست کی کہ انہیں متوفی کی لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر چڑھائی پر پہنچانے کا اعزاز بخشا جائے۔تب جلوس کے شرکاء کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کے گاؤں کی گلیاں کتنی ویران ہیں، ان کے مکانوں کے صحن کتنے خشک ہیں اور ان کے خواب کتنے پتلے ہیں۔ دراصل اس وقت وہ ڈوبنے والے شخص کی وجاہت اور خوبصورتی سے گاؤں کا موازنہ کر رہے تھے۔ چنانچہ اوپر پہنچنے کے بعد متوفی کی گردن میں نہ لنگر ڈالا گیا اور نہ اس کے پیروں سے کوئی بھاری چیز باندھی گئی۔ پہاڑی کی چوٹی سے اسے آہستہ سے سمندر کی طرف دھکا دے دیا گیا تا کہ جب وہ مناسب سمجھے اور خواہش کرے تو واپس آ سکے۔

جب لاش کو دھکا دیا جا رہا تھا تو جنازے کے شرکاء نے کئی صدیوں کے ایک حصّے کے دوران سانس لینا بند کر دیا تھا۔مقصد یہ تھا کہ لاش کو سمندر تک پہنچنے کی مہلت مل جائے۔انہیں یہ معلوم کرنے کے لیے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس وقت جلوس میں کون موجود ہے اور کون نہیں۔وہ جانتے تھے کہ اب کبھی سارے اکٹھے نہیں ہوں گے لیکن وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ آج کے بعد ان کے گھروں کے دروازے لمبے اور چوڑے اور چھتیں اونچی اور فرش مضبوط ہوا کریں گے۔انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ آج کے بعد ہر چیز مختلف ہو گی تا کہ ایستبان کی یاد چھتوں سے نہ ٹکرائے۔دروازوں میں سے آسانی سے گزر سکے اور مستقبل میں کسی کو یہ کہنے کا حوصلہ ہو کہ وہ خوش شکل اور بھاری بھر کم احمق بالآخر مر گیا ہے۔وہ جانتے تھے کہ اب ان کے گھروں کے سامنے والے حصّوں کو مختلف رنگوں سے خوشنما بنایا جائے گا تا کہ ایستبان کی یاد تا ابد قائم رہے۔ اس کے لیے وہ کمر توڑ محنت کرنے کے لیے تیار تھے۔وہ سنگلاخ پہاڑیوں کو کھود کر چشمے نکالنا اور پہاڑیوں کو پھولوں کے پودوں سے مزین کرنا چاہتے تھے تا کہ مستقبل میں ان کے گاؤں کے قریب سے کوئی بحری جہاز گزرے تو علی الصبح اس کے مسافر جاگ اٹھیں کیونکہ پھولوں کی خوشبو ان کو جگا دے اور جہاز کا کپتان اس خوشبو سے مجبور ہو کر جہاز سے اتر کر گاؤں میں آئے۔تب وہ اپنے پورے یونیفارم میں ہو، اس کے سینے پر تمغے قطار در قطار سجے ہوں، افق سے گلاب کی مہک اسے مدعو کر رہی ہو اور وہ چودہ مختلف زبانوں میں اعلان کر رہا ہو کہ ادھر دیکھو۔وہاں ہوا اتنی پُرسکون ہے کہ گلاب کے تختوں کے درمیان سو گئی ہے۔ادھر دیکھو، وہاں دھوپ اتنی تیز ہے کہ سورج مکھی کے پھولوں کو سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنا رخ کدھر کریں۔ہاں اُدھر، وہ ہی تو ایستبان کا گاؤں ہے۔

بقیہ : تنقید کا کردار

ہے۔ایسا سمجھنے والے فکشن کی حقیقت کو پا ہی نہیں سکتے جس میں زماں اور مکاں دونوں کو از سرِ نو ترتیب دے کر ایک نئی حقیقت ممکن بنا لی جاتی ہے۔ برتی ہوئی گدلی حقیقت سے زیادہ یقینی اور تابناک اور بامعنی حقیقت۔

ب۔ فکشن نگار ہمیشہ خیر کے عمل سے جڑا ہوا ہوتا ہے اور جہاں جہاں اسٹیٹس کو اس عمل خیر میں مزاحم ہوتا ہے وہ وہاں وہاں بغاوت کر کے نئی اخلاقیات مرتب کرتا ہے۔ یہ فکر کی زمین پر نہیں بلکہ احساس کی زمین پر قدم جماتا ہے یہی سبب ہے کہ یہ علاقائی اور زمانی سرحدوں کو پھاند کر خیر کے آفاق کی سمت جست لگاتا رہتا ہے۔ایسا کن قرینوں سے اور کہاں کہاں ممکن ہوا ہے تنقید کو اسے نشان زد کر کے تفہیم کے دریچے وا کرنا ہوتے ہیں۔

ج۔ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ فکشن محض گزرے واقعات کی روداد ہوتی ہے نہ حال کا روزنامچہ کہ اِس کی جست ماضی کی جانب ہوتی ہے اور مستقبل کی طرف بھی۔ماضی میں اِس لیے کہ وہاں سے اِجتماعی لاشعور کی تہذیبی بازیافت ہوتی ہے اور مستقبل میں یوں کہ وہ اُمید کے نور پانیوں سے کناروں تک بھرا ہوا ہوتا ہے۔تنقید کو جہاں اُن سرچشموں کا سراغ لگانا ہوتا ہے جہاں سے فکشن نے اِکتساب کیا، اُن جہتوں کو بھی نشان زد کرنا اسی کا وظیفہ ہے جہاں سے نئی معنویت کا استقبال ممکن ہو پاتا ہے۔

د۔ یہ بھی آنکنا ہو گا کہ فکشن محض لسانی ترتیب ہے نہ تیکنیکی ساخت، پلاٹ، کردار، مکالمہ، تناظر، رمزیت ایمائیت انہیں سمجھے بغیر فکشن پارے کو ڈھنگ سے سمجھنا ممکن نہیں۔کہاں کون سی تیکنیک برتی گئی ہے، بیانیہ کن اجزا سے متشکل ہوا ہے، کہاں کہانی نے پلٹا کھایا ہے، شعور کی رو، خود کلامی، فلیش بیک، مکالمے، کولاژ، ڈرامہ، خبر کیا کچھ کہانی میں منقلب ہوا اور کیوں اور اس سے فن پارے کی کُل سے کیا معنویت برآمد ہوتی ہے۔

آج کا فکشن محض کہانی سماعی روایت کا زائدہ نہیں ہے یہ مواد اور تیکنیک کے اعتبار سے بہت پیچیدہ ہے اور اپنے ظاہری اسٹرکچر کے اندر ایک اور معنیاتی اسٹرکچر کی تعمیر کرتا ہے اسے محض موضوعات قائم کر کے اور ان موضوعات کی ذیل میں رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے نہ محض زمانی دہائیوں کی تقسیم کے اندر رکھ کر۔اردو تنقید کو اس باب میں زیادہ یکسوئی سے اور اُن سارے حیلوں کو برت کر تفہیم ممکن بنانا ہو گی جن سے آج کے انسان کی اپنی حسیات مرتب ہو رہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں ابھی بہت سا کام ہونا باقی ہے۔

اُفق سے اُترا چاند

رینو بہل
(چنڈی گڑھ)

روح پہ چھالے، ذہن تپیدہ، جسم پہ زخموں کی پوشاک
تم کیا جانو، آگ کا دریا، ہم نے کیسے پار کیا

اس شعر میں حاصلِ زیست کا نقشہ مشہور اور معروف شاعر، نفیس اور پُرخلوص شخصیت کے مالک جناب مہندر پرتاپ چاند نے کھینچا ہے۔ اس شعر سے میرا تعارف چاند صاحب سے تعارف سے پہلے ہوا تھا۔ اُن کا کلام اکثر رسائل میں دیکھتی تو شوق سے پڑھتی۔ چاند صاحب سے پہلی ملاقات جناب شباب للت صاحب نے کروائی۔ انہوں نے شملہ سے مجھے فون کر کے بتایا کہ سرائیکی کا ایک مشاعرہ چنڈی گڑھ میں منعقد کیا جا رہا ہے اور چاند صاحب اُس مشاعرے میں شرکت کر رہے ہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو اُن سے مل آنا۔ شباب صاحب اور چاند صاحب کے دیرینہ اور قریبی مراسم تھے۔ کئی مرتبہ وہ چاند صاحب سے میری نسبت بات کر چکے تھے۔ سنہرا موقعہ ہاتھ لگا تھا چاند صاحب سے ملنے کا وہ بھلا میں کیسے جانے دیتی۔ میرے ادبی سفر کا وہ ابتدائی دور تھا۔ سردیوں کی دوپہر میں پنجاب کلا بھون میں سرائیکی کا مشاعرہ چل رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے سرائیکی زبان میں مشاعرہ سُنا۔ اس زبان میں عجیب سی کشش تھی، شیریں زبان اور شعراء کا خوبصورت لہجہ، اندازِ بیاں نے بھی بہت لطف دیا۔

مشاعرہ ختم ہوا تو چاند صاحب سے ملنے پہنچ گئی۔ شباب صاحب کا حوالہ دے کر تعارف کرایا تو وہ بڑے تپاک اور اپنائیت سے ملے۔ اُن سے مل کر لگا ہی نہیں کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ ملاقات مختصر ضرور تھی مگر پہلی ہی ملاقات میں رشتوں کی بنیاد گہری پڑ گئی تھی۔ وقت کے ساتھ رشتے قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔

مجھے آج بھی یاد ہے وہ شام جب شباب صاحب نے فون کر کے چاند صاب سے ملاقات کے متعلق پوچھا:

''ملاقات ہوگئی چاند سے؟ ہے نہ اُفق سے اُترا چاند''

اب اُفق کے چاند سے اُن کی کیا مراد تھی، یہ خود اُن کے بیان سے جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے:

''متبسم لب، گھنے کالے بال، بڑی بڑی نکتہ رس آنکھیں، گول مٹول چہرے پر لبوتری اونچی ناک، پنجابی نین نقش، صبیح رخسار ایسے کہ دیکھ کر کشمیری سیبوں کی یاد آئے۔ کلین شیو وجیہہ چہرے اور قابلِ رشک صحت والے مہندر پرتاپ چاند''

چاند صاحب جاذبِ نظر، پُرخلوص اور مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں۔ بیگانوں کو بہت جلد اپنا گرویدا بنا لیتے ہیں۔ ملنسار کے ساتھ ساتھ خوش اسلوب بھی ہیں۔ اپنی مقناطیسی خوبی کے بارے انہیں خود بھی اندازہ ہے۔ ایک مرتبہ خود انہوں نے گفتگو کے دوران اعتراف کیا تھا کہ میں نے آج تک کبھی کسی کو بڑھ کر اپنی چاہت کا اظہار نہیں کیا مگر جس کی خواہش دل سے کی وہ خود بخود اُن کی قسمت میں آ گیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی طبیعت میں خود پرستی کے عناصر شامل ہیں۔

مہندر پرتاپ چاند کا جنم یکم اگست ۱۹۳۵ء کو سوبھراج نارنگ اور دیاونتی کے گھر کروڑ لعل عیسن (ضلع مظفر گڑھ) حال ضلع لیہ پاکستان میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم کلورکوٹ (ضلع میانوالی، پاکستان) میں حاصل کی۔ تقسیم وطن کے بعد وہ زیرہ (ضلع فیروز پور) پنجاب میں آ کر بس گئے۔ ملک کی تقسیم کا سانحہ کم سن لڑکے کے معصوم دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے اپنے نقش چھوڑ گیا۔ اپنی جائے پیدائش سے بچھڑنے کا غم آج تک ٹیس بن کر اُن کے سینے میں چبھتا ہے اور یہ ہی درد یہ ہی ٹیس شاعری میں کبھی غزل کبھی نظم بن کر سامنے آتی ہے۔

تقسیم ملک کے وقت اُن کی عمر بارہ سال کی تھی۔ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے علاقے کے نیک سیرت مسلم تھانیدار اور دوسرے مسلم بھائیوں نے غیر مسلم لوگوں کو بلوائیوں سے بچائے رکھا۔ بھائی چارے اور ہمدردی کے جذبے سے پُر تھے وہ لوگ۔ بڑی حفاظت سے انہیں وہاں سے رخصت کیا مگر راستے میں ریل کے سفر کے دوران کچھ ایسے دل خراش واقعات ضرور دیکھنے کو ملے جن کے نقش آج بھی تازہ ہیں۔

۱۹۵۱ء میں لمبی (ضلع فیروز پور) سے میٹرک پاس کر کے ڈی اے وی کالج جالندھر میں داخلہ لے لیا۔ اُس وقت جالندھر ادب اور صحافت کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ نامی گرامی شعرا کو ملنے اور سُننے کا اتفاق ہوا۔ اس ادبی ماحول نے اُن کے تخلیقی شعور کو جلا بخشی۔ کالج کے دوران لکھی گئیں غزلیں اور نظمیں اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ وہیں سے مقامی مشاعروں میں شرکت کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

شاعری کا شوق اُن کو بچپن میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ جب وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے تو اُن کے استاد محترم بشیر افغانی صاحب خود ایک معروف شاعر تھے اور اکثر کلاس میں بیت بازی کا مقابلہ کرایا کرتے یہیں سے شعر و شاعری کی محبت کا بیج پڑا۔ باقاعدہ شعر لکھنے کا آغاز تقسیم وطن کے بعد شروع ہوا۔ بچپن میں اُن کا دوست مہیش ہوا کرتا تھا۔ دونوں میں بہت گہری دوستی ہوگئی۔ اکثر سارا سارا دن وہ ساتھ ہی گزارتے۔ ایک روز اُس کے والد کا تبادلہ ہو گیا اور وہ اپنے والد کے ساتھ شہر چھوڑ کر چلا گیا۔ اُس سے بچھڑنے کا چاند صاحب کو اتنا دکھ ہوا کہ پرانے بچھڑے دوستوں کے زخم پھر تازہ ہو گئے۔ اُس وقت اُن کی عمر تیرہ سال ہوگی۔ مہیش کے جانے کے بعد خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور دل پر چھائے غبار کو ہٹانے کے لیے کاغذ قلم پکڑ لیا۔ پہلے دو اشعار جو وجود میں آئے وہ یہ ہیں:

چھوڑ کر مجھ کو اکیلا جا بسا ہے تو کہاں
کس نگر کی اب ہوائیں راس تجھ کو آ گئیں؟
فاصلوں نے تجھ کو کتنا دور مجھ سے کر دیا
دید کو ترسی ہوئی آنکھیں بھی اب پتھرا گئیں!

یہ تیرہ سال کے معصوم دل سے نکلے جذبات تھے جس میں پیار کی سچائی اور دوست سے بچھڑنے کا درد سمویا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

تعلیم کے ساتھ ادبی سفر بھی جاری رہا۔ ۱۹۵۹ء میں نرملا جی کے ساتھ شادی کے پوتر بندھن میں بندھ گئے۔ اس وقت چاند صاحب لدھیانہ میں بینک میں ملازم تھے اور نرملا جی سکول میں پڑھاتی تھیں۔ انہوں نے اپنے والد کی علالت کی وجہ سے بی اے پرائیویٹ ہی کیا تھا۔ دونوں نے شادی کے بعد اپنی تعلیم میں اضافہ کرنے کی سوچی لہٰذا دونوں نے نوکری اور گھر گرہستی کی ذمہ داری کے ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ شادی کے ایک سال بعد سنگیتا اُن کی گود میں تھی۔ چار سال بعد وویک اور اُس کے ایک سال بعد منوج نے اُن دونوں کی گرہستی مکمل کر دی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ نوکری پڑھائی اور بچوں کی پرورش تینوں کام دونوں نے دس سال تک مل کر بخوبی انجام دیئے۔ چاند صاحب نے ایم اے اردو، ایم اے لائبریری سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ نرملا جی نے ایم اے، ایم ٹی اور ایم ایڈ کی ڈگری اول درجے میں پاس کی۔ چاند صاحب کو کورکیشتر یونیورسٹی میں ملازمت ملی تو انہوں نے لدھیانہ بینک کی نوکری چھوڑ دی۔ نرملا جی نے بھی درخواست دے کر اپنا تبادلہ کروکیشتر کرا لیا۔ شادی کے بعد دوبار ضلع تبدیل کروانے کی وجہ سے انہیں Seniority کی قربانی دینی پڑی جو انہوں نے اپنی گھر گرہستی پر قربان کر دی۔ دونوں میں قدم سے قدم ملا کر چلنے کا حوصلہ تھا اس لیے راستوں کی دُشواریاں ایک دوسرے کے سہارے مٹتی گئیں۔ اچھی نوکری، تعلیم یافتہ نیک بیوی، فرمابردار اولاد جن کی قسمت میں ہو اس سے زیادہ خوشحال، خوش نصیب بھلا کون ہوسکتا ہے؟

پھر ایک روز اچانک چاند صاحب کی ہنستی کھیلتی زندگی میں طوفان آ گیا۔ نہ جانے کس کی نظر اُن کے جوان بیٹے کو کھا گئی۔ ۲۷۔ مئی ۱۹۹۷ء کو وویک سڑک حادثہ کا شکار ہو کر تمام عمر کے لیے والدین کو کبھی نہ بھرنے والا زخم دے گیا۔ اپنے پیچھے چھوڑ گیا دو معصوم بچے، ایک جوان بیوہ اور دو بزرگ والدین۔ رب کے حکم کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی تو نہیں۔

وویک کی یاد میں اُس کے دونوں بچوں کے نام بہ عنوان نظم ''ننھے فرشتے'' میں جو پیغام دیا ہے اُس کی ایک جھلک آپ کے لیے:

ظلمتِ غم میں نور بار ہو تم!
میرے بیٹے کی یادگار ہو تم!
وقت نے ہم پہ کیا ستم ڈھایا!
چھین گیا تم سے باپ کا سایا
کس قدر نیک تھا تمہارا باپ
لاکھوں میں ایک تھا تمہارا باپ
صاف دل صاف گو حسین اطوار
خوش ادا، خوش کلام خوش گفتار
دیوتا تھا وہ جانِ محبوبی
موت اُس کی تمہیں بھی لے ڈوبی!

جوان بیٹے کا غم ماں کو دیمک کی طرح چاٹتا رہا۔ ایک دن تھک ہار کر وہ بھی ابدی نیند سوگئی۔ پچاس سال کا ساتھ ایک پل میں چھوٹ گیا۔ چاند صاحب کے لیے یہ جھٹکا سہنا آسان نہیں تھا مگر انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا بڑی ہمت سے غم سے جوجھتے رہے اور اپنے دل کے غبار کو کاغذ پر اُتار کر جینے کا حوصلہ بٹورتے رہے۔

نظم بہ عنوان ''رفیقہ حیات کی مرگ ناگہاں پر'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

پلک جھپکتے ہی تو نے جو موندیں آنکھیں
کسے خبر تھی کبھی اب یہ کھل نہ پائیں گی!
مری صدائیں مری آہیں، میری فریادیں
فلک کو چھو کے بھی ناکام لوٹ آئیں گی!
جوان بیٹے کی بے وقت موت نے تجھ کو
دیے وہ زخم کہ جو تاحیات بھر نہ سکے
میں جانتا ہوں یہی جاں گداز گھاؤ تجھے
مآلِ کار بہت دور لے گئے مجھ سے

پورا پریوار تنکے کی طرح بکھر گیا۔ سب کے ہوتے ہوئے وہ تنہا ہو گئے۔ چھوٹا بیٹا منوج امریکہ میں اپنے پریوار کے ساتھ رہتا ہے مگر سنگیتا کا گھر اُن کے گھر کے بالکل قریب ہے۔ مقامی کالج میں انگریزی کی پروفیسر ہے اور داماد ڈاکٹر ہے۔ سنگیتا ایک اچھی بیوی، ذمہ دار ماں ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی شفیق اور نیک بیٹی بھی ہے۔ بیٹی چاہے کہیں بھی چلی جائے کتنی ہی عمر کی کیوں نہ ہو جائے مگر رہتی وہ ہمیشہ بیٹی ہی ہے۔ چاند صاحب کا ایک شعر بہت یاد آ رہا ہے:

''جھانک کر دیکھا جو ماضی کے دریچوں میں کبھی
دشتِ تنہائی میں کوئی بھی یگانہ نہ ملا''

چاند صاحب کو رشتوں کی اہمیت کا پتا ہے اور رشتے نبھانا انہیں خوب آتا ہے۔ اس کی مثال اُن کے استاد سے جو مراسم تھے اس سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے استادِ محترم امر چند قیس جالندھری سے شاعری کی باریکیاں سیکھیں۔ قیس جالندھری کا شمار صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے شاعری کی تمام اصناف میں نئے تجربات کیے۔ مختلف مذاہب کی الہامی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اگر فلسفہ گیتا کو نظم کیا تو دوسری طرف کربلا کے واقعات کو بھی بڑی

ہنر مندی سے نظم کیا۔اگر انہوں نے بے شمار بھجن، گیت اور غزلیں تحریر کیں تو نعتیں، مثنویاں بھی اُسی ہنر مندی سے لکھیں۔جس طرح چاند صاحب اپنے والدین کا احترام کرتے تھے بالکل اُسی طرح اپنے استاد کا بھی احترام کرتے تھے جس کی غمازی اس بات سے ہوتی ہے کہ ۱۹۹۳ء کے دوران جب قیس صاحب بہت بیمار تھے اس وقت چاند صاحب انہیں اپنے گھر لے آئے۔قریب سال پہلے ایک حادثے میں اُن کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو وہ گھسیٹ گھسیٹ کر چلتے۔گھر کے جس کمرے میں اُن کا قیام تھا وہاں سے بیت الخلاء قدرے دور تھا لہٰذا انہوں نے اُن کے کمرے میں ایک کموڈ رکھوا دیا اور جسے حسبِ ضرورت چاند صاحب دن میں دو تین مرتبہ خود صاف کرتے تھے۔اس وقت قیس صاحب کی عمر تقریباً اکانوے سال کی تھی۔جسمانی کمزوری کے باوجود روزانہ قیس صاحب سترہ اٹھارہ گھنٹے لکھنے، پڑھنے میں گزارتے۔اُن کی آخری کتاب ''لاوا'' چاند صاحب نے اُستادِ محترم کی وفات کے بعد شائع کروائی۔آج کے دور میں اس طرح کی خدمت گزاری اور سعادت مندی کی توقع اپنی اولاد سے بھی نہیں کی جا سکتی مگر چاند صاحب نے شاگرد ہونے کا حق ادا کر دیا۔

ہندوستان میں بسنے کے بعد میانوالی والوں نے دہلی میں ایک میانوالی تنظیم بنا لی جس سے ادھر اُدھر بکھرے میانوالی کے باشندے رکن بن کر آپس میں جڑ گئے۔یہ لوگ اپنی جڑوں سے جڑے رہنا چاہتے تھے۔یہ تنظیم ایک پرچہ بھی نکالتی تھی اور چاند صاحب اس پرچے کے لیے اکثر اپنی تخلیقات بھیجتے تھے۔ایک روز انہیں متھرا سے ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میانوالی میں وہ ان کے ساتھ سکول میں پڑھتے تھے اور تقسیم ملک کے بعد وہ متھرا میں بس گئے ہیں۔

چاند صاحب کو نام پڑھتے ہی سکول کا زمانہ یاد آ گیا۔دراصل اُس دوست کے والد کی کریانہ کی دکان تھی اکثر چاند صاحب ایک آنہ لے کر دکان پر جاتے اور چلغوزے خریدتے۔اگر اُن کا دوست وہاں پر موجود ہوتا تو ایک آنے کے چلغوزے لفافے میں دیتے ہوئے وہ آنا بھی اپنے والد سے نظریں بچا کر انہیں دے دیتا۔چلغوزے بھی قیمت سے زیادہ ہوتے اور پیسے بھی نہ لیتا۔

اتفاق سے ایک بار اُن کا متھرا جانا ہوا تو وہ بتائے گئے پتے پر اپنے دوست سے ملنے چلے گئے۔ایک عرصے بعد دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔اس بیچ عمر کے کئی پڑاؤ وہ طے کر چکے تھے۔چاند صاحب کی اہلیہ بھی اُن کے ساتھ تھیں۔جب انہوں نے دوست کو چلغوزے والا قصہ سنایا تو اُسے بالکل یاد نہ تھا بس اتنا یاد تھا کہ بچپن میں وہ ایک ساتھ کھیلے اور پڑھے ہیں۔چاند صاحب کا حافظہ بھی مضبوط ہے اسی لیے بچپن کی بہت سی باتیں انہیں ایک مدت گزر جانے کے بعد بھی یاد ہیں۔

دوستی، پیار، وفا، ایثار کے جذبات جو اُن کی شخصیت میں پائے جاتے ہیں وہی جذبات اُن کی شاعری میں نکھر کر آئے ہیں۔زندگی کے تلخ سنجیدہ حقائق کے علاوہ مستی اور شوخی، خوشیوں اور خواہشوں کی لذت اور اذیت، وصل اور جدائی کی کیفیات، عشق اور محبت کے نفسیاتی پہلو کو بڑے فنکارانہ انداز سے شاعری میں سمو کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ سیدھے قاری کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔اُن کی شاعری جذبات کے رنگ میں رنگی ہے۔

زندگی کے چہرے پر غم کی جو سیاہی ہے
کتنے مہرباں ہو تم اس کی یہ گواہی ہے

اُن کی شاعری میں نہ صرف خود کی ذات سے جڑے غم کا تصور ہے بلکہ غمِ کائنات کا کرب بھی ملتا ہے۔''سونامی لہریں اور خدائی قہر'' اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں:

ہزاروں بچے جو اس قہر میں یتیم ہوئے
گناہ و جرم سے بیچارے آشنا کب تھے
ہزاروں عورتیں وہ جن کے لٹ گئے ہیں سہاگ
ہزاروں کنبے جنہیں ڈس گیا سمندری ناگ
شکستہ حال تھے یکسر غموں سے چور تھے وہ
یہی قصور تھا ان کا کہ بے قصور تھے وہ
پھر اپنی شانِ کریمی دکھا دے یا اللہ
پھر ان کے اجڑے ہوئے گھر بسا دے یا اللہ

چاند صاحب نے پچاسی بہاریں دیکھ لیں، زندگی میں کئی اُتار چڑھاؤ بھی آئے مگر اُن کا ادبی سفر جو کم سنی میں شروع ہوا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔عمر نے حادثات نے اُن کے حوصلے پست نہیں کیے۔آج بھی اُن کے حوصلے نوجوانوں کو شرمندہ کر سکتے ہیں۔اب تک وہ سترہ کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں شاعری کے علاوہ مضامین، مختلف ممالک کی لوک کہانیاں اور سفر نامہ بھی شامل ہیں۔ایک اہم کتاب جو تحقیقی کام کہا جا سکتا ہے وہ ہے ''اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقاء میں ہریانہ کا حصہ'' (۶۶۵ صفحات پر مشتمل)

چاند صاحب کو بے شمار انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے جن میں قابلِ ذکر سید مظفر حسین برنی ایوارڈ، نسیم لیہ ایوارڈ، خواجہ الطاف حسین حالی ایوارڈ اور فخرِ ہریانہ ایوارڈ ہیں۔

عمر کی پچاسی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بھی اُن کی نظر آج بھی اُس زمین پر ہے جدھر سے عمر کی سیڑھی شروع کی تھی۔آج بھی اُن کا دل اپنی جائے پیدائش کی طرف بھاگتا ہے۔آج بھی اُن کے اندر اس مٹی کو دوبارہ چھونے کی تمنا آگ بن کر مچلتی ہے۔اپنی جائے پیدائش سے بچھڑنے کا انہیں ہمیشہ ملال رہا۔ایک بار جو اس سے جدا ہوئے تو پھر دوبارہ تریسٹھ سال بعد اُسے چھونے کا موقع ملا۔اکتوبر ۲۰۱۰ء میں انہیں جب وہاں جانے کی امید نظر آئی تو انہوں نے بنا وقت گنوائے اس موقع کو تھام لیا۔کچھ عزیزوں کے ہمراہ چند روز لاہور قیام کے بعد وہ کروڑ لعل عیسن پہنچے تو گزرا زمانہ یاد آ گیا۔انہیں وہاں کا چپہ چپہ یاد تھا۔اتنے عرصے میں وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔گلی کے، محلے کے مکان سب ویسے کے

ویسے تھے کہیں بھی کوئی مرمت، کوئی تجدید کے اثرات نظر نہیں آئے۔ البتہ اتنے سالوں میں مکانوں کی حالت خستہ ضرور ہوگئی تھی۔ گلی میں پہنچتے ہی انہوں نے اپنا گھر پہچان لیا۔ اُن کا مکان اب وہاں کے مقامی مونسپل کونسلر کا تھا جس نے اُس کو آگے فروخت کر دیا تھا اور اُس مکان کی مرمت چل رہی تھی۔ تین منزلہ مکان میں صرف بیٹھک ہی سلامت تھی باقی حصہ کئی جگہ سے گرادیا گیا تھا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اتنے سالوں میں بیٹھک کے دروازے کے ایک پٹ پر قدِ آدم لگا آئینہ بالکل صحیح سلامت تھا جسے دیکھ کر جذباتی ہونا لازمی تھا۔ وہاں سے نکلنے سے پہلے انہوں نے آنگن کی مٹی مشت بھر اٹھائی اور لفافے میں ڈال کر ساتھ لے آئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے وہ مٹی اپنے گھر کے مندر میں رکھ دی اور روز صبح اُس مٹی کو سجدہ کرنا بھی اُن کے معمول میں شامل ہوگیا۔

''نذرِ کروڑ'' کے عنوان سے لکھی ان کی نظم کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

میرے کروڑ کی پاکیزہ سرزمین! تجھ کو
ترے دیار کا شاعر سلام کرتا ہے
جھکا کے اپنی جبینِ نیاز ترے حضور
زبانِ شعر میں تجھ کو کلام کرتا ہے
وہ گھر وہ کوچے، وہ گلیاں وہ رہ گزار ترے
ہیں دل پہ نقش، انہیں کس طرح بھلاؤں میں؟
نصیب ہو ترا دیدار، بس دعا ہے یہی
جبیں پہ خاکِ مقدس تری سجاؤں میں

دسمبر ۲۰۱۳ء لاہور میں تین روزہ بین الاقوامی پنجابی امن کانفرنس منعقد کی گئی تھی جس میں چاند صاحب اور مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ آئے دن اخباروں اور ٹی وی خبروں میں کسی نہ کسی حادثے کا ذکر سن کر میری ماں مجھے اور میری ہمشیرہ کو لاہور بھیجنے کے لیے بالکل راضی نہیں تھیں حالانکہ اُن کی پیدائش لاہور کی ہے اور لاہور اُن کی یادوں میں اُن کی باتوں میں رَچا بسا ہے۔ تقسیم کے وقت اُن کی عمر سات سال تھی مگر اپنا گھر اپنی گلی انہیں خوب یاد تھی۔ چاند صاحب کے اصرار پر ماں اُن کے ہمراہ ہمیں لاہور بھیجنے پر راضی ہوگئیں۔ ایک وجہ ہمیں بھیجنے کی یہ بھی تھی کہ ''میں خود تو اب وہاں جا نہیں سکتی کم سے کم تم ہی جا کر دیکھ آؤ۔ مجھے لگے گا کہ میں نے تمہاری آنکھوں سے لاہور دیکھ لیا۔'' اپنی ادھوری خواہش کو وہ ہمارے ذریعے پورا کرنا چاہتی تھیں۔ پانچ دن ہم لوگ ساتھ رہے۔ ماں کو بھی اطمینان تھا اور ہمیں بھی سکون۔ چاند صاحب نے گھر کے بزرگوں کی طرح ہمارا ہر طرح سے خیال رکھا۔ ان کے چند ادبی دوستوں کے ہمراہ ہمیں لاہور گھومنے اور وہاں کے ادیبوں سے ملنے کا سنہرا موقعہ ملا۔ لاہور کا قیام ایک یادگار سفر بن گیا۔ پھر اس کے بعد چاند صاحب کو دوبارہ وہاں جانے کا موقعہ نہیں ملا حالانکہ ایک بار اپنی جائے پیدائش کو چھونے کی اُن کی خواہش بڑی شدید ہے۔

ملک تقسیم ہوئے ۷۳ برس بیت گئے لوگوں کو اپنی مٹی سے بچھڑے تقریباً ایک صدی ہو چلی ہے مگر گھر چھوٹنے کی تڑپ ابھی بھی باقی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ یہ درد دلوں میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور نہ جانے کتنی بوڑھی آنکھوں میں خواب ابھی بھی باقی ہیں۔ نہ جانے کتنے دوبارہ اُس مٹی کو چھونے کی خواہش میں جل رہے ہوں گے اور کتنے خوش نصیب ہوں گے جن کی آرزوئیں تکمیل کو پہنچ گئیں۔ وہ بھی تو ہوں گے جن کی خواہشیں اُن کے ساتھ ہی دم توڑ گئیں۔ قریب ایک صدی گزرنے کے بعد بھی درد کا یہ قصہ ختم نہیں ہوا۔ سیاست دانوں نے لوگوں کو سرحدوں میں تو بانٹ دیا مگر دلوں پر، خواہشوں پر، خوابوں پر، جذبوں پر کسی طرح کی سرحدیں قائم نہ کر سکے۔ کاش کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ دونوں دیشوں کے بیچ دوستانہ تعلقات استوار ہو جائیں۔ سب کو اُن کی آرزوؤں کی تکمیل حاصل ہو، کوئی اپنوں کے لیے اپنی مٹی کے لیے ترس کر اس دنیا سے رخصت نہ ہو۔ دعا گو ہوں کہ چاند صاحب کو پرماتما صحت یاب رکھے۔ اُن کی عمر دراز ہو اور اُن کی ایک بار پھر ''جبین پہ خاکِ مقدس تری سجاؤں میں'' کی خواہش پوری ہو۔ (آمین)

مختارِ کُل

وہ غنی الاغنیاء ، ہر ایک ہے محتاج اُسی کا
یہ جہان کیا، ہے سارے جہانوں پر راج اُسی کا
ہم ہیں مجبورِ محض اور وہ ہے مختارِ کُل
کہ ہیں یہ دوش و فردا اُسی کے، اور ہے یہ آج اُسی کا

حافظ محمد احمد

(راولپنڈی)

''سنومین''

برفانی انسان یا سنومین کا زمین سے فاصلہ ساڑھے چھ ارب کلومیٹر بتلایا گیا ہے۔ ناسا کے راکٹ کو یہ فاصلہ طے کرنے میں ایک سال سے زیادہ عرصہ لگا ہے۔

راکٹ سے موصول ہونے والے تازہ ترین ڈیٹا کے مطابق بھورے رنگ کی یہ چیز جاندار مخلوق نہیں بلکہ پرواز کرتی ہوئی ایک چٹّان ہے۔ جسے فاصلے سے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے برف کا پتلا بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔

سنومین کو ناسا کی ٹیم نے ہبل دوربین کی مدد سے ۲۰۱۴ء میں دریافت کیا تھا اس کی شکل وشبہات کے پیشِ نظر ''اروکوتھ'' کا نام دیا گیا جس کا مطلب ستاروں پر نظر رکھنے والا ہے!!!

''ڈُلار کے دھندے''

عمر کی نقدی

(ابنِ انشاء کی آخری نظم)

اب عمر کی نقدی ختم ہوئی
اب ہم کو اُدھار کی حاجت
ہم کچھ سال، مہینے، دن لوگو
پر سود بیاج کے بن لوگو
ہاں اپنی جاں کے خزانے سے
ہاں عمر کے توشہ خانے سے

کیا کوئی بھی ساہوکار نہیں؟
کیا کوئی بھی دیون ہار نہیں؟
جب نام ادھار کا آیا ہے ۔؟
کیوں سب نے سر کو جھکایا ہے؟
کچھ کام ہمیں نپٹانے ہیں
جنہیں جاننے والے جانے ہیں
کچھ پیار ڈُلار کے دھندے ہیں
کچھ جگ کے دوسرے پھندے ہیں

ہم مانگتے نہیں ہزار برس
دس پانچ برس دو چار برس
ہاں سود بیاج بھی دے دیں گے
ہاں اور خراج بھی دے دیں گے
آسان بنے دشوار بنے
پر کوئی تو ساہوکار بنے

تم کون؟ تمہارا نام ہے کیا؟
کچھ ہم سے تم کو کام ہے کیا؟

کیوں اس مجمعے میں آئی ہو،
کچھ مانگتی ہو؟ کچھ لائی ہو؟
یہ کاروبار کی باتیں ہیں
یہ نقد اُدھار کی باتیں ہیں
ہم بیٹھے ہیں کشکول لیے
سب عمر کی نقدی ختم کیے
گر شعر کے رشتے آئی ہو
تب سمجھو جلد جدائی ہو

اب گیت گیا سنگیت گیا
ہاں شعر کا موسم بیت گیا
اب پت جھڑ آئی پات گریں
کچھ صبح گریں کچھ رات گریں
یہ اپنے یار پُرانے ہیں
اک عمر سے ہم کو جانے ہیں
ان سب کے پاس ہے مال بہت
ہاں عمر کے ماہ و سال بہت
ان سب کو ہم نے بلایا ہے
اور جھولی کو پھیلایا ہے
تم جاؤ، ہم ان سے بات کریں
ہم تم سے نا ملاقات کریں

کیا؟ پانچ برس؟
کیا عمر اپنی کے پانچ برس
تم جان کی تھیلی لائی ہو؟
کیا پاگل ہو؟ سودائی ہو؟ .
جب عمر کا آخر آتا ہے
ہر دن صدیاں بن جاتا ہے

جینے کی ہوس نرالی ہے
ہے کون جو اس سے خالی ہے

کیا موت سے پہلے مرنا ہے؟
تم کو تو بہت کچھ کرنا ہے
پھر تم ہو ہماری کون بھلا؟
ہاں تم سے ہمارا کیا رشتہ؟
کیا سود بیاج کا لالچ ہے؟
کسی اور خراج کا لالچ ہے؟
تم سوہنی ہو، من موہنی ہو
تم جا کر پوری عمر جیو
یہ پانچ برس یہ چار برس
چھن جائیں تو لگے ہزار برس

سب دوست گئے سب یار گئے
تھے جتنے ساہوکار گئے
بس ایک یہ ناری بیٹھی ہے
یہ کون ہے، کیا ہے، کیسی ہے؟
ہاں عمر ہمیں درکار بھی ہے
ہاں جینے سے ہمیں پیار بھی ہے
جب مانگیں زندگی کی گھڑیاں
گستاخ انکھیاں کس جا لڑیاں

ہم قرض تمہیں لوٹا دیں گے
کچھ اور بھی گھڑیاں لا دیں گے
جو ساعت و ماہ و سال نہیں
وہ گھڑیاں جن کو زوال نہیں
لو، اپنے جی میں اُتار لیا
لو، ہم نے تم سے اُدھار لیا

نیم منہدم مکاں

پروین شیر

(نیو جرسی سٹی)

یکا یک خستہ دیواروں کے اندر اک دھماکے سے
کہیں کچھ ٹوٹ کر بکھرا
جسے سنتے ہی سر کے بل وہ سب دوڑے
مقفل زنگ آلودہ دریچہ وا کیا، دیکھا
وہاں شہتیر چھت کا فرش پر ٹوٹا پڑا تھا اور
یہ منظر دیکھتے ہی ہوش سب کے اڑ گئے، وہ سب
درودیوار سے لپٹے
کیا تدبیر، چھت کو پھر نئے شہتیر سے جوڑا

ہوا سفاک ہے، سنگین ہاتھوں سے
بدلتے موسموں کے سخت پتھر
اس مکاں پر دم بہ دم برسایا کرتی ہے
جہاں کچھ ٹوٹتا رہتا ہے آئے دن
مگر اب یہ دھماکے سن کے وہ پل بھر
ذرا سا چونک اٹھتے ہیں
کبھی فرصت میں آ کر کچھ
مرمت کر بھی لیتے ہیں
کریں بھی کیا؟
کہ بوسیدہ بدن کا ٹوٹ کر اب
ڈھیر ہونا ہی مقدر ہے!

○

محمود شام

(کراچی)

حسن بھیگا ہوا

پہلے گرجے تھے زور سے بادل
پھر گھٹا بھی امڈ امڈ آئی
خوشبوئیں بانٹنے لگی تھی ہوا
دل پہ دستک ہوئی تو یہ دیکھا
حسن دہلیز پر ہے بھیگا ہوا
رخِ زیبا ڈھکا ہے بوندوں سے
یاد آئی پھر ایک صبحِ چمن
پنکھڑی اوس میں نہائی ہوئی

○

بات ادھوری رہ جاتی ہے

سورج پورا ڈوبتا ہے
دن بھی پورا ڈھلتا ہے
سیٹ بھی پورے سجتے ہیں
پینل پورے بیٹھتے ہیں
شو بھی پورا ہوتا ہے
ایڈز بھی پورے چلتے ہیں
پر بات ادھوری رہ جاتی ہے
ذہن ادھورے ڈھلتے ہیں
قوم ادھوری رہ جاتی ہے

○

تماشگاہِ اجل

مشیر طالب
(امریکہ)

فگار سینے یہ الجھی سانسیں، دریدہ دامن یہ زندگی کا
اَناؤں کے خنجروں نے کتنا لہو بہایا ہے آدمی کا

کہیں تو دستِ مزاحمت ہو، کہیں تو ردِّ اَنا پناہی
کہیں تو نغمہ نوا ہو کوئی، سخن کہیں شائستگی کا

چمن میں بلبل بھی بے صدا ہے، گلوں کے ارماں نے اُوس اوڑھی
کہ دشتِ امکاں کے آنگنوں میں بھی خوف پھیلا ہے تیرگی کا

وہ شاہزادے کدھر گئے جو شہریاروں کے ہمقدم تھے
یہ کس نے ناقوس کو زباں دے کے زہر پھیلایا بے دری کا

منارے یہ روشنی کے نور بصیرتوں سے ہوئے گریزاں
لہو کی سودا گری نے مقتل سجا دیا ہے درندگی کا

یہ سارے علم و ہنر کے داعی، مسیحا و منصفانِ ملت
انہیں کا ادراک غم کا درماں، انہی سے فن ہے رفو گری کا

وہ صبحِ غم ہو یا شامِ گریاں، شبیں ہیں نوحہ کناں ہماری
تماشگاہِ اجل میں کس نے یہ تاج پہنا ہے سروری کا

یہ کس نے کھلیانِ غم میں طالبؔ شرر کو شعلہ نفس کیا ہے
دھکتے سینوں میں جلتی سانسوں کا یہ بھی منظر ہے دیدنی کا

○

رسی کا پُل

فیصل عظیم
(کینیڈا)

رسّی کا پُل
دیکھا بھالا
ہچکولے مانوس
گرہیں جس کی عقدوں سے پُر
طولِ سفر، اک عمر

رسّی کا پُل اک دن ٹوٹا
اور مسافر، گرتے گرتے
اُس کے دونوں ٹکڑے تھامے
خود پُل بن کر بیچ میں لٹکا جھول رہا تھا
سیکڑوں آنکھوں کے جھرمٹ میں
وہ مصلوب، تماشہ بن کر
ٹوٹے پُل کو جوڑ رہا تھا!
اونچائی پر دونوں سِروں کی جانب بے رحمی سے کھینچتی
ضدّی رسّی
تُند ہوا کی پیہم آڑی ترچھی کیلیں
گہرائی میں بہتا پانی اور چٹانیں
اور ہوا میں دو بازو شَل
اِس مٹھی سے اُس مٹھی تک حشر بپا تھا
پانی اور ہوا کے شور میں شریانوں کا خون ہو جیسے
اور تناؤ چیخ رہا ہو
''اپنی آنکھیں کھول کے دیکھو
رسّی بن گئے ہاتھ تمھارے
تم خود اپنا کفّارہ ہو
ہیلے لویاہ، ہیلے لویاہ **
اب جی اٹھو، جشن مناؤ
لمبے سفر سے تم کو آج نجات ملی ہے''

○

(Hallelujah **)

شاید! میں نہیں ہوں

یوگیندر بہل تشنہ
(امریکہ)

شاید!
میں نہیں ہوں
مگر میں تو ہوں
آتے جاتے، اِدھر اُدھر سے
سب کو دیکھ رہا ہوں
باتیں کرتے، ہنستے، کِھل کھلا کر،
سب دیکھ رہا ہوں، کچھ نہ کچھ سُن بھی رہا ہوں
میں ہوں، یقیناً ہوں

میری جانب کوئی رجوع کیوں نہیں کرتا
دیوار پر چسپاں پوسٹر کی صورت
مجھکو دیکھ رہے ہیں، مگر کوئی ردِّعمل نہیں ہوتا
کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا

شاید
میری گفت وشنید میں پہلی سی اب
تاب نہیں ہے، اُن کو ایک ہی بات کو
کئی کئی بار دہرانا پڑتا ہے۔
وہ زچ آجاتے ہوں گے
اُن کو ناگوار گزرتا ہوگا
میرے بارے میں چہ مگوئیاں تو ہوتی ہیں
میرے تعلق سے اِدھر اُدھر اطلاع تو دیتے ہیں
لیکن مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا۔

پہلے بچے، آتے جاتے لپٹ جایا کرتے تھے
کچھ نہ کچھ پوچھا کرتے تھے، وہ بھی اب
نہیں آتے۔ میرے پاس نہیں بھٹکتے
اُن کی باتیں بھی اونچی سننے لگا ہوں
اب وہ سب کچھ گوگل کر کے پوچھ لیا
کرتے ہیں
بے مصرف سا ہو گیا ہوں۔
کسی کا کوئی کام نہیں رُکتا، مجھ سے کوئی
واسطہ نہیں پڑتا کسی کا
اب کیوں کوئی مجھ سے بات کریگا۔۔۔!!!

میں کب سے بکے جا رہا ہوں، اور تم
ہونق کی صورت مجھکو گھورے جا رہے ہو
حیران ہو رہے ہو
خیر کوئی بات نہیں۔
دیر سویر تم پر بھی یہ لمحے
آسکتے ہیں
میری طرح تم بھی کھو گے
تم نہیں ہو۔۔۔ مگر تم ہو گے
اپنے یار دلدار تشنہ کی صورت!!!

○

''یکجہتی کشمیر''

شگفتہ نازلی

(لاہور)

بستیاں کشمیریوں کی۔۔۔
راستہ ہیں دیکھتی۔۔۔
اپنے جاں نثاروں کا۔۔۔

پابندِ سلاسل رہ کے بھی۔۔۔
لکھا ہے لہو سے اب تک جو۔۔۔
آزادی سوا اور کچھ بھی نہیں۔۔۔

جبر و استبداد کی دیوار کو۔۔۔
منہدم کرنے کی خاطر اب تلک
جانوں کی قربانی دی جاتی رہی۔۔۔

ظلم و ستم کی تپتی ریت پہ۔۔۔
اُس نے جب خواہش لکھی۔۔۔
تو ایک پرندہ اُڑنے لگا۔۔۔

بھائی چارے کی تدبیر
پَل پہ بڑھتی جاتی ہے۔۔۔
ہاتھوں کی پھیلی زنجیر۔۔۔

وہ دَور تو کوئی دُور نہیں۔۔۔
وادی کی صبیح پیشانی پہ جب۔۔۔
آزادی کا جھومر دَمکے گا۔۔۔!

○

ڈرون حملے

شارق عدیل

(ایٹہ)

ڈرون حملوں کی بارشوں نے
گھروں کو ملبہ بنا دیا ہے
خدا ہی جانے
کہ ان کے نیچے
دبی ہیں کتنی جواں امنگیں
دبے ہیں کتنے شفیق جذبے
دبے ہیں معصوم کتنے لہجے
خدا ہی جانے
مگر یہ دہشت گری کے منظر
بہانہ امن و اماں کا لے کر
جو تم زمینوں پہ بو رہے ہو
یقین مانو
کہ اک نہ اک دن
تمہیں بھی ایسے ہی منظروں سے
گزرنا ہوگا
قدم قدم پر بکھرنا ہوگا

○

فیض فہمی سے فیض شناسی تک

ڈاکٹرخلیل احمد مشیر صدیقی
(اندور)

ڈاکٹر تقی عابدی ہمارے عہد کے ایک ایسے مصنف ومؤلف ہیں جن کے مطالعۂ فیض نے اہل علم کی آنکھیں کھول دی ہیں۔

فیض کے حوالے سے''فیض شناسی''ان کا اہم کارنامہ ہے۔فیض کی شخصی اور ادبی زندگی کے نئے گوشے روشن کرتا ہے۔یوں تو اردوادب کی تاریخ میں کئی فیض نمبر،مختلف رسائل نے پیش کیے ساتھ ہی آج تک کئی گراں مایہ کتب بھی منظر عام پر آئیں ہیں جن کے ذریعہ فیض کی شخصیت اور فکر وفن کا محاسبہ کیا گیا ہے اور ڈاکٹر عابدی نے بھی مطالعہ فیض کو اہمیت واولیت بخشی۔فیض پر دستیاب تمام کتب اور مضامین کا باریکی سے مسلسل اور انتھک مطالعہ کیا۔فیض سے دلی تعلق ورغبت نے عزم وحوصلہ فراہم کیا۔دنیائے ادب میں اکثر ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی جرأت مندانہ کاوشیں اچھوتے پہلوؤں کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں اسی حوالے سے ڈاکٹر عابدی کا نام''فیضیات''میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

جہاں تک فیض کا تعلق ہے وہ ایک مخصوص عہد کی پیداوار تھے،ایک مخصوص عہد ساز تحریک یا مکتبۂ فکر یا بالفاظ دیگر ترقی پسندی سے جڑے تھے۔ان کا اپنا اسلوب اور نظریۂ حیات ہے۔ان کے یہاں وسیع تجربوں اور مشاہدوں کی ترجمانی یا ایک مخصوص طریقۂ اظہار ہے جس میں انقلاب اور جمال کے جملہ اوصاف وتقاضے نہایت ندرت اور پاکیزگی کے ساتھ جلوہ گر یا نمایاں ہیں۔ انہوں نے لہولہان سماج،امراض اور غربت سے دبے ہوئے افراد کی آہ وفغاں سنی،دردمند دل میں طوفان اٹھے اور انہوں نے اس انسانی کرب ودرد کو نہایت سنجیدہ لب ولہجہ دے کر دردوغم کی ترجمانی کی ہے۔فیض کا حسن بیاں محض سرورکن یا تفریحی نہیں انہوں نے خود اپنی گھٹن اور اپنے سماج کے دردوغم کا سراپا پیش کیا ہے جو فکر انگیز بھی ہے اور رومان خیز بھی۔غرض شاعر کی ذہنی تپش جب لفظ ومعنیٰ کا جامہ پہن کر تہہ دار معنویت کے سہارے نئے اور انوکھے اسلوب کے وسیلے سے مانوس جذبات کی عقدہ کشائی کرتی ہے تو ذہن ودل کے تار جھنجنا اٹھتے ہیں۔یہی فیض کے اسلوب بیان کی وہ خوبی ہے جس نے شعروادب کے شیدائیوں کو اپنی جانب کھینچا۔ڈاکٹر تقی عابدی کو بھی فیض کی اس مقناطیسی کشش نے اپنی طرف کھینچا۔وہ برسوں مطالعۂ فیض میں مصروف رہے اور دوضخیم کتب بعنوان''فیض فہمی''اور ''فیض شناسی''فیض کی ادبی تاریخ میں داخل کیں جو''فیضیات''کے باب میں گراں قدر اضافہ کا باعث ہیں۔غرض ڈاکٹر عابدی کئی سالوں سے مسلسل ادبی خدمت میں مصروف ہیں۔گوکہ وہ پیشہ سے ڈاکٹر ہیں،اپنے دور کے ماہر سرجن ہیں،عدیم الفرصت ہونے کے باوجود ان کا پیشہ تخلیق ادب اور ادبی مطالعات میں رخنہ نہیں،کیونکہ وہ ایک حوصلہ مند شیدائی ادب ہیں۔ابھی تک تین درجن سے اوپر ان کی تخلیقات شائع ہو چکی ہیں جو ادبی فکر ونظر کے اعتبار سے نئے ادبی گوشے روشن کر چکی ہیں۔

اسی حوالے سے ڈاکٹر عابدی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ان کی درجنوں معتبر اور وقیع کتب اردو ادب کی تاریخ میں گہرے نقوش ثبت کر چکی ہیں اور ان کی ادبی شناخت کی ضامن ہیں۔اس طرح وہ بھی اہل علم وادب کی پہلی صف میں نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی اور فکری کاوش اس وقت دوبالا ہوئی جب انہوں نے فیض احمد فیض پر تحقیقی وتنقیدی قلم اٹھایا اور''فیض فہمی''سے ''فیض شناسی''تک تفہیم ومطالعہ کی اچھی راہیں کھولیں اور اس راہ پر بہتوں کو پیچھے چھوڑ کر اپنی ذہانت،لگن اور جانفشانی کا سکہ جمایا اور جس کے باعث شہرت وعزت ہی میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ ان کے اخلاقانہ ذہن،دوررس تحقیقی نظر،تجسس وتفکر یا غور وفکر کے مختلف زاویے کھلے اور تحقیق وتنقید کے میدان میں مصنف کی خداداد صلاحیتیں آشکار ہوئیں۔

ان کے اس تحقیقی تجسس نے فیض کی متحیر کن اور روشن تصویر پیش کی ہے جو ان کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔فیض پر یہ ان کا کارنامہ رفیع الشان ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کی ایک معتبر علمی دستاویز ہے جو فیض کی ادبی تاریخ میں مشعل راہ ثابت ہوگی۔

ادھر فیض احمد فیض کی ادبی قدر وقیمت متعین کرنے کے لیے اردو رسائل وجرائد میں میں بے شمار مضامین شائع ہوئے۔اسی طرح فیض پر متعدد کتابیں اور فیض نمبر رسائل کے نکلے جن کی ایک لمبی فہرست ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض سے متعلق دونوں کتابوں میں وضاحت کے ساتھ شائع کیں جو فیض کے محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔انہوں نے فیض پر طبع شدہ مواد کے ساتھ تخلیقات فیض کی بھی ایک مکمل فہرست پیش کی ہے جو مطالعۂ فیض کے لیے اہم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر تقی عابدی سرجری کے پیشے میں مقید رہنے کے باوجود ادب کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں ساتھ ہی ادب کے اچھوتے پہلوؤں پر قلم اٹھاتے ہیں۔ادب ہی ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور وہ فرصت کے تمام لمحات ادب کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔انہوں نے قدیم وجدید ادب میں نئے فکری زاویے تلاش کیے ہیں خصوصاً اُن اہل قلم کو پیش نظر رکھا جن کا بیش قیمت اثاثہ یا کوئی مخصوص پہلو اچھوتا رہا ہو یا صحیح خدوخال کی ترجمانی سے محروم رہا ہو۔غرض انہوں نے تاریک اور تشنہ پہلوؤں کو روشن اور تازہ دم کیا ہے۔ان کی کچھ اہم کتب کے عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے مثلاً''اقبال کے عرفانی زاویے''، ''انشاء اللہ خاں انشاء''،''مجتہد نظم مرزا دبیر''،''مصحف فارسی دبیر''،''مثنویات

دبیر''، ''رباعیات دبیر''، ''تجزیہ یادگارانیس''، ''نعت ومنقبت''، ''دیوانِ غالب'' اور ''نعش لکھنوی'' وغیرہ۔

فیض دنیائے ادب کے نامور اہل قلم ہیں، ان پر قلم اٹھانے سے ہی علمی قد بڑھ جاتا ہے مگر مشاہیر ادب نے جس طرح ان کی شخصیت وفن پر قلم اٹھایا اس سے فیض کے علمی وفنی وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔ غرض اردو کے ہر ممتاز اہل قلم نے فیض کی شخصیت اور فکروفن پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آج بھی یہ کام جاری ہے۔ مگر جو فیض کے شیدائی ہیں آج بھی فیض کی چھان بین یا تحقیق یا تنقید میں لگے ہیں۔ نئے نئے اچھوتے پہلو دریافت کررہے ہیں، ان میں ڈاکٹر تقی عابدی قابل ذکر اور اہم ہیں۔ اولاً انہوں نے ایک سو بیس اہل علم کے مقالے پڑھے بعدازاں چالیس خود لکھے اور انہیں کتابی شکل دے کر ایک ضخیم مجلّہ پیش کیا جو دنیائے ادب میں ''فیض فہمی'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب ایک مستند دستاویز ہے جس میں فیض فہمی کی تمام صورتیں موجود ہیں۔ یہ بھاری بھر کم کتاب متعدد اہل قلم کی تحریروں کا مجموعہ ہے جو فیض کے محبین اور محققین کے لیے بے حد سود مند ہے۔

سید تقی عابدی کا کام یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ ایک نیا علمی چراغ اور روشن ہوگیا۔ مثل مشہور ہے کہ چراغ سے چراغ جلتے ہیں فیض فہمی سے ''فیض شناسی'' کی راہ ہموار کی اور تقریباً چالیس سے اوپر ایسے مضامین قلم بند کیے جو فیض فہمی میں اچھوتے ہیں جن پر مصنف نے گہری نظر ڈالی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی ذہانت، علمیت اور باریک بینی نے فیض سے متعلق کئی نئے تحقیقی پہلو پیش کیے ہیں جو دنیائے ادب میں ''فیض شناسی'' کے نام سے آج ہمارے سامنے ہے۔ اس میں جو مضامین شامل ہیں وہ علمی شان دکھانے کے لیے نہیں ہیں بلکہ تحقیق کی نئی راہیں کھولتے ہیں۔ مطالعۂ فیض کو نئے زاویوں اور فیصلوں کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً فیض کی شخصیت سے متعلق کچھ اہم مضامین اس طرح ہیں ''فیض کا زندگی نامہ'' ''فیض کی دولت تنہائی''، ''فیض کا عقیدہ''، ''فیض اور بادہ وساغر''، ''فیض کی صحت اور بیماریاں''، ''فیض نے کن کتابوں کا مطالعہ کیا''۔ ان مضامین میں فیض کی شخصی کوائف کے پرتو موجود ہیں۔ فیض کے فکروفن کو مزید جِل دینے کی غرض سے جو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں ان میں ''فیض کی شاعری''، ''فیض کی غزل کا مقام''، ''کلام فیض عربی فارسی الفاظ کا گلدستہ''، ''فیض کی نظم کی وسعتیں''، ''فیض کے کلام پر فیض کے ریویو''، ''فیض مصور خدوخال حسن''، ''فیض اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدریں''، ''کون بڑا جوش یا فیض'' تنقید وتحقیق کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان میں تشریح وتجزیہ کا رنگ غالب ہے۔ ہر مضمون غیر جانبدارانہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ نہ کہیں علمی شان دکھائی گئی ہے اور نہ تحقیق کی نمود ونمائش کا شائبہ نظر آتا ہے۔ مطالعہ کی گہرائی کے ساتھ ہر بیان مدلل اور شیریں کلامی سے آراستہ ہے۔ ردوکد کی بحثیں بھی صاف ستھری ہیں۔ مصنف نے فیض کی شخصیت اور فکروفن سے متعلق ہر مضمون کو تحقیقی لگن اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ مکمل کیا ہے۔

متذکرہ مضامین میں جہاں اچھوتی فکر، راست گوئی اور خوش بیانی ہے وہیں مصنف کی نیک نیتی اور عالمانہ وقار بھی جھلکتا ہے۔ فیض کے ساتھ ہی جوش اور اختر شیرانی کے موازنے بڑے دلچسپ اور صاف گوئی کے نمونے ہیں جہاں تقابلی تنقید کا رنگ جھلکتا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نہایت صاف گو اور زود فہم ہیں۔ ان کا شعور آزاد ان کی فکر اعلیٰ اور غیر جانبدار ہے۔ انہوں نے اپنی پوری علمی سعی کے ساتھ فیض کی شخصیت وفن کا احاطہ کیا ہے اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں کئی اچھوتے اور تشنہ پہلوؤں کو فیض کی ذات میں جوڑا ہے۔

یہاں اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کسی ادیب یا فنکار کے مزاج اور اس کے ادب کے ذائقہ کو سمجھنے کے لیے ادیب کی ذات کو گونا گوں پہلوؤں کو سمجھے بغیر فنکار کی شخصیت اور فن کی توضیح وتشریح ممکن نہیں۔ یا پھر یہ تشریحات ادھوری ہیں۔ غرض اس راہ میں مطالعہ کی باریک بینی، تحقیق کی سعی مسلسل کے بغیر فنکار کی روح کو سمجھنا ممکن نہیں اس سارے عمل میں محنت شاقہ درکار ہے۔

اسی حوالہ سے اگر ''فیض شناسی'' کے دوسرے مضامین دیکھیں مثلاً ''فیض بنام افتخار عارف''، ''فیض اور مصطفیٰ زیدی''، ''قصہ سازش اغیار کہوں نہ کہوں''، ''فیض کی تقریظیں''، ''فیض کا ادبی مناظرہ بعنوان پریم چند''، ''فیض کا مرثیہ امام''، ''اے بسا آرزو کہ خاک شد''، ''فیض اور ایرانی انقلاب''، ''جو تمہارا میرا رشتہ ہے'' فیض سے متعلق کچھ نئے گوشے روشن کرتے ہیں۔ متذکرہ مضامین کے علاوہ کئی اور چھوٹے بڑے مضامین ہیں جن کا الگ الگ ذکر کرنا محال ہے۔ ڈاکٹر عابدی کے اس مجموعۂ مضامین میں شامل مضمون ''فیض کے ۲۷ نشتر'' کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی محنت کے ساتھ فیض کے کچھ اہم تنقیدی نظریات کو اختصار کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ فیض کے گرانقدر ادبی و تنقیدی نظریات ہیں جو مجموعی طور پر کتاب ''میزان'' سے ماخذ ہیں۔ یہی حال فیض کے انٹرویوز کا بھی ہے۔ مصنف نے ان انٹرویوز کو بھی فیض شناسی کے لیے اہم تصور کیا ہے۔ بہرکیف ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض سے متعلقہ تمام کتابوں، تقریظوں، تحریروں، تقریریوں اور انٹرویوز سے فیض شناسی کی راہ ہموار کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے مطالعہ کی جانفشانی، عرق ریزی اور دیدہ ریزی کی پروا کیے بغیر فیض کی شخصیت اور فکروفن کے لازوال سرچشمے کھوجے ہیں اور ہر اچھوتے پہلو پر حتی الامکان بھرپور مضامین بھی قلمبند کیے ہیں جن کے لیے وہ فیض کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

غرض تحقیق کی اس کٹھن راہ پر ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے عمیق مطالعہ کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ فیض پر ریزہ ریزہ معلومات کو ذہن میں رکھ کر مواد جمع کیا۔ تحقیق وتنقید کی راہ مکمل کی ہے۔ دراصل ''فیض شناسی'' ڈاکٹر عابدی کا ایک بڑا تحقیقی کارنامہ ہے جو ان کے مصمم ارادے اور پرلگن حوصلے کی ایک زندہ مثال ہے۔

باقی صفحہ ۱۰۷ پر ملاحظہ کیجیے

مختصر افسانے کی عصری صورت حال''

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

دنیا چھوٹی ہوگئی ہے یا رسائل و رسائل کے پرانے پرندوں نے اپنے پرانے پرجھاڑ کر تیز تر اڑنے والے پر اُگا لئے ہیں۔ دوسری جانب سائنسدانوں اور موجدوں نے ایسے نئے وسائل بہم کردیئے ہیں جن کے پرندے پلک جھپکتے میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پرواز کر لیتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہماری دنیا کے سارے ممالک ایک دوسرے کے قریب تر آ گئے ہیں۔ ان ملکوں میں رہنے، بسنے والے لوگ اپنی ثقافتوں کے ساتھ باہم دیگر آویزش وآمیزش کے مرحلوں سے گزر رہے ہیں۔ تجارتی، اقتصادی اور معاشرتی لین دین کے ساتھ ثقافتی لین دین میں تیزی آ گئی ہے۔ دنیا کا جغرافیہ بھی قدرے تیزی سے تبدیل ہورہا ہے۔ مغربی سامراج دنیا کو ''گلوبل ولیج'' میں بدلنے کے درپے ہیں۔ کمزور ملکوں کے استحصال کا ڈرامہ دنیا کے اسٹیج پر قسطوں میں کھیلا جارہا ہے۔ میں نے یہ سب اس لیے لکھا ہے کہ شعروادب اور فن پر بات کرتے سے عصری دنیا کو پیش نظر رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔

تخلیقات کا تعلق کسی نہ کسی طریقے سے سبھی آج کی دنیا سے ضرور ہوتا ہے خواہ کم، خواہ زیادہ ہر تخلیق اپنے خالق سے، مقام تخلیق سے اور زمانہ تخلیق سے جڑی رہتی ہے۔ اب اگر اس تخلیق کے خالق کا وژن اتنا وسیع ہے کہ اس کا دائرہ دنیا سے نکل کر کائنات اور خلاؤں پر اور وقتِ موجود کا حصار پار کر کے ازل اور ابد پر محیط ہے تو معاملہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ آج کے افسانے میں یا اس کے عقب میں آج کی دنیا، آج کا عصر ملتا ہے جس کا ہلکا سا تاثر میں نے اپنے پڑھنے والوں کے ذہنوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اب میں اس لائق ہو گیا ہوں کہ آپ سے صاف لفظوں میں یہ کہہ سکوں کہ آج کے افسانے کے خاص موضوعات، سیاست، تشدد اور جنس پر مشتمل ہیں۔ اس وقت میں عالمی شعروادب اور فکشن کی بات کر رہا ہوں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک ملک کا شعر وادب اور بطور خاص فکشن مقامی موضوعات کے شمول سے متذکرہ موضوعات کے علاوہ منفرد اضافی موضوعات کا حامل ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر پس ماندہ ممالک کے اضافی موضوعات میں انتقال آبادی، ہجرت، بھوک، افلاس، جہالت، طبقاتی استحصال کے موضوعات ترجیحی اہمیت اختیار کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ نسل کشی، دہشت گردی، ریاستی دہشت گردی، غیر ملکی سامراجی دخل اندازی، کمزور ملکوں پر طاقتور ملکوں کا فوجی اور سیاسی تسلط، انسانی حقوق اور خاص طور پر نسوانی حقوق کی پامالی اور دیگر ایسے موضوع ہیں جو شعروادب اور فکشن کو

اپنی آماجگاہ بنا سکتے ہیں۔ جہاں تک افسانے کی صنف کا تعلق ہے موضوع، مرکزی خیال اور نقطۂ نظر بعض اوقات قاری کے ذہن میں افسانہ ختم کرنے کے بھی کافی دیر بعد ذہن میں آتے ہیں۔ اگر موضوع افسانے کی سطح پر ہو اور بالکل سامنے ہو تو ادب صحافت زدہ ہو جاتا ہے۔

اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ افسانہ پیدا کس طرح ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہر افسانے کے عقب میں کوئی نہ کوئی تحریک موجود ہوتی ہے۔ اس تحریک کا باعث کوئی ذاتی مشاہدہ یا تجربہ بھی ہوسکتا ہے۔ کوئی واقعہ ہوسکتا ہے، کوئی فقرہ، کوئی منظر یہاں تک کہ کوئی تصویر، کوئی افسانہ، کوئی مووی، کوئی خواہش، کوئی آرزو اور کوئی خواب۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ افسانہ نگار نے یہ تحریک جذباتی سطح پر محسوس کی تھی یا ذہنی سطح پر۔ کیرن براؤن سے جب اس کی کہانی ''انکشن'' (Unction) کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔

''میں نے جب ٹین ایجر تھی تو ایک موسم گرما میں جوب کے طور پر جلد بندی کی مشین شاپ میں کام کیا تھا۔ گرمی سے معمور بورڈم، تیل میں نہائے ہوئے پرزوں کی بُو، سب میرے پاس لوٹ آیا اور کہانی میں سما گیا۔''

کیرن براؤن ایسی افسانہ نگار ہے جو کسی مقام سے تحریک حاصل کرتی ہے۔ کوئی جگہ، اس کی فضا، اس کا ماحول اس کے افسانے کا سبب بنتے ہیں۔ ڈیوڈ مینس (David Means) اپنی ایک کہانی ''سالٹ اسٹی میری'' (Sault Ste Marie) کے بارے میں یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس مقام کا ایک امیج اسے لڑکپن سے گھیرے ہوئے تھا۔ ڈیوڈ لارنس نے روس کے ایک لوک آرٹ میوزیم میں لکڑی سے تراشے ہوئے ایک منظر کو دیکھا جس میں مچھلی کی پشت پر گاؤں دکھایا گیا تھا۔ وہ اس کے ذہن میں لوٹ لوٹ کر آتا رہا یہاں تک کہ اس نے اپنا مشہور افسانہ ''کنسیوڈ'' (Cancieved) تخلیق کیا۔

یہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ تخلیق کار جو کچھ اپنی داخلی شخصیت سے باہر نکال کر اپنی تخلیق میں سموتا ہے وہ بھی اس کے اندر خارج سے آیا ہوا ہوتا ہے اور اس کے لیے بھی خارج ہی ذمے دار ہوتا ہے۔ مختصر افسانے کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ خود ہی اپنے آپ کو لکھواتا ہے۔ نہ صرف اپنے آپ کو لکھواتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ افسانہ نگار کی جان کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ مدتوں اس کو دق کیے رہتا ہے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اس کو خلق نہ کر لیا جائے۔

عالمی تناظر میں آج کے مختصر افسانے کو دیکھا جائے تو موضوعات کے تنوع کے ساتھ تکنیک اور برتاؤ کے تنوع کا بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اس صورتِ حال کو میں اختصار کے ساتھ یوں بیان کروں گا کہ آج کا افسانہ ازحد سیّال ہے۔ اس کو اصولوں اور قوانین سے باندھا نہیں جاسکتا۔ آج کی تیزی سے بدلتی دنیا میں مختصر افسانہ بھی تیزی سے بدلتا جارہا ہے۔ مغرب کے افسانے اور پاک وہند کے

اردو ہندی افسانے میں ایک فرق ضرور دیکھنے میں آیا ہے۔ دوسرے ملکوں اور خود پاک و ہند کی چند ایک زبانوں کا افسانہ نگار بے باکی سے لکھتا ہے اور اپنے افسانے کو بلا جھجک منطقی انجام تک پہنچاتا ہے جبکہ اردو، ہندی کا افسانہ نگار اور خاص طور پر پاکستانی افسانہ نگار اپنے پڑھنے والوں کو پیش نظر رکھ کر لکھتا ہے۔ ان سے خائف بھی رہتا ہے اپنے آپ کو احتساب سے محفوظ رکھنے کے لیے اشاریت اور رمزیت کا سہارا لینا اور بات ہے اور اپنے افسانے کو شعریت اور تہہ دار معنویت کا حسن اور نکھار دینے کے لیے ایسا کرنا قطعی دوسری بات ہے۔

مختصر افسانہ اپنے سفر پر رواں دواں ہے۔ دورانِ سفر وہ مسلسل تبدیلیوں سے دوچار ہو رہا ہے۔ ان ہی تبدیلیوں میں اس کی زندگی کا راز مضمر ہے۔ تبدیلیوں کے باوصف وہ پختگی بھی حاصل کرتا جاتا ہے۔ ہمہ وقت متغیر چیز پختگی کس طرح حاصل کر سکتی ہے؟ اگر آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھر آیا ہے تو اس کا جواب خود آپ کے اندر ہی موجود ہے۔ ذرا سوچئے آپ جو اپنی زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں اور اس سفر کے دوران مسلسل تبدیلیوں سے دوچار ہو رہے ہیں تو کیا آپ روز بروز پختگی سے ہم کنار نہیں ہوتے جا رہے ہیں؟ جیسے آپ ہیں ویسے ہی مختصر افسانہ ہے۔ اب میں ایک پٹا، پٹایا پامال فقرہ لکھنے جا رہا ہوں اور وہ فقرہ ہے ’’زندگی مٹھی میں بھری ریت کی طرح پھسلتی جاتی ہے‘‘ آپ یہ سوچتے ہوں گے کہ میں اس فقرے کی واقعیت سے انکار کرنے والا ہوں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ درخواست کروں گا کہ آپ کسی افسانہ نگار کی مٹھی کھول کر دیکھیں۔ اس کی مٹھی میں بھی زندگی ہے۔ ریت کے ننھے ننھے ذروں کی جگہ مختصر افسانوں کی صورت میں۔ فرمایئے آپ کس کی مٹھی کھولیں گے؟ کسی ٹولسٹوائے، کسی کافکا، کسی او۔ ہنری، کسی پریم چند، کسی بیدی، کسی منٹو کی یا پھر آپ مٹھیاں کھولتے ہی چلے جائیں گے۔

- بقیہ -

فیض فہمی سے فیض شناسی تک

ادبی دنیا کے وسیع و عریض پہلوؤں کا مطالعہ دل جمعی کے ساتھ کرنا۔ متعدد مستند اہل قلم کے حوالوں کے مثبت پہلوؤں کو پیش کرنا یا غور و فکر کے بعد تحقیقی مواد جمع کرنا تحقیق کی اصل روح ہے۔ فیض کی ذات اور فن سے لگاؤ کے باعث مصنف نے تحقیق کا بار گراں اٹھا کر کل ایک سو ساٹھ مضامین کا انتخاب کیا جس میں ڈاکٹر تقی عابدی کے چالیس تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ یہ مجموعۂ مضامین ’’فیض فہمی‘‘ کے نام سے ۲۰۱۱ء میں لاہور سے شائع ہوا بعد میں یہی چالیس مشمولہ تحقیقی مضامین انفرادیت کے باعث مشہور ہوئے اور آج ’’فیض شناسی‘‘ کے نام سے شائع ہو کر ہمارے سامنے ہیں۔ متذکرہ مضامین میں ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کے کچھ نئے اور اچھوتے پہلوؤں کو پیش کیا ہے جو تحقیق فیض میں نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ پچھلے صفحات میں ہم نے ان کے کچھ مخصوص مضامین کا ذکر کیا ہے تا کہ فیض کے حوالے سے ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی عظمت واضح ہو سکے۔

آخر میں ان کی اسی مشہور کتاب ’’فیض فہمی‘‘ پر بھی سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس حوالے سے اگر ہم ڈاکٹر تقی عابدی کی ادبی فکر و نظر کا مجموعی طور پر مطالعہ کریں تو ان کی ہر تخلیق ادب یا تدوین ادب کچھ نیا پیش کرنے میں اولیت رکھتی ہے جو گہرے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔ کتاب ’’فیض فہمی‘‘ بھی ڈاکٹر عابدی کے ذوق مطالعہ کی ترجمان ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ مرتب و مصنف کی نظر اردو ادب پر گہری ہے۔ فیض سے متعلقہ مضامین سے انہیں واقفیت بھی ہے اور انہوں نے ہر مضمون کا گہرائی سے مطالعہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے اپنی اس انتخابی مہم میں مشاہیر اہل قلم کے مختصر و طویل مضامین شامل کیے ہیں۔ یہ مضامین تنقید، تحقیق، تبصرہ اور تجزیہ کی شکل میں ہیں جو مفید ارشادات و نظریات کے حامل ہیں اور فیض کے سفر حیات اور فکر و فن کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انہوں نے فیض کے مختلف شخصی اور ادبی پہلوؤں کے بکھرے ہوئے سرمایۂ ادب کو بڑی جانفشانی اور خوبی کے ساتھ جمع کیا ہے۔ یقیناً یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مرتب کی عرق ریزی، عزم اور حوصلے کی ایک اچھی مثال ہے۔

اس گراں قدر مجموعۂ مضامین میں فیض کی شخصیت و فن کے حوالے سے خاصا مواد موجود ہے جس کی روشنی میں فیض کی حیات و فن پر متعدد اہل قلم کے نظریات ہم تک پہنچتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کی نوعیتیں واضح ہوتی ہیں اختلاف و اشتراک رائے کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے فیض کی تفہیم آسان ہو گئی ہے یہی اس کتاب کی عظمت و شان ہے۔

شیدائی فیض یا محقق ادب فیض سے متعلقہ سرمایۂ ادب کے ایک بڑے حصہ سے گھر بیٹھے مستفید ہو سکتا ہے۔ اگر ہم ڈاکٹر عابدی کے اس کارنامہ کو فیض کا انسائیکلوپیڈیا کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

تنقید کا کردار

حمید شاہد
(اسلام آباد)

جن دِنوں فکشن کے اِس طالب علم کا محمد عمر میمن مرحوم سے ماریو برگس یوسا کی کتاب ''نوجوان ناول نگار کے نام خطوط'' پر مکالمہ چل رہا تھا، تو یہ موضوع بھی زیرِ بحث آیا تھا کہ فکشن کو سمجھنے کے باب میں تنقید کا منصب کیا ہے؟ لگ بھگ ہم دونوں اِس بات پر متفق تھے کہ اردو میں فکشن پر جس قرینے کی تنقید لکھی جانی چاہیے تھی ویسی لکھی نہیں گئی؛ کچھ نام ضرور تھے جو بہ قول میمن صاحب فرض کفایہ کی ادائی تک اہم تھے اور بس۔ خیر اس باب میں کوئی کلی طور پر میمن صاحب سے متفق نہ ہو تو بھی یہ بات سامنے کی ہے کہ فکشن کی فنی عملیات پر مباحث ہمارے ہاں لگ بھگ نہ ہونے جیسے رہے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس جانب توجہ دیے بغیر فکشن کی ڈھنگ سے تفہیم ممکن ہی نہیں ہے۔

فکشن کی تنقید پر ڈھنگ کا کام کیسے ہو کہ ابھی تو ہم لفظ فکشن پر ہی اٹکے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ معترضین کا کہنا ہے کہ فکشن نگاری کی اصطلاح کو کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ دونوں الگ الگ زبانوں کے الفاظ ہیں اور یہ کہ یہ اصطلاحی ٹانکا بے جوڑ ہو کر اسے غیر فصیح بنا دیتا ہے۔ ان احباب سے بصد ادب یہ کہنا ہے کہ نہیں صاحب! یہ اصطلاح بے جوڑ ہے نہ غیر فصیح۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی کوئی اصطلاح ہمارے کھیسے میں تھی ہی نہیں جو ناول اور افسانے، دونوں پر بہ سہولت اور یکساں طور پر برتی جا سکتی۔ ایسی اصطلاح کی ہمیں ضرورت تھی اور تلاش بھی اور دوم یہ کہ یہ اصطلاح اپنی اسی خصوصیت کے سبب ناول نگاری اور ڈرامہ نگاری جیسی اوّل اوّل مردود ہونے والی اصطلاحوں کی طرح ترویج پا چکی ہے۔ صاحب! اُردو زباں کے اصول وضع کرنے والوں نے ایک اصول یہ بھی تو بتا رکھا ہے کہ جو رائج ہو گیا وہی فصیح ہے۔

اور ہاں یہ جو میمن صاحب نے فکشن کی تنقید پر فرض کفایہ والی پھبتی کسی تھی اور مغربی ادیبوں کے فن فکشن نگاری پر مکالموں کو اردو میں ڈھال کر یہ کمی پورا کرنی چاہی تھی، وہ کسی حد تک اس باب کی تنقید پر پھبتی بھی ہے تاہم کم سہی مگر اس باب میں ایسا کام بھی ہو چکا ہے کہ اس سے کنی کاٹ کر نکلنا ممکن نہیں ہے۔ حسن عسکری، ممتاز شیریں، مہدی جعفر، سید وقار عظیم، مجتبیٰ حسین، احتشام حسین، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، عبدالمغنی، انیس ناگی، وارث علوی، عابد سہیل، دیوندر اِسر، شمیم حنفی، ڈاکٹر سلیم اختر، مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر انوار احمد اور دوسرے ناقدین کے فکشن پر قائم کیے گئے مباحث سے لے کر سکند احمد کی کتاب ''افسانے کے قواعد'' تک چلے آئیں اور ان میں مظہر جمیل، آصف فرخی، ضیا الحسن، مبین مرزا اور امجد طفیل کے مضامین کا اضافہ کر کے ناصر عباس نیر کے اُس کارگر حیلے کو دیکھ لیں جس کے ذریعے انہوں نے اس فن کو سمجھانے کے لیے افسانوں کی کتاب میں کہانی میں تنقید کا قرینہ برت لیا تھا۔ اور ہمارے بعد والے ناقدین میں نسیم عباس احمر کی کتاب ''اُردو افسانے کے نظری مباحث'' اور فرخ ندیم کی ''فکشن کلامیہ اور ثقافتی مکانیت'' تک آ جائیں، یہ ایسا کام ہے جسے اُردو فکشن کی تفہیم میں کام میں لایا جا سکتا ہے۔

فکشن کی تنقید کے اتنے بڑے سرمائے کے باوجود اگر تشنگی کا اِحساس ہوتا ہے تو اِس کا سبب یہ ہے کہ بالعموم فکشن کے موضوعات کی سطح پر یا زمانی اعتبار سے فہرست سازی کر لینے اور اس باب کے اشتراکات کو مفصل زیرِ بحث لے آنے کو ہی فکشن کی تنقید سمجھ لیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی زمانے کے مجموعی تخلیقی مزاج کی یہ تنقیدی تشکیل ایسی گمراہ کن ثابت ہوئی ہے کہ سیاسی سماجی موضوعات اور رجحانات پر لکھنے والے تو اہم ہوئے ہیں خود عمدہ فکشن کے نمونے ایسے عمومی مباحث کے نیچے دبتے چلے گئے ہیں۔ مرے کو مارے شاہ مدار، اس پر نئی تنقید کے نام پر تھیوری کے مباحث کا ایسا شور اُٹھا کہ تین دہائیاں ڈکار گیا ایسے میں المیہ یہ رہا فکشن پاروں کی تعیین قدر اہم نہ رہی۔ اگر کچھ ہوا تو یہ کہ فن پارے کو اپنی 'کل'' میں دیکھنے اور تفہیم کی صورتیں سجھانے کی بجائے اس کے حصے بخرے کر کے تجزیے کو ترجیح دی جاتی رہی۔ یہی سبب ہے کہ اس سارے عرصے میں فن پارہ بہ طور تخلیق ایک عمومی متن سے زیادہ اہم نہیں رہا۔ اچھے برے کی تمیز ختم ہو کر رہ گئی۔ باقی بچے تو وہ لسانی اور فلسفیانہ مباحث جنہیں پڑھ کر ایک بار شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا تھا:

''اِن میں ادب کہاں ہے؟''

''آج کی نشست کے لیے منتخب کیا جانے والا موضوع ''فکشن کی تفہیم میں تنقید کا کردار''، مجھے یوں لگا ہے کہ ہماری اس تنقیدی روش پر عدم اطمینان کا اظہار بھی ہے۔ مجھے اس موضوع پر جو سوجھا اور اس باب کے سوچنے والوں کو پڑھ کر جتنا میں اخذ کر پایا ہوں، کوشش کرتا ہوں کہ اس کا ملخص اپنے لفظوں میں پیش کر دوں۔

ا۔ فکشن کی تنقید کا پہلا وظیفہ تو یہی ہے کہ وہ ایک عام متن اور فکشن کے تخلیقی متن میں تمیز کر سکے۔ یاد رہے کہ عام متن اپنے روایتی معنوں سے بندھا ہوا ہوتا ہے جب کہ تخلیقی عمل میں فکشن ہو جانے والا متن کئی معنیاتی امکانات کھولنے لگتا ہے۔ کہہ لیجئے وہ زبان جو کچھوے کی طرح اپنے خول میں سمٹی سمٹائی ہوتی ہے، اس خول سے نکلتی ہے اور نئے معنی جذب کرنے لگتی ہے۔ ایسا زبان سے تہذیبی اور ثقافتی معنی کی بے دخل کیے بغیر ہوتا ہے؛ کہہ لیجئے ایک ایسا جادو سا چل جاتا ہے کہ اُن میں توسیع اور نمو کو ممکن ہو جاتی ہے۔ جس طرح مکڑی جالا بن لیا کرتی ہے، کچھ ایسے ہی ایک معنیاتی ویب بن جاتا ہے۔ اور ہاں یہاں یہ اضافہ بھی کیے دیتا ہوں کہ ہر کہانی فکشن نہیں ہوتی مگر ہر فکشن پارہ کہانی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ماجرا نگاری فکشن میں اہم ہے، بہت اہم ہے لیکن وہ جو پُشکن نے کہا تھا کہ '' آہ! ننگی حسین نہیں ہوتی، کھٹکتی ہے'' تو یہ کہا اِس باب کا بھی یوں سچ ہے کہ محض واقعہ

کا بیان کہانی کو ننگا کر کے اُتھلا بنا دیتا ہے جبکہ فکشن کے قرینے اس ننگے بدن کا وہ مہین لباس ہیں جن سے اس کی جمالیات مرتب ہوتی ہے۔

۲۔ فکشن کا تنقید کا دوسرا وظیفہ یہی ہے کہ وہ یہ سوال قائم کرے کہ فن پارے کی جمالیات کن وسائل سے مرتب ہو رہی ہے۔ ہر فنکار کے ہاں مرتب ہونے والی جمالیات میں وسائل چاہے بہت معمولی سطحوں پر ہی سہی، بہت مختلف ہو جایا کرتے ہیں۔ ہم جنہیں بالعموم معمولی سمجھ کر نظر انداز ہو رہے ہوتے ہیں وہ اتنے معمولی بھی نہیں ہوتے، جس طرح انگوٹھے کی لکیریں معمولی سے ردو بدل سے ایک شخص کا دوسرے سے مختلف شناخت نامہ مرتب کرتی ہیں، بہ ظاہر ایک جیسے اور ایک جتنے اعضا کے مالک ایک الگ الگ شخصیت کا شناخت نامہ؛ بعینہ یہاں جمالیاتی وسائل کا یہی معمولی سا فرق ایک تخلیق کار کا تخلیقی شناخت نامہ مرتب کرتا ہے۔ ایک فکشن نگار کے ہر فن پارے کی جمالیات اپنے تخلیقی مزاج کے دائرے کے اندر مرتب ہوتی ہیں مگر وہ تخلیقی مواد کے پیش نظر اس کا مزاج بدل لیا کرتا ہے یوں جیسے ایک مصور پورٹریٹ بناتے ہوئے محض طے شدہ لکیروں کے بہاؤ میں ایک لرزش رکھ کر چہرے کے تاثرات بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ایک تخلیق کار کے ہاں برتے جانے والے فکشن کے جمالیاتی قرینوں کے گرد جو بڑا دائرہ بنتا ہے وہ اس کے اسلوب کا ہے۔

۳۔ اسلوب، فکشن کی تنقید کا بہت محبوب موضوع رہا ہے۔ جس طرح فکشن پڑھنے کا طبعی میلان نہ رکھنے والا فکشن سے حظ اٹھا سکتا ہے نہ اُس پر اس کی ترسیل ممکن ہے، بالکل اسی طرح، کسی فکشن نگار کا اُسلوب سمجھے بغیر اُس کے فکشن سے استفادہ ممکن نہیں ہے۔ یاد رہے ہر فکشن نگار اپنے تخلیقی عمل میں یہ اسلوب اپنے اسلوب حیات سے اخذ کرتا ہے۔ کہہ لیجیے اسلوب میں اکتساب کم کم اور خداداد صلاحیت کہیں زیادہ کام کر رہی ہوتی ہے۔ یہ اسلوب ہی ہے جو لکھنے والے کے ہاں گداز اور Pathos کی وہ لہریں رکھ دیتا ہے جو قاری کے دل کی دھڑکنیں قابو میں کر لیتی ہیں۔ یہیں میں یہ بھی کہہ دوں کہ فکشن لکھنے والا اپنے تخلیقی عمل میں ایک اور سطح وجود پر اپنی ذات کی دریافت بھی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ دریافت ہونے والی ذات زندگی کے عام ہنگاموں میں مصروفِ کار فرد کی شخصیت کا اظہار نہیں ہوتی بلکہ پوٹینشل کے اعتبار سے بہت مختلف اہم اور بھیدوں بھری ہوتی ہے جو ایک اسلوب کو یوں ڈھالتی ہے جیسے کسی سانچے میں کھولتی بہتی دھاپ کو ڈال کر ڈھال لیا جاتا ہے۔ ایک ہی زمانے میں رہنے والے، ایک جیسے موضوعات برتنے والے، ایک جیسے لسانی وسیلوں کو کام میں لانے والے، اسی اسلوب کے وسیلے سے تخلیقی سطح پر مختلف ہو جاتے ہیں؛ بالکل اس طرح، جیسے ایک ہی گھر میں، ایک ہی باپ کے نطفے سے، ایک ہی ماں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بچے مختلف ہو جایا کرتے ہیں۔ فکشن کی تنقید اس وقت تک فن پاروں کی ڈھنگ سے تفہیم کا فریضہ ادا نہ کر پائے گی جب تک اس اسلوب کو ڈھنگ سے آنکنے کے لائق نہ ہو گی۔

۴۔ ناقدین کی یہ بات بھی گرہ میں باندھنے کے لائق ہے کہ فکشن کا بیانیہ ایک زاویہ نظر کے تحت مرتب ہوتا ہے۔ لکھنے والا ایک زمانے میں اور ایک زمین پر اور ایک خاص مقام سے اور خاص نظر ایک منظر دیکھتا ہے۔ ایک ایسا منظر جس میں بہ حیثیت انسان اس کے لیے دلچسپی کا سامان موجود ہوتا ہے، یا اس منظر میں سے کچھ رِس رِس کر اُس کے وجود میں جذب ہو رہا ہوتا ہے؛ یوں ایک تناظر قائم ہوتا ہے۔ یہ تناظر ایسا ہے جو ایک تخلیق کار اور اُس کے ناقد کے ہاں عین مین قائم نہیں ہو پاتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایسا ہو پائے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ خود تخلیق کار اپنی تخلیق کو قاری کی حیثیت سے پڑھتے ہوئے بھی اس تناظر میں قدرے ترمیم کر لیتا ہے؛ تاہم ایسا نہیں ہے کہ اس تناظر کو کلی طور پر منہا کر کے نئے تناظر میں فن پارے کی زیادہ بہتر تفہیم کو ممکن بنا لیا جائے۔ فکشن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اپنی زمین پر پورے قدم جما کر چلتا ہے، اور اپنے زمانے میں پورے سانس لیتا ہے تاہم یہ سب ایسے قرینے سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی الگ اقدار مرتب کر لیتا ہے جو زماں و مکاں بدلنے سے بھی اپنی پہلی معنویت کو ترک کیے بغیر نئی معنویت کے لیے گنجائشیں پیدا کر لیتا ہے بالکل اس قدیم شاہکار فن پارے کی طرح جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اسی تخلیقی قدر کے سبب بہ ظاہر نئے زمانے سے اُچٹا ہوا اور اُکھڑا ہوا ہو کر بھی ہمیشہ بامعنی، زیادہ قیمتی اور لائق توجہ ہو جایا کرتا ہے۔

۵۔ فکشن کی تنقید کو ان تیکنیکی وسیلوں کو بھی آنکنا ہوگا جو ایک فکشن نگار کہیں تو تمثیل کی صورت متن میں مرتب کرتا ہے اور کہیں ماجرائی قرینے سے، کہیں وہ شعور کی رو کے پیچھے بگٹٹ دوڑتا ہے اور کہیں مونتاژ بناتا چلا جاتا ہے۔ خود کلامی وسیلہ ہوئی ہے تو کیوں؟ مکالمہ آیا ہے تو کیسے؟ اور کہانی کن وسیلوں سے ایک عام سے واقعے سے اُٹھ کر ایک گوں کے لوگوں، اُن کے دُکھ سکھ اور اُن کے رویوں کی علامت ہو گئی ہے۔ تخلیق کار نے روایتی پلاٹ کو برتا ہے یا اس کو توڑ کر اس میں نئے امکانات پیدا کر لیے ہیں۔

۶۔ بجا کہ فکشن کا معاملہ ایک زمانے اور ایک زمین سے ہوتا ہے مگر اس میں دیوار سے پرے جھانکنے اور وقت سے آگے دیکھنے کی للک اسے ماورائے حقیقت علاقوں اور زمانوں کی طرف بھی دھکیل دیتی ہے شاید اس لیے کہ فکشن نگار خلوص دل سے سمجھتا ہے کہ ماوراء بھی حقیقت کی ہی توسیع ہے اور کون جانے کب جسے ماورا سمجھا جا رہا ہے وہ حقیقت ہو جائے کہ وہ جو اقبال نے کہا تھا ''کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون''، تو ہم نے اس دمادم آنے والی صدا کے ساتھ کبھی ماورائے حقیقت سمجھے جانے والے مظاہر کو حقیقت میں بدلتے دیکھا ہے۔

اور آخر میں مجھے فکشن کی تفہیم کی تنقیدی ابجد جو سوجھ رہی ہے اس کی صورت یوں بنتی ہے:

الف۔ یہ سمجھنا ہوگا کہ اجتماعی سطح پر برتی ہوئی اور مسلی ہوئی مادی دنیا والی زندگی اور ایک سیدھ میں چلنے والی حقیقت جو تاریخ نگاروں اور وقائع نویسوں کو مرغوب ہو جایا کرتی ہے، اسے سمجھنے اور فکشن کی حقیقت کو سمجھنے کے قرینے جدا گانہ ہیں۔ بالعموم فکشن کی حقیقت کو گھڑی ہوئی سمجھ کر جھوٹ کے خانے میں رکھ لیا جاتا

باقی صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ کیجیے

خاص ملک، خاص لوگ، خاص علاج

حسن منظر
(کراچی)

تو صاحب بات ہو رہی ہے خاص لوگوں کے خاص علاج کی ضرورت کی۔ خاص لوگوں سے اگر مراد صاحبِ اقتدار لوگ ہیں تو آیئے دیکھتے ہیں پچھلی صدی کے دو اہم افراد کو زندگی کے آخری دور میں کیسا علاج نصیب ہوا تھا۔ مئوزے ذونگ جنہیں ہمارے ہاں عام طور سے ماؤزے تنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے چین کے موجودہ نظام کے بانیوں میں اعلیٰ ترین مقام رکھتے ہیں۔ اور وہاں کے عوام کے دلوں میں اُس سے بھی زیادہ۔ جہاں تک میرے علم میں ہے ان کا آخری مقابلہ نظام اعصاب کی بیماری Athyotropic Lateral Seletosis سے ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ پے در پے دل کے حملے سہہ چکے تھے۔ ان کے آخری علاج پر مقرر خود ان کے مہان دیس کے سولہ ڈاکٹر تھے اور چوبیس نرسیں۔ یعنی ان کے رتبے کے اعتبار سے وہاں کی حکومت نے ان کے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان کے بچنے کی امید تھی یا نہ تھی اس سے حکومت کو سروکار نہیں تھا۔ اور یہی چین کا ہر چھوٹا بڑا دیکھنا چاہتا تھا۔

جب صحت یابی کا عمل ایک جگہ رک کر رہ گیا تو حکومت نے فیصلہ کیا کہ اگر مزید بہتری کا امکان ہے اور وہ ہم نہ پہنچا سکے تو کیوں نہ کسی دوسرے ملک کے ماہر نیورولوجسٹ سے مشورہ لیا جائے۔

ویانا۔۔۔اوسٹریا۔۔۔ان کے ذہن میں بے وجہ نہیں آیا کیونکہ وہ نیورولوجی اور سائیکیٹر کا اعلیٰ مرکز ڈیڑھ دو سو سال سے رہا ہے اور آج بھی ہے۔ چنانچہ دعوت دینے پر ویانا سے ایک طائفہ ماہر معالجوں کا بیجنگ پہنچا۔ خیر مقدم کے بعد اُن ڈاکٹروں کو مئوزے دونگ کے برابر کے کمرے میں بیٹھا کر ان کے سامنے مریض کی بیماری اور علاج سے متعلق سارے کاغذات رکھ دیئے گئے۔ اس کے بعد مدعونین کو ضرورت ہی نہیں پڑی کہ پوچھتے فلاں ٹیسٹ ہوا ہے یا نہیں۔ کیا کیا دوائیں دی گئی ہیں یا کیوں دی گئیں اور کیا کچھ عملی طور سے کیا گیا ہے، یا نہیں کیا گیا۔

اُن دیکھنے کے لیے آنے والے ڈاکٹروں نے غور سے مریض اور مرض کی ہسٹری کو پڑھا۔ ریکارڈ کو کھنگالا، آپس میں گفتگو کی اور مقامی ڈاکٹروں سے۔ لیکن نہ انہوں نے پوچھا مریض کہاں ہے نہ انہوں نے عاجزی سے کہا، مریض کو نہیں دیکھیں گے؟ بالآخر انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا:

''اُس سے زیادہ مریض کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔''

مقامی ڈاکٹروں کی ٹیم نے معائنے کے لیے آنے والے ڈاکٹروں کا شکریہ ادا کیا اور فیس کی ادائیگی کے بعد غالباً بہترین شراب کی بوتلوں کے تحفے کے ساتھ انہیں رخصت کیا ہوگا۔

مئوزے دونگ چین میں حقیقی انقلاب لانے والے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ فلسفی اور ایک ہمدرد انسان۔ اس لیے مقبول عوام حاکم تھے۔ گو وہ نہ صدر تھے نہ وزیر اعظم۔ ان کی فکر نے ان گنت ملکوں کے عوام کو حقیقی انقلاب سے آشنا کیا۔ ماؤازم اس فکر کا نام ہے۔ ایک پَن چھلا نہیں کہ ہر سیاسی لیڈر کے نام کے ساتھ لگایا جا سکے۔ ان کا مشہور طویل سفر ''لانگ مارچ'' اور یونیفارم بھی گاہے گاہے ان لیڈروں کے کام آتا ہے جو انقلاب لانے کا وعدہ عوام سے کرتے ہیں لیکن جب جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کچھ بھی تو ملک میں نہیں بدلا ہے۔ وہی جاگیرداری کا جاگیرداری نظام ہے جو پہلے تھا۔

مئوزے دونگ کا انتقال ۹۔ستمبر ۱۹۷۶ء کو ہوا تھا۔ چین کے ہسپتال میں اور کسی نے نہیں کہا انہیں اس ایشیائی ملک میں بہترین علاج نصیب نہیں ہوا۔

بورس یلٹسن Boris Yeltsin موجودہ روس کے پہلے صدر، اس نوعیت کی اداسی کے مریض تھے جو کبھی مریض کے مزاج، جسمانی افعال اور گفتگو کو شدید نفی میں لے جاتی ہے اور وہ جیتے جی مردہ بن کر رہ جاتا ہے۔ کبھی ان مین ہی کے بے اندازہ بڑھ جانے کی وجہ سے وہ راتوں غیر ضروری کام میں لگا رہتا ہے اور ماتحتوں اور گھر والوں سے بھی یہی چاہتا ہے۔ اس کا ہنسی مذاق سب سے چلتا ہے وہ ناواقف جوان لڑکی ہو یا بوڑھی عورت۔ اُداسی سے نمٹنے کے لیے انہوں نے خود کو شراب نوشی کے حوالے کر رکھا تھا جو آگے چل کر ان کی جان کو لاحق خود ایک مرض بن گئی۔

موصوف کو کئی بار دل پے حملے بھی سہنے پڑے۔ یعنی ہارٹ اٹیک۔ ساتھ ہی سوویت یونین اور وہاں کی کیمونسٹ پارٹی کو ختم کرنے میں ان کا مرکزی کردار تھا۔ آخری صدر سوویت یونین گورباچیف کو بزور معطل کر کے انہوں نے روس کے صدر کا عہدہ سنبھالا تھا۔ امریکہ گئے جس نے انہیں جان و دل سے خوش آمدید کہا کیونکہ جو کام وہ ہزار کوششوں کے باوجود چوہتر سال میں نہیں کر سکا تھا وہ موصوف نے کر دکھایا۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ وہاں ایک لیکچر کے لیے گئے تو مدہوش تھے۔ یہی عمل دوبارہ ہوا جب واپسی پر یورپ میں ایک جگہ ائیر پورٹ پر صحافی اور سیاسی حضرات ان سے نیاز حاصل کرنے کے لیے موجود تھے اور یہ اس حد تک نشے میں غرق تھے کہ ہوائی جہاز سے باہر نہ آ سکے۔ آخیر میں جب وہ صدر تھے تو اکثر روپوش رہتے تھے۔

یہ سب تھا مگر نہ اداسی کا علاج تسلی بخش ہوا نہ دل کے حملوں کا کیونکہ شراب سے ہاتھ چھڑانا ان کے لیے ناممکن تھا۔ بالاخر انہیں زندہ رکھنے کے لیے دل کی سرجری ضروری قرار دی گئی۔ بائی پاس سرجری یعنی دل کی خون کی بند نالیوں کے لیے ثانوی نالیوں کو کام میں لانے کی۔ ماسکو کے سینٹرل ہسپتال میں یہ آپریشن روس کے ماہر دل کے سرجنوں کی ایک ٹیم نے کیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مریض

باقی صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ کیجیے

تلفظ کی گلکاریاں

سائرہ بتول (ڈاکٹر)
(اسلام آباد)

محی الدین تقی لکھنوی ابا کے دوست اور ہمارے چچا تھے۔ پیشے کے اعتبار سے حکیم،شوق کے اعتبار سے اردو لغت کے نقاد اور خاندان کے اعتبار سے بھاری بھرکم شجرہ نسب کا بار اٹھائے یک وتنہا۔ پیشے کا اثر یہ ہوا کہ تقی صاحب کی اردو میں معجون اور خمیروں کی خوشبوئیں رچ بس گئی تھیں۔ وہ اردو تو بہت شُستہ بولتے ،لیکن ان کی اُردو طبِ یونانی اور اجزائے مفردات کے بیاںیے سے خالی نہ ہوتی۔

ہم اُن کی اُردو دانی سے بہت متاثر تھے۔ ایک دن ہم نے معصومانہ انداز میں اتنا پوچھ لیا۔ چچا جان ہمیں اچھی نثر لکھنے کا طریقہ بتا ئیں انہوں نے ایسی بھاری بھرکم تقریر کرڈالی کہ ہمارے چودہ طبق روشن ہوگئے، ہوائیاں اُڑ گئیں، آنکھیں پھرنے لگیں۔ اُن کی حکیمانہ تقریر کی ابتدا کچھ یوں ہوئی۔

''ارے واہ! کیا بات کہی بٹیا! آپ نے تو جی خوش کر دیا۔ سب سے پہلی بات جب بھی کچھ لکھو، ہمیشہ موٹے موٹے الفاظ استعمال کیا کرو! اس سے تحریر میں وزن پیدا ہوتا ہے۔ لیکن موٹے الفاظ کا المیہ یہ ہے کہ ان کے موٹاپے کی وجہ سے جملوں کی نوک پلک خراب ہو جاتی ہے۔ تحریر کی نازکی کا تقاضا ہے جملے چست ہوں تا کہ مضمون کی صحت برقرار رہے۔ بعض لوگ ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں اس عمل سے بسا اوقات تخلیق کا نظام انہضام خراب ہو جاتا ہے اور اُسے کھٹی ڈکاریں آنے لگتی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ لفظوں کا چناؤ دیکھ بھال کر کیا جائے تا کہ امراض لغت ولسانیات سے بچا جا سکے۔ چلیے ! میں آپ کو بہترین نثر لکھنے کا ایک مجرب نسخہ بتا تا ہوں۔ ہر روز صبح سویرے چہل قدمی کے لیے باغ میں جایا کرو۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا سے دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ پھر دیکھئے گا ! کیسے خوشبودار فقرے برآمد ہوتے ہیں۔''

اگلے دن ،ہم نے چھٹی کی درخواست تقی صاحب کی نصیحت کی روشنی میں کچھ یوں لکھی:

''ناچیز کو رخصتِ یک روزہ کی حاجت ہے کہ چندکارہائے ضروریہ کی انجام دہی کا فریضۂ خانگی ادا کر کے اہلِ خانہ کی نظروں میں سرخرو ہوسکیں۔''

اگلے دن سکول پہنچے تو ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے کمرے میں پیشی ہوئی۔ آنکھوں سے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے قدرے نرمی سے کہا:

''لڑکی ! یہ درخواست تم نے لکھی ہے؟''

ہم نے کہا''جی!''

کہنے لگیں''دیکھو بیٹا! پڑھائی کی طرف توجہ دو! یہ عمر نہیں ایسی باتیں لکھنے کی۔ آج کل ماحول بہت خراب ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''

اُس دن ہم پر منکشف ہوا کہ گاڑھی اردو تو وہ لوگ لکھتے ہیں جن کا کردار مشکوک ہوتا ہے۔ اُس کے بعد کبھی گاڑھی اُردو لکھنے کی جرأت نہ کی لیکن اردو کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جُوں جُوں آپ زیادہ اردوداں بنتے جاتے ہیں یہ خود بخود گاڑھی ہوتی جاتی ہے۔ اُوپر سے اُردو کے الفاظ صحت کے اعتبار سے کبھی موٹے کبھی پتلے، کبھی بھاری کبھی ہلکے ہوتے رہتے ہیں۔ جبکہ اردو کے الفاظ کی ادائیگی کا قضیہ اپنی جگہ الگ مسئلہ ہے۔ گزشتہ دنوں ایک بچاری ٹی وی اینکر نے لفظ کتابچہ کو غلطی سے کُتّا بچہ پڑھ دیا تو اہلِ زبان میں ایک طوفان مچ گیا۔

یہاں اہلِ زبان سے ہماری مراد جناب انور مقصود یا کراچی کے اہلِ زبان ہرگز نہیں۔ مشاہدے کی بات ہے کہ انور صاحب اپنے تحریر کردہ الفاظ کو نئے معنی ومفہوم دینے کی غرض سے بسا اوقات اس قدر جسمانی مشقت سے گزرتے ہیں کہ اپنے تحریر کردہ جملوں کی کاٹ سے محظوظ نہیں ہو پاتے۔ شرکائے محفل کی لفظی ضیافت کے بعد گھر لوٹنے پر جب وہ اہلِ خانہ سے اس باب میں مدد کے طالب ہوتے ہیں تو گھر کے تمام لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ لفاظی ایک بہت ہی منفرد فن ہے اور اس فن کے ماہرین آج بھی لفاظی کے ذریعے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے رہے ہیں۔ چند روز قبل ایک مضمون ہماری نظر سے گزرا جس کا عنوان تھا:

''قبائے ملّت کا دامنِ چاک''

ہم نے ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ تقی صاحب کو یاد کیا اور اُن کے لیے ''اللہ بخشے والی'' مختصر دعائے مغفرت کے بعد رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ ہمارا دل ملول ہو گیا کہ اب وہ اُردو کہاں؟ کیسی مقفیٰ و مسجع لفاظی ہوا کرتی تھی۔ محمد حسین آزاد کی اردو سے کون واقف نہیں۔ اپنا مشہور مضمون ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' ان الفاظ کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔

''دنیا دورنگی زمانہ، عبرت ودید، حسرت ونس، بوقلمو، آئندو زندکا بازار ہے۔ کُس ونا کُس دوچار ہے۔ جسے دیکھا! آزاد نہ پایا۔''

ایک بار تقی صاحب نے بتایا کہ:

''اردو میں جو''نواب'' ہے، یہ اصل میں عربی کا لفظ''نوّاب'' ہے جس کا معنی ہے نائب۔''

آج سوچتے ہوں ٹھیک ہی کہتے تھے۔''عربی کا نائب اُردو کا نواب ہی تو ہے۔'' مشہور بات ہے کہ اردو، دوسری زبانوں کے الفاظ جلد قبول کر لیتی ہے۔ فارسی اور عربی کے الفاظ تو ایک زمانے میں اردو کو اپنا دوسرا گھر سمجھتے تھے۔ ایک مدت سے فارسی یا عربی نے اردو لفاظی پر کوئی التفات نہیں کیا۔ اُس زمانے میں اردو تھی بھی جھانسی کی رانی، جو اپنی شرائط پر لفظوں کو اپناتی تھی۔ کوئی اُٹ پٹا لفظ

ٹپک پڑتا تو جھٹ سے نکال باہر کرتی۔ اگر کسی لفظ کو قبول کر بھی لیتی تو اس کا حلیہ اور نین نقش ہی بدل دیتی۔ مثلاً عربی میں بقر، گائے کو کہتے ہیں جبکہ اردو میں بکرا ظاہر ہے بکرے کو ہی کہتے ہیں مگر عربی کی ''بقرعید'' یعنی گائے عید، اردو میں بکرا عید بن گئی۔

لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ آتے ہیں تو اُردو اُن کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کے بجائے اُن کے مزاج میں ڈھل جاتی ہے۔ ہماری ایک پڑوسن ''بھنڈی'' کو لیڈی فنگر کہا کرتی تھیں۔ ایک دن ہم نے ان سے کہا، آپ بھنڈی کو بھنڈی کیوں نہیں کہتیں؟ کہنے لگیں:

''کیا بتاؤں، یہ پنڈی کے لوگ لفظوں کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ ہر لفظ میں دونقطوں والی چھوٹی یے ڈال دیتے ہیں۔ اکثر ''بھنڈی'' کو بھینڈی'' کہہ کر اتنی لذیذ سبزی کا ذائقہ تباہ کر دیتے ہیں، اسی لیے میں نے اسے انگریزی میں ''لیڈی فنگر'' کہنا شروع کر دیا ہے۔

ہم نے کہا ''لیڈی فنگر کھانے سے آپ کا ذائقہ خراب نہیں ہوتا؟'' پھر ہم نے ہنستے ہوئے کہا:

''ویسے لاہور میں بھنڈی کو پھنڈی کہا جاتا ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں تلفظ کی ادائیگی کا تعلق دراصل بندے کی حسِ اختراع کے ساتھ ہے۔ تقسیم کے وقت ہندوستان کے پنجاب سے جو لوگ پاکستان آ کر آباد ہوئے ان کے ہاں زے کو جیم اور جیم کو زے پڑھنے کا عجب دستور پایا جاتا تھا کہ آپ جب تک لفظ کو سر کے بل اُلٹا کر کے ان کے سامنے نہ بولیں وہ سیدھا تلفظ نہ کر پاتے۔ ہمارے سکول میں ایک ماسی تھیں جو حاجی کو حازی اور نمازی کو نماجی کہتی تھیں۔ ہم نے لفظ الٹا کر بولنا سکھایا تو ان کا تلفظ خود بخود ٹھیک ہو گیا۔ اسی طرح ہماری ایک پٹھان کلاس فیلو ''جغادری پہلوان'' کو ''چہ قادری پلے وان'' کہتی اور چادر کو تاجر۔

سچ تو یہ ہے کہ ہر شخص کی اپنی الگ زبان ہوتی ہے جس کا مزاج، موسم اور ماحول کے مطابق ہوتا ہے یا یوں کہیے زمین سے جڑا ہوتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی شخص اردو کے تلفظ کو خراب کر رہا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کے ہر لفظ کا منفرد پس منظر ہوتا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ آپ نے کسی ناول میں ایک نیا لفظ پڑھا، جس کی اصل ادائیگی سے آپ واقف نہیں تھے تو آپ اسے اپنی طرف سے ایک نئی ادائیگی عطا کر دیتے ہیں۔ ہم خود عمران سیریز کے زمانے میں ''طُوطی بولنے'' کو ''طوطی بولنا''، ''مِن وعن'' کو ''مَمَن عن''، ''روسی نژاد'' کو ''روسی نثراد'' اور ''بھیانک'' کو ''بھیا نک'' پڑھتے تھے۔ البتہ صورتحال اُس وقت دلچسپ ہو جاتی ہے جب کوئی سنے ہوئے الفاظ بھول جائے اور ضرورت پیش آنے پر اضطراری حالت میں خود سے نئے الفاظ کا چناؤ کر لے! جیسے ایک دوست نے ہمارے سامنے اپنی بچی سے کہا:

''بیٹا! آنٹی کو چار آسمانی کتابوں کے نام بتاؤ!''

بچی نے جھٹ پٹ زبان تالو سے ملا کر:

''تورات، زبیر، انجیر اور پاکستان'' کہہ ڈالا۔

پرانے محلّے میں ایک میاں بیوی رہتے تھے جن کے ہاں اولاد نہیں تھی، اہلِ محلّہ اکثر اُن کی دل جوئی کیا کرتے۔ تقسیم کے وقت سفرِ پاکستان کے دوران ان کی شادی ہوئی اس لیے اُن کی محبت اپنے آپ میں ایک انمول کہانی تھی۔ راستے میں مہاجرین کو دولہا دلہن کا نام یاد نہ رہتا تو دلہن کو ''اُری'' اور دولہا کو ''دُولہا'' کہہ کر پکارا جانے لگا۔ وقت کے ساتھ دلہن ''اُری''، ''اری باجی'' بن گئیں اور ''دولہا''، ''دولہا بھائی''۔ دونوں میاں بیوی پان کثرت سے کھاتے تھے اور گلوریاں ہر وقت ان کے گالوں میں دبی رہتیں۔ چنانچہ ان کی اردو میں گلوریت کا عُنصر کچھ یوں نمایاں ہو کر ابھرا کہ بلبل کو بُلابل، گلاس کو غلاس، پانی کو فانی، مصیبت کو نصیبت اور نہیں کو نئیں کہتے تھے۔

تقی صاحب کے ہاں رعایت نام کو نہ تھی لیکن وہ بھی اری باجی اور دولہا بھائی کی اُردو پر گرفت کرنے کے بجائے ہنستے رہتے۔ ہم نے ایک دن تقی صاحب سے پوچھا:

''آپ اری باجی اور دولہا بھائی کے تلفظ پر گرفت نہیں کرتے جبکہ ہمارے ہر لفظ کی پکڑ کرتے ہیں؟''

تقی صاحب پہلے زور سے ہنسے پھر اونچی آواز میں کہنے لگے:

''گڑیا! اُن کے جیسی اُردو بول کر تو دکھاؤ! وہ تو شکر پارے گھولتے ہیں۔ وہ تو زبان کو اس کے اصل امّی لہجے میں بولتے ہیں۔ اب تم صحنِ چمن میں بھینسا باندھ دو گی تو ہمیں اچھا تھوڑی لگے گا؟''

کبھی سوچتی ہوں دنیا میں تقی صاحب نہ ہوتے تو میں آج شاعرہ ہوتی۔ انہوں نے نہایت دلجمعی کے ساتھ ہماری شاعرانہ صلاحیتوں کی دل شکنی بلکہ جگر شکنی کی کہ اب تو کسی اور کا شعر بھی اس وقت تک نہیں پڑھتی جب تک اُسے تقی صاحب کی مرحوم نگاہوں سے نہ دیکھ لوں! ایک بار ہم نے پورا دن لگا کر غالب کی زمین میں غزل لکھی۔ شام کو تقی صاحب تشریف لائے تو ہم نے پُرجوش انداز میں غزل پیش کی۔ چپ چاپ بیٹھ کر سُنتے رہے۔ جب ہم غزل سنا چکے تو ابّا کی طرف چہرہ گھما کر بولے:

''غالب کی شاعری آج کل بہت انڈے دے رہی ہے، ڈرتا ہوں کہیں ان میں سے بچے ہی نہ نکل آئیں۔ آپ کی لڑکی کو بحور و اوزان کا کچھ علم نہیں اور غالب کی زمین میں غزل لکھ لائی ہے۔''

ابّا نے ہنستے ہوئے کہا ''تقی صاحب! بچی ہے۔ آپ حوصلہ افزائی کریں گے تو سیکھ جائے گی۔''

کہنے لگے ''نہ سیکھے تو اچھا ہے۔ سیکھے ہوئے بھی بھلا کبھی شاعر بنے ہیں۔''

تقی صاحب بعض اوقات ایسے الفاظ استعمال کرتے جو ہم نے اس

باقی صفحہ ۸۷ پر ملاحظہ کیجیے

ایک صدی کا قصّہ

طلعت محمود

دیپک کنول (ممبئی)

اشوک کمار، کشور کمار، پردیپ کمار، راج کمار، دلیپ کمار۔ یہ وہ دور تھا جب فلم انڈسٹری میں کماروں کا ایسا بول بالا تھا کہ ہر کلاکار اپنے نام کے ساتھ کمار جوڑ دیتا تھا۔ایک ایسا ہی گلوکار تھا جس نے اپنا نام بدل کر تپن کمار رکھ دیا۔تپن کمار نے اپنی مخملی آواز سے بنگالی فلم میں دھوم مچائی تھی۔اُس زمانے کے چوٹی کے سنگیت کار انل بسواس نے اسکے یہ گانے سنے۔انل بسواس خود بھی بنگالی تھے اسلئے یہ بنگالی گانے سن کر وہ اس گلوکار کی آواز کے دیوانے ہوگئے۔وہ اُن دنوں فلم ''آرزو'' پر کام کر رہے تھے جسمیں عظیم اداکار دلیپ کمار اور کامنی کوشل کام کر رہے تھے۔انل بسواس نے تپن کمار کو دلیپ کمار کے لئے گوانے کا فیصلہ کیا۔تپن کمار کو دوبار بلایا گیا مگر وہ انل بسواس سے نہیں ملا۔تیسری بار انل بسواس اُس سے خود ملنے گیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے آپ کو اتنا بڑا گلوکار سمجھتا ہے کہ میرے دوبار بلانے پر بھی مجھ سے ملنے نہیں آئے۔اصل میں اُسکے یار دوستوں نے اُسے ڈرا کے رکھا تھا کہ ایک بار اگر تم انل بسواس سے ملو گے تو وہ تمہیں دیکھتے ہی رد کردے گا کیونکہ تمہاری آواز میں جو لرزش ہے وہ تمہاری گائیکی میں سب سے بڑی رکاوٹ پیدا کرسکتی ہے۔۔وہ جب انل بسواس کے سامنے پیش ہوا تو انل بسواس نے اُسے دھن سمجھائی اور پھر اُس کے ہاتھ میں گانا تھمادیا۔گانے کے بول تھے۔''اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو'' اُسے دوستوں کی کہی ہوئی بات یاد تھی اسلئے جب وہ ریکارڈنگ روم میں گیا تو وہ اپنی مخملی آواز میں نہ گاکر اس گانے کو سہگل کے انداز میں گانے لگا۔انل بسواس نے جب تپن کمار کی آواز سنی تو وہ چکرا کے رہ گئے۔اُسنے فوراً ریکارڈنگ روکنے کا حکم دیا اور تپن کمار کو باہر بلایا۔انل بسواس دکھ اور حیرت سے تپن کمار کی طرف دیکھ کر بولے۔تم کون ہو؟ تپن کمار نے کہا کہ میں طلعت محمود ہوں۔انل بسواس نے غصے سے کہا کہ تم طلعت محمود ہو ہی نہیں سکتے تم کوئی بہروپیہ ہو۔طلعت کی آواز میں جو لرزش ہے وہ تمہاری آواز میں ہے ہی نہیں۔طلعت نے شرمسار ہو کے کہا کہ بات یہ ہے کہ اُسے دوستوں نے ڈرا کے رکھا تھا کہ انل دا کے سامنے یہ آواز نہیں چلے گی۔وہ تم کو پہلی ہی ملاقات میں رد کردیں گے اسلئے میں نے اپنی آواز بدل ڈالی۔انل دا نے مسکرا کے کہا کہ میں نے تمہیں تمہاری آواز کی اُسی لوچ اور لرزش کی وجہ سے پسند کیا۔اُسکے بعد طلعت محمود نے اُسی مخملی آواز میں اپنا گانا ریکارڈ کیا جس نے طلعت محمود کو کامیابی سے ہمکنار کردیا۔

طلعت محمود نے لکھنو کے ایک قدامت پسند گھرانے میں 24 فروری 1924 کو جنم لیا۔تین بھائی بہنوں کے بعد یہ اُنکی چوتھی سنتان تھی۔طلعت نے جب ہوش سنبھالا تو اُسکا رجحان ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کی طرف بڑھنے لگا۔جہاں کہیں سنگیت کی محفل ہوتی تھی وہ رات بھر بیٹھ کے ان کلاسیکل گلوکاروں کو سنتا تھا۔اُسکے والد منظور محمود کو اُسکا یہ شوق پسند نہیں تھا۔وہ اُسے موسیقی سے دور رکھنے کی کوشش کرتا مگر طلعت کہاں ماننے والا تھا۔اُسنے تو سنگیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔گھر میں ایک بوا تھی جسے اُسکی آواز کی لرزش کافی پسند تھی۔وہی اُسکا حوصلہ بڑھاتی تھی۔اُسنے چھ سال کی عمر میں لکھنو کے مارس کالج آف میوزک میں داخلہ لے کر پنڈت ایس سی آر بٹ سے سنگیت کی تربیت حاصل کی۔وہ تین سال تک اُسکی تلمذی میں رہا۔طلعت آل انڈیا ریڈیو لکھنو کے ساتھ ساتھ پرانے لکھنو میں اُن دکانوں کا روز طواف کرتا تھا جہاں کے ایل سہگل کے غزلوں کے ریکارڈ بجتے تھے۔وہ پاگل پن کی حد تک کے ایل سہگل کی آواز کا دیوانہ تھا۔

1939 میں اُسنے اپنے کیریر کا آغاز کیا۔وہ آل انڈیا ریڈیو لکھنو پر باقاعدہ گانے لگا۔داغ، جگر اور میر کی غزلوں کو اُسنے لے بخشی۔اُسکی آواز میں جو انفرادیت اور دلکشی تھی وہ اُسے دوسرے گلوکاروں سے منفرد اور ممتاز بناتی تھی۔والد نے اُسکے سامنے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ اس گھر میں رہنا چاہتا ہے تو اُسے دو میں سے ایک کو چننا ہوگا۔گھر یا گائیکی۔طلعت نے سنگیت کو چنا اور گھر چھوڑ دیا۔اُن ہی دنوں ایچ ایم وی ریکارڈنگ کمپنی نئے گلوکاروں کی تلاش میں تھی۔اُنہوں نے طلعت کے گانے سنے تو وہ اُسکی گائیکی سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے اُسے تین گانوں کے لئے معاہدہ بند کیا۔پہلی غزل ''سب دن ایک سمان نہیں'' تھی۔اتفاق سے اُس زمانے کے مشہور گلوکار اور سنگیت کار پنکج ملک ریکارڈنگ میں موجود تھا۔وہ اُسکی آواز سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسنے اُسے اپنی اگلی فلم میں گانے کے لئے سائن کرنے کی پیشکش کی۔طلعت محمود کی تعلیم جاری تھی اسلئے اُسنے پنکج ملک کی پیشکش ٹھکرادی اور ریکارڈنگ ختم کرتے ہی لکھنو لوٹ گیا۔طلعت محمود ایچ ایم وی کے لئے باقاعدہ غزلیں ریکارڈ کرتا تھا۔اُسکی غزل ''تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی'' اسقدر مقبول ہوئی کہ فلم انڈسٹری کے بیشتر سنگیت کاروں کے کانوں میں رس بھر گیا۔اس بار جب وہ کلکتہ پہنچا تو سیدھے پنکج ملک سے ملا اور اُسے اُسکی پیشکش یاد دلادی۔پنکج ملک نے بھی اپنا وعدہ نبھایا اور اُسنے طلعت کو نیو تھیٹرس میں ایک ملازم کی حیثیت سے بھرتی کیا۔یہاں پر اُسکے من کی مراد پوری ہوئی۔اُسے اپنے آئیڈیل کے ایل سہگل سے ملنے کا موقع ملا۔اس خوبرو نوجوان کو بہت جلد کلکتہ فلم انڈسٹری کی طرف سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔صرف گانا گانے کے لئے نہیں بلکہ فلموں میں اداکاری کرنے کے لئے بھی۔اسنے اپنا نام بدل کر تپن کمار رکھ دیا۔پہلی فلم ''راج لکشمی''، تھی جسمیں اُسکی ہیروئن کانن دیوی تھی۔یہ فلم 1945 میں ریلیز ہوئی۔اسکے بعد 1947 میں آئی ''تم اور میں''۔اس فلم میں کانن دیوی کے ساتھ کانن بالا بھی تھی۔پھر 1949 میں آئی ''سمپتی''، جسکی ہیروئن بھارتی دیوی تھی۔اُسکا پہلا فلمی گانا ''جاگو مسافر جاگو''، فلم ''راج لکشمی کے لئے تھا۔بہت جلد لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ تپن کمار اور طلعت محمود ایک ہی ہیں۔بطور گلو

کار اُسنے جو شہرت حاصل کی تھی فلمساز اُسے بھنانے کے لئے کریڈٹ ٹائٹل میں اُسکا نام تپن کمار کے آگے بریکٹ میں طلعت محمود بھی دینے لگے۔

طلعت محمود نے تپن کمار کے نام سے بنگالی میں بے شمار گانے گائے جو کافی مقبول ہوئے۔ چالیس کی دہائی میں کلکتہ فلم انڈسٹری دھیرے دھیرے بمبئی منتقل ہو رہی تھی۔ تپن کمار بھی کلکتہ شہر کو الوداع کہہ کے بمبئی چلا آیا۔ اُسنے سوچا کہ کیوں نہ یہاں قسمت آزمائی جائے۔ یہاں آنے سے پہلے اُسکے چالیس سے زیادہ گانے ریکارڈ ہو چکے تھے جن میں فلمی نغموں کے ساتھ ساتھ اُسکی غزلیں بھی شامل تھیں۔ یہاں آ کر اُسے کسی نے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اکثر موسیقاروں کا یہ ماننا تھا کہ طلعت ابھی نا تجربہ کار ہے۔ وہ اس نوسیکھیے گلوکار پر داؤ لگانا نہیں چاہتے تھے۔ انل بسواس جو کہ چوٹی کا سنگیت کار تھا اُسنے طلعت کی غزل ''تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی'' سنی تھی اور اُسے اُسکی آواز نے کافی متاثر کیا تھا۔ وہ اُسے فلم ''آرزو'' کے لئے سائن کرنا چاہتا تھا۔ اُسنے اُسے دو بار پیغام بھیجے مگر طلعت انل بسواس سے ملا نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پیاسا اپنی پیاس بجھانے کے لئے کنویں کے پاس جاتا ہے۔ یہاں تو کنواں ہی پیاسے کے پاس چلا آ رہا تھا اور پیاسا کنویں سے دور بھاگتا جا رہا تھا۔ اصل میں طلعت کو اُسکے یار دوستوں نے انل بسواس کے بارے میں اتنا ڈرا کے رکھا تھا کہ وہ اُس سے ملنے کی ہمت ہی نہیں کر سکا۔ تیسری بار انل بسواس خود اُس سے ملنے چلا گیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا تم اتنے بڑے گلوکار بن چکے ہو کہ میرے دو بار بلانے پر بھی تم مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ میں تمہیں اپنی آنے والی فلم ''آرزو'' کے لئے سائن کرنا چاہتا تھا۔ طلعت نے جواب میں کہا کہ میں یہ سوچ کر نہیں ملا کہ آپ مجھے رد کر دو گے۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود انل بسواس نے طلعت محمود کو چانس دیا۔ ریکارڈنگ میں طلعت نے پہلے کے ایل سہگل کے انداز میں گانے کی کوشش کی جس پر انیل دا کافی برہم ہوئے۔ اُسے ریکارڈنگ روم سے باہر بلا کر اُنسے طلعت کو پہلے ڈانٹا اور پھر اُس سے کہا کہ تمہاری آواز میں جو لرزش ہے وہی تمہاری خوبی ہے۔ مجھے اُسی لرزش کے ساتھ یہ گانا ریکارڈ کرنا ہے۔ اب کے طلعت نے اپنی اصلی آواز میں گانا ریکارڈ کیا۔ گانا تھا ''اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو۔'' یہ گانا دلیپ کمار پر فلمبند ہوا۔ ''آرزو'' 1950 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کی ریلیز کے ساتھ طلعت کی تقدیر بدل گئی۔ اس گانے کی مقبولیت نے اُسے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

اصل میں طلعت محمود کو پہلا بریک دینے والی موسیقارہ بلوسی رانی تھی جس نے اُسے فلم ''جوگن'' میں پہلا گیت گوایا تھا۔ گانے کے بول تھے ''سندرتا کے سبھی شکاری''۔ یہ فلم ''آرزو'' کے بعد ریلیز ہوئی۔ دوسرا بریک اُسے موسیقار ونود نے فلم ''انمول رتن'' کے لئے اُسکا گانا ''جب کسی کے رخ پہ'' ریکارڈ کر کے دیا تھا۔ یہ فلم 1949 میں ریلیز ہونی چاہیے تھی مگر بدقسمتی سے یہ فلم بھی 1950 میں ''آرزو'' کے بعد ریلیز ہوئی اس طرح پہلا بریک کا سہرا انل بسواس کے سر جاتا ہے۔ اسی بیچ طلعت نے سن 1951 میں ایک کرسچن لڑکی لتکا ملک سے شادی کی جو کہ فلموں میں چھوٹے موٹے رول کرتی تھی۔ وہ طلعت کی آواز کی دیوانی تھی۔ بعد میں لتکا نے اپنا نام بدل کر نسرین رکھ لیا۔ اُنکے دو بچے ہوئے۔ خالد اور سبینا۔

طلعت محمود انل بسواس کو اپنا مربی مانتا تھا کیونکہ اُس نے ہی طلعت محمود کو کے ایل سہگل کے اثر سے باہر نکالا تھا۔ انل بسواس ایک پارکھ تھا۔ اُسنے لتا منگیشکر کو بھی نور جہاں کے اثر سے باہر نکالا تھا۔ لتا جب اُس سے ملی تب وہ نور جہاں کی کاپی کرتی تھی۔ اُسنے ایک دن اُس سے کہا کہ تم نور جہاں دوم کیوں بننا چاہتی ہو؟ تم لتا منگیشکر نمبر ون کیوں نہیں بننا چاہتی۔ لتا منگیشکر کو انل بسواس کی یہ بات دل کو چھو گئی اور وہ نور جہاں کے اثر سے باہر آ گئی اور اُسنے اپنی آواز کے دم پر اپنا ایسا مقام بنا لیا جسے اب تک کوئی پار نہیں کر پایا۔ یہی طلعت کے ساتھ بھی ہوا۔ اُسنے بھی تھوڑے ہی دنوں میں اپنی پہچان بنا لی اپنی مخملی آواز کے دم پر۔ اب بڑے بڑے سنگیت کاروں کی پسند بنتا جا رہا تھا۔ ان میں نوشاد علی، ایس ڈی برمن شنکر جے کشن، مدن موہن، سی رامچندرا اور روشن تھے۔ نوشاد صاحب اور طلعت محمود ایک ہی شہر کے تھے۔ اُسنے طلعت محمود کو فلم ''بابل'' کے لئے سائن کیا۔ ایک دن جب وہ ''بابل'' کے لئے گانا ریکارڈ کرنے والے تھے نوشاد نے طلعت محمود کو ریکارڈنگ روم کے باہر سگریٹ نوشی کرتے دیکھا۔ وہ اُسکی اس حرکت سے اسقدر برہم ہو گئے کہ اُس کے بعد اُس نے طلعت محمود سے کوئی گانا نہیں گوایا۔ اُسکی جگہ محمد رفیع آ گئے۔ طلعت محمود بھی اتنا خوددار آدمی تھا کہ اُس نے کبھی نوشاد صاحب سے کام نہیں مانگا۔ اسی بیچ اُسے ایس ڈی برمن کا ساتھ ملا۔ اُس نے اُس سے بہت سارے گانے گوائے جو سپر ہٹ رہے۔ اسی طرح شنکر جے کشن نے طلعت سے کچھ لاجواب گانے گوائے۔ فلم ''داغ'' اور ''پتیتا'' کو کون بھول سکتا ہے۔ مدن موہن طلعت محمود کو بیحد پسند کرتا تھا۔ مدن موہن جے اوم پرکاش کی فلم ''جھرنا'' کی موسیقی ترتیب دے رہا تھا۔ جے اوم پرکاش کو خبر ملی کہ مدن موہن طلعت محمود سے ہیرو کے گانے گوانا چاہتا ہے تو وہ کافی ناراض ہوئے۔ اُسنے مدن موہن سے کہا کہ وہ طلعت سے گانے گوانے کے حق میں نہیں ہے۔ وہ کسی اور سنگر کو لے کے آئے۔ مدن موہن بضد تھا کہ اس فلم کے گانے طلعت ہی گائے گا جب کہ جے اوم پرکاش بھی جھکنے کے لئے تیار نہ تھا۔ معاملہ اسقدر اُلجھ گیا کہ مدن موہن نے جے اوم پرکاش سے کہا کہ وہ یہ فلم چھوڑ رہا ہے۔ وہ کسی نئے موسیقار سے کام کروائے۔ اوم پرکاش مدن موہن کے اس فیصلے سے دم بخود رہ گیا۔ وہ مدن موہن کو کھونا نہیں چاہتا تھا اسلئے اُس نے مدن موہن کے سامنے سر خم کیا اور اُسے طلعت سے گانے گوانے کی اجازت دی۔ جب فلم ریلیز ہوئی اور اسکے گانوں نے دھوم مچائی تو جے اوم پرکاش مدن موہن سے ملنے اُسکے گھر گیا اور اُس سے معافی مانگی۔ سالوں بعد نوشاد علی نے فلم ''آدمی'' میں دلیپ کمار کے اصرار پر طلعت سے گانا گوایا مگر منوج کمار نے نوشاد علی پر دباؤ ڈالا کہ وہ یہ گانا مہندر کپور سے گوائے۔ یہ گانا پہلے ہی طلعت کی آواز میں ریکارڈ ہو چکا تھا۔ نوشاد منوج کمار کے دباؤ میں آ گئے اور اُسنے فلم کے لئے مہندر کپور کی آواز میں دوبارہ گانا ریکارڈ کروایا۔ اس معاملے میں مدن موہن کے حوصلے کی تعریف کرنی ہوگی جو طلعت کے لئے فلم چھوڑنے کے لئے تیار تھا۔

طلعت محمود بڑی تیزی کے ساتھ کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔ بہت سارے فلمسازوں کا اصرار تھا کہ وہ گانے کے ساتھ ساتھ فلم میں کام بھی کرے۔ اُسنے دیو آنند مدھو بالا اور پریم ناتھ کی فلم ''آرام'' میں مہمان اداکار کے طور پر کام کیا۔ اس فلم کی موسیقی انل بسواس نے ہی ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے ریلیز کے دو سال بعد اے آر کاردار نے اُسے اپنی فلم ''دل نادان'' کے لئے بطور ہیرو سائن کیا۔ اسکے مدمقابل شیاما تھی۔ اُسکے بعد اُسے بہت ساری فلموں میں کام کرنے کی آفرس ملیں۔ ان فلموں میں کام کرنے سے اُسکی گائکی پر بہت برا اثر پڑا۔ اسی بیچ بمل رائے سجاتا بنا رہے تھے۔ اسمیں ایک گانا تھا۔ ''جلتے ہیں جس کے لئے تیری آنکھوں کے دئے'' اس فلم کے موسیقار ایس ڈی برمن تھے۔ برمن دا یہ گانا محمد رفیع سے گوانا چاہتے تھے۔ بمل رائے کی ضد تھی کہ یہ گانا طلعت محمود ہی گائے گا۔ طلعت محمود اس سے پہلے فلم ''دیوداس'' کے لئے گا چکا تھا۔ ایس ڈی برمن کو بمل دا کا حکم ماننا پڑا۔ اسی بیچ بمل رائے نے اپنی نئی فلم ''مدھومتی'' کی تیاری شروع کی تھی۔ سلیل چودھری جب اسکے گانے بنا رہا تھا تو دلیپ کمار نے بمل رائے سے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ ''سہانا سفر اور یہ موسم حسین'' طلعت کی آواز میں ریکارڈ کیا جائے۔ طلعت محمود سے رجوع کیا گیا۔ اُسنے یہ گانا گانے سے معذرت ظاہر کی۔ اُسنے سلیل چودھری سے درخواست کی کہ وہ یہ گانا مکیش سے گوائے کیونکہ وہ اس وقت مالی بحران سے گزر رہا ہے۔ جب مکیش کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ رو پڑا۔ ایسا دل پایا تھا طلعت محمود نے۔

طلعت محمود نے سبھی اسٹارس کو اپنی آواز دی ہے۔ اُسنے دلیپ کمار کے لئے کئی فلموں میں پلے بیک دیا۔ دلیپ صاحب کے لئے طلعت محمود کی آواز بڑی موزوں سمجھی جاتی تھی۔ جسطرح مکیش راج کپور کی آواز بن کے رہ گیا تھا اسی طرح طلعت محمود کی آواز دلیپ صاحب کی آواز سے میل کھاتی تھی۔ کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ دلیپ کمار کی آواز نہیں ہے۔ اُس نے دلیپ صاحب کے لئے فلم ''آرزو'' ''سنگدل'' ''بابل'' ''شکست'' ''فٹ پاتھ'' ''ترانہ'' اور ''داغ'' کے لئے پلے بیک دیا۔ ''فٹ پاتھ'' کا گانا ''شام غم کی قسم آج غمگین ہیں ہم'' کون بھول سکتا ہے۔ اس گانے کو ریکارڈ کرنے میں تین دن لگے۔ اس فلم کے موسیقار خیام کا کہنا ہے کہ وہ تین دن تک طلعت کو ریکارڈنگ میں بلاتے رہے۔ اس گانے میں صرف تین سازوں کا استعمال کیا گیا۔ یہ گانا آج بھی دل کو چھو لیتا ہے۔ اسی طرح اُس نے راج کپور کے لئے اپنی آواز کا استعمال کیا۔ فلمیں تھیں ''آشیانہ'' ''انہونی'' اور ''بے وفا''۔ اشوک کمار کے لئے اُسنے صرف ایک فلم ''نو بہار'' میں پلے بیک دیا۔ دیو آنند کے لئے اُسنے ''ٹیکسی ڈرائیور'' اور ''ارمان'' میں گانے گائے۔ بھارت بھوشن کے لئے بھی اُسنے کئی فلموں میں پلے بیک دیا۔ موسیقار سردار ملک طلعت محمود سے ایک گانا گوانا چاہتا تھا۔ طلعت نے گانا گانے سے انکار کر دیا۔ سردار ملک طلعت سے ملا اور اُس سے کہا کہ یہ گانا مجاز لکھنوی نے لکھا ہے تو وہ فوراً گانا گانے کے لئے تیار ہو گیا لکھنؤ واسیوں کے لئے اُسکے دل میں بڑی عزت تھی۔ گانا تھا ''اے غم دل کیا کروں، وحشت دل کیا کروں''۔ یہ گانا بیحد مقبول ہوا۔

شکیل بدایونی نے مرنے سے پہلے اپنی ساری غزلوں کے حقوق طلعت محمود کے نام منتقل کر دئے۔ اُسکے بیٹے خالد کا کہنا ہے کہ جب میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ اُس نے یہ غزلیں محمد رفیع کو کیوں نہیں دیں جب کہ شکیل بدایونی کے بیشتر گانے نوشاد کی موسیقی میں محمد رفیع نے ہی گائے ہیں۔ کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ دونوں کا تعلق اُتر پردیش سے ہے یا اسکی وجہ آپکا بہترین اُردو تلفظ ہے۔ طلعت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس وہ مسکرا کے رہ گئے۔

طلعت محمود خود کے ایل سہگل کا پرستار تھا۔ اُسکا ماننا تھا کہ قدرت نے ساری مٹھاس اور سوز اُسکے گلے میں ڈال دیا ہے۔ وہ سہگل کے گانے اکثر گایا کرتا تھا۔ اُسکا سب سے پسندیدہ گانا ''اب میں کیا کروں کدھر جاؤں'' فلم ''دھرتی ماتا'' کا تھا۔ اُسے اس بات پہ فخر تھا کہ جب کے ایل سہگل فلم ''بڑی بہن'' کا گانا ''اے کاتب تقدیر مجھے اتنا بتا دے'' کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی تو وہ اسٹوڈیو میں موجود تھا۔ وہ سہگل کی گائکی کا اسقدر دیوانہ تھا کہ اُس نے سہگل کے سبھی گانے خرید کے گھر میں رکھ لئے تھے اور جب بھی وقت ملتا تھا وہ ان گانوں کو سنتا اور پھر ان گانوں کو گنگنانے لگتا تھا۔ ایک بار ایک اخبار کا رپوٹر اُس سے انٹرویو لے رہا تھا۔ اُسنے طلعت محمود سے پوچھا کہ کیا آپ کو اس بات کا افسوس ہے کہ جو گانا کسی اور گلوکار نے گایا وہ آپ نے کیوں نہیں گایا تو طلعت نے جواب میں کہا کہ اُسے اس بات کا کوئی ملال نہیں۔ البتہ ''آنند'' کا گانا ''کہیں دور جب دن ڈھل جائے'' بہت اچھا لگتا ہے۔ رپوٹر نے اُنہیں انل بسواس کا ایک انٹرویو یاد دلایا جس میں انل دا نے کہا تھا کہ ہزاروں مکیش پیدا ہو سکتے ہیں دوسرا طلعت پیدا نہیں ہو سکتا۔ طلعت محمود نے انل بسواس کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ مکیش کو بہترین گلوکار مانتے تھے۔

طلعت محمود نے چودہ فلموں میں ایکٹنگ کی۔ اُس نے اپنے زمانے کی مشہور اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا۔ کلکتہ میں بننے والی تین فلموں کا پہلے ہی زکر ہو چکا ہے۔ بمبئی میں اُسنے دیو آنند اور مدھو بالا کی فلم ''آرام'' میں کام کیا۔ اس فلم کا گانا ''شکریہ، شکریہ اے پیار تیرا'' اپنے زمانے میں کافی مقبول ہوا تھا۔ ''ٹھوکر'' میں اُس نے شمی کپور کے ساتھ کام کیا تھا۔ ''دل نادان'' میں اُسکی ہیروئن شیاما اور ایک نئی لڑکی پیس کنول تھی۔ فلم ''ڈاک بابو'' میں اُسکی ہیروئن نادرہ تھی۔ یہ فلم 1954 میں ریلیز ہوئی تھی۔ اسکا گانا ''رات نے کیا کیا سپنے دکھائے'' آج بھی سننے والوں کے دل میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ اسی سال اُسکی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''وارث'' تھا۔ اس فلم میں اُسکے ساتھ ثریا اور نادرہ تھی۔ 1955 میں فلم ''رفتار'' ریلیز ہوئی جسمیں ہیروئن نادرہ تھی۔ 1956 میں فلم ''دیوالی کی رات'' نمائش کے لئے پیش کی گئی جس میں اُسکے مدمقابل روپ مالا اور ششی کلا تھی۔ 1957 میں فلم ''ایک گاؤں کی کہانی'' منظر عام پر آ گئی جس کی ہیروئن مالا سنہا تھی۔ 1958 میں اُسکی تین فلمیں ریلیز ہوئیں ''لالہ رخ'' ''مالک'' اور ''سونے کی چڑیا''۔ ہیروئینیں شیاما، ثریا اور نوتن تھیں۔ ''سونے کی چڑیا'' کا یہ گانا

''پیار پر بس تو نہیں لیکن۔یہ بتادے میں تجھے پیار کروں کہ نا کروں؟'' آج بھی دلوں کا برمادیتا ہے۔

1960 کے بعد موسیقی کا مزاج ہی بدل گیا تھا۔فلمی دنیا میں نئے نئے ہیروز وارد ہو چکے تھے، جب کہ پرانے ہیرو یا تو پردہ سیمیں سے غائب ہو چکے تھے یا کریکٹر رول کرنے لگے تھے۔موسیقی کا سنہرا دور چلا گیا تھا۔اب جبکہ ہندوستانی فلمی موسیقی میں مغربی موسیقی کا اثر بڑھ گیا تھا۔طلعت کے لئے اس بدلاؤ میں کوئی جگہ نہیں تھی۔طلعت کو بیشتر موسیقاروں نے فراموش کر دیا۔گو کہ سلیل چودھری اور مدن موہن اُسے نہیں بھولے۔سلیل چودھری نے فلم ''چھایا'' اور ''پریم پتر'' میں گوایا جب کہ مدن موہن نے فلم ''جہاں آرا'' اور ''حقیقت'' میں گانے گوائے۔یہ گانے بیحد مقبول ہوئے مگر اُسکے بعد اُسے کوئی کام نہیں ملا۔وہ بدلے دور کی دستک سن چکا تھا۔اُسنے ساؤتھ افریقہ اور یورپی ملکوں میں کئی کنسرٹ کئے جو کافی کامیاب رہے۔کروڑوں لوگ اُسکی آواز کے دیوانے تھے۔اسمیں کوئی شک نہیں کہ فلموں میں غزلوں کو عزت بخشنے والا طلعت ہے۔اُسنے غزلوں کو اپنی گائیکی کی وجہ سے اتنا مقبول بنایا کہ لوگ اُسکی غزلوں کو بار بار سنتے تھے۔اُسکی آواز میں عجب دلکشی اور لوچ تھا۔سچ تو یہ ہے کہ اُسکی آواز سیدھے دل میں اُتر جاتی تھی۔حکومت ہند نے 1992 میں اُسے پدم بھوشن کے اعزاز سے نواز۔

اُسکے آخری ایام بہت برے گزرے۔وہ کافی بیمار تھا۔وہ بول بھی نہیں پاتا تھا۔ایک بار کسی نے اُس سے پوچھا کہ تمہارے پسندیدہ موسیقار کون ہیں تو اُسنے جواب میں کہا کہ مدن موہن اور خیام۔9 مئی 1998 کو طلعت محمود نے اس جہان فانی کو الوداع کہا۔اُسکی بیٹی سبینا آخری وقت میں اُسکے پاس نہ تھی۔وہ اپنے شوہر راجندر رانا کے ساتھ لندن میں تھی۔بقول دلیپ کمار طلعت محمود ایک نیک دل انسان تھا۔اُسنے زندگی میں کسی کا دل نہیں دکھایا۔وہ انتہائی خوش گفتار اور حلیم تھا۔وہ جس سے بھی ایک بار ملتا اُسے اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔اُسنے دوسرے گلوکاروں کے مقابلے میں کم گانے گائے مگر جتنے بھی گائے وہ اُسے ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔اُسکے چند مقبول گانوں کی میں یہاں پر یاددہانی کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔شکریہ شکریہ اے پیار تیرا شکریہ۔فلم آرام۔سنگیت کار انل بسواس۔مہمان کلاکار۔طلعت محمود

۲۔آ تیری تصویر بنالوں۔فلم نادان۔موسیقار۔چک چاکلیٹ۔ہیرو دیو آنند

۳۔میں دل ہوں ایک ارمان بھرا۔موسیقار۔روشن۔ہیرو۔راج کپور

۴۔یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی۔موسیقار۔سجاد حسین۔ہیرو دلیپ کمار

۵۔محبت ہی نہ جو سمجھے۔وہ ظالم پیار کیا جانے۔موسیقار۔سی رام چندر۔ہیرو وی شانتارام

۶۔اندھے جہاں کے اندھے راستے۔فلم پتیتا۔موسیقار۔شنکر جے کشن۔گانے والا۔آغا

۷۔شام غم کی قسم آج غمگین ہیں ہم۔فلم فٹ پاتھ۔موسیقار۔خیام۔ہیرو۔دلیپ کمار

۸۔اے غم دل کیا کروں۔وحشت دل کیا کروں۔فلم ٹھوکر۔موسیقار۔سردار ملک۔ہیرو شمی کپور

۹۔سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا۔فلم ایک سال۔موسیقار۔روی

۱۰۔سینے میں سلگتے ہیں ارمان۔فلم ترانہ۔موسیقار۔انل بسواس۔کلاکار دلیپ کمار مدھوبالا

۱۱۔کوئی نہیں میرا اس دنیا میں آشیاں برباد ہے۔فلم داغ۔موسیقار شنکر جے کشن۔دلیپ کمار

۱۲۔اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو۔فلم آرزو۔موسیقار۔انل بسواس۔دلیپ کمار

گانوں کی فہرست تو کافی لمبی ہے۔جگہ کی تنگی حائل ہونے کے سبب معذرت چاہتا ہوں۔

- بقیہ -

خاص ملک، خاص لوگ، خاص علاج

کی اہمیت کے پیش نظر امریکہ کے اپنے وقت کے مشہور ترین دل کے سرجن Michael E. De De Baky کو بھی وہاں مدعو کر لیا تھا۔مگر صرف آپریشن کو دیکھنے اور اگر ضرورت پڑ جائے تو مشورے کے لیے۔

پھر ہوا یہ کہ ڈی بیکی نے آپریشن کے خاتمے پر تحسین میں سر ہلایا اور شاید ایک انگوٹھا بھی اٹھایا ہو گا کہ ٹھیک رہا اور انہیں ماسکو ائیرپورٹ پر فیس، تشریف آوری کے لیے شکریے اور شاید شیمپین کی اچھی مقدار کے ساتھ خدا حافظ کر دیا گیا۔یہ وہی ڈی بیکی ہیں اس سرجری کے پیشوا جنہوں نے انگلستان کی موجودہ ملکہ ایلزبتھ دوم کے چچا سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کا دل کا آپریشن کیا تھا۔انہوں نے انہیں تحفے میں ایسٹن مارٹن کار دی تھی۔ایک سابق شہنشاہ اپنے کرم فرما کو اس سے کم تحفہ کیا دیتا۔

میرا خیال ہے چین اور روس جیسے ممالک عزت نفس کے شہکار ہیں ورنہ پیسہ ہو تو کون ٹھکراتا ہے۔کسی انتہائی ترقی یافتہ ملک میں جا کر علاج کرانے کو، وہ بھی سب سے مہنگے ہسپتال یا کلینک میں۔اس ڈاکٹر سے جس کی فیس آسمان کو چھو رہی ہو۔مرض دل کی نالیوں کا بند ہونا ہو یا عقل داڑھ کا درد۔

افراد کی طرح ملکوں کی بھی عزت نفس ہوتی ہے اور یوں بھی ہے کہ بہت سے ملکوں کے خاص لوگوں کے سر پر نفس امارۃ کا سایہ ہوتا ہے جو کشش ثقل کی طرح سیڑھیوں اتر کر اردلی تک پہنچتا ہے۔مرحوم اردشیر کاوس جی نے اپنے کالم میں ایک موقع پر بڑے پتے کی بات کہی تھی:

''اے پوجیشن ایم چھے کہ جہ ملک نو راجہ و بیاری تے ملک نو پرجاہ بھکاری''

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم

چہارسو کا نیا شمارہ سلیم شہزاد قرطاس اعزاز دستیاب ہوا۔ اس ناچیز کے ذکر خیر، خاکے کی اشاعت اور اس شمارے کی پیشکش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کی پندرہ کاپیاں سلیم شہزاد صاحب کو مل چکی ہیں۔ بیشتر قلم کاروں کو دے دی گئیں ہیں۔ نوازش ہوگی اگر یہ پرچہ وہاں صبیح رحمانی صاحب کو بھی ارسال کردیں۔

سلیم شہزاد صاحب سے متعلق قابل قدر تحریریں آپ نے سلیقے سے سجادی ہیں۔ آپ کے انٹرویو کے سوالات نے اہم نکات پر معلومات مہیا کی ہیں۔ یہاں جن ادیبوں نے بھی اسے دیکھا بہت۔ سراہا ہے۔ سلیم شہزاد صاحب بہت خوش ہیں۔ یہ اشاعت ان کی توقع سے بڑھ کر ہے انھوں نے مجھے کہا ہے کہ میں ان کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ ایک بھرپور خصوصی نمبر کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

محمد اسد اللہ (ناگپور)

محبّی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ نے جب سے ''چہارسو'' بھیجنا شروع کیا ہے اس کا شدّت سے انتظار رہتا ہے۔ آپ نے اس میں جو تنوع رکھا ہے وہ بے حد متاثر کرتا ہے۔ سلیم شہزاد جن کا تعلق ہندوستان سے ہے ان کا انٹرویو اور ان کی شاعری، ناولوں اور تنقیدی مضامین کے حوالے سے مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سے قبل ذکیہ مشہدی کے فن کے اہم گوشوں کو آپ نے بڑی خوبصورتی سے چہارسو کے صفحات پر پھیلا دیا تھا۔ ہندوستان کے شاعر اور ادیب ''چہارسو'' میں باقاعدگی سے چھپتے ہیں جس سے وہاں کے ادب اور عوامی سوچ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ دیپک کنول ہندوستان کی فلم انڈسٹری پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ شموئل احمد کے ''ریپ سنسکرتی'' میں بھی آج کے ہندوستان کی وہ صورتحال نظر آتی ہے جسے آر ایس ایس والوں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھایا ہے اور یہی سب کچھ آج کل وہاں کے گلی کوچوں میں رواج پا رہا ہے۔

مرزا حامد بیگ نے شاہد مسعود کی شاعری کی بڑی عمدگی سے عکاسی کی ہے۔ ان کے اشعار سہل ممتنع کی بہترین مثال قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اوم پرکاش کا فلمی پڑھا۔ پھر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ آصف ثاقب، شوق انصاری، نوید سروش، قاسم جلال، ڈاکٹر ریاض احمد اور شبہ طراز کی غزلیں پسند آئیں۔

ہارون الرشید (بالاکوٹ)

محترم بھائی جان، السلام علیکم۔

بہت عرصہ بعد چہارسو ہمدست ہوا۔ بے پناہ شکریہ۔ شکریہ رینو جی کا بھی جو جی جان سے رسالہ مطلوبہ قارئین تک بڑی نیک نیتی سے پہنچا دیتی ہیں۔

رسالہ حسبِ روایت معنوی، بصری اور صوری ہر اعتبار سے لاجواب ہے۔ زیرِ رسالانہ میں ''دل مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' آپ نے قارئین پر ایک احسانِ گراں کیا ہے۔ یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور اردو کے تئیں آپ کا عشق ہے۔

قرطاسِ اعزاز میں اختر نثار صاحب کا تعارف خاصے کی چیز ہے۔ اس گوشے کے توسط سے پہلی بار میں ان سے ملی ہوں۔ آپ نے کیسے کیسے ہیروں سے متعارف کروایا ہے۔ وہ بھی بے لوث اور بے غرض۔ جزاک اللہ۔

حسبِ عادت میں نے تحقیقی حصہ چیدہ چیدہ دیکھ لیا مگر تخلیقی حصہ پورا پڑھ لیا۔ ماشاء اللہ تمام افسانے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ بالخصوص محترمہ طاہرہ اقبال کا ''کیس ہسٹری'' دل کو چھونے والی روداد ہے۔ مصنفہ نے اسے جس انداز سے آگے بڑھایا ہے اور ایک موت کی سزا پانے والے قیدی کی نفسیات کا نقشہ کھینچا ہے اسے پڑھ کر لگا کہ مصنفہ بھی شاید Psychologist ہیں۔ افسانہ ''کارپوریٹ سیکٹر'' آج کی دنیا کا ایک سچا مرقع ہے۔ گو کہ اس افسانے میں بزنس کمیونٹی کے روّیے کا ذکر ہے مگر آئے دن خونی رشتوں میں بھی اس طرح کا رویہ اور سود و زیاں کا معاملہ نظر آتا ہے۔ خدا خیر کرے۔

قمر جمالی (حیدرآباد، دکن)

گلزار بھائی، آداب۔

اگست سے لے کے دسمبر 2019 تک میں ''چہارسو'' کے دیدار کے لئے ترستا رہا۔ سن اُنیس کا یہ سال میرے لئے پریشانی و پراگندگی کا سال بنا رہا۔ اس ایک سال میں کئی اُتار چڑھاؤ آگئے۔ نومبر میں تو میں ایسے لڑھکا کہ سب کو ایسا لگا کہ اب گیا کہ تب گیا۔ اوپر والے کا کرم ہے کہ ابھی جی رہا ہوں۔

آپ سے چند باتیں کہنے کو من کر رہا تھا مگر حالات کچھ ایسے دگرگوں تھے کہ دل کی بات دل میں ہی رہ گئی۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ ''چہارسو'' ایک مہکتا ہوا گلدستہ ہے۔ آج کے بیشتر رسالے پیسے لے کر گوشے چھاپتے ہیں۔ ایک آپ ہیں جو کسی سے زرسالانہ بھی نہیں لیتے اور رسالہ مفت میں بھیج دیتے ہیں۔ میں ایسے رسالے میں اپنی شمولیت کو اعزاز کی بات سمجھتا ہوں۔ میں اُن خوش نصیبوں میں سے ہوں جس کے لئے ''چہارسو'' کے صفحات ہمیشہ چشم براہ رہتے ہیں۔ ''ایک صدی کا قصہ'' تواتر سے چھپ رہا ہے۔ آج سویرے کی بات ہے دل میں خیال آیا کہ دیکھیں کہ ''ایک صدی کا قصہ'' کی عمر اب کتنی ہوگئی ہے۔ میں اس زعم میں تھا کہ چار پانچ سال ہوگئے ہونگے۔ میں نے جب فائل کھول کے دیکھی تو میں یہ دیکھ کے دنگ رہ گیا کہ یہ سلسلہ ۲۰۱۰ کو شروع ہوا تھا اور جو پہلا مضمون چھپا تھا وہ نومبر دسمبر ۲۰۱۰ میں دادا صاحب پھالکے تھا۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ یہ سلسلہ اتنا دراز ہوگا جب کہ شروع شروع میں یہ طے ہوا

تھا کہ اسے ایک سال تک جاری رکھا جائے گا۔دس سال کیسے گزر گئے پتا ہی نہیں چلا۔ان دس برسوں میں نہ میں تھکا نہ آپ رکے۔اس حقیقت کے باوجود کہ ان مضامین کو صفحۂ قرطاس پر اُتارنے کے لئے مجھے کس طرح عرق ریزی کرنی پڑتی ہے اس بات سے نہ آپ غافل رہے اور نہ مجھے شکایت کا موقع دیا۔یہ ''چہارسُو'' کی ہی دین ہے کہ انہی مضامین کو ''علم وعرفان پبلشرس لاہور نے کتابی صورت میں پیش کیا۔پہلی کتاب ''فلمی دنیا کے معمار'' کے نام سے چھپ کر ہاتھوں ہاتھوں بک گئی تو اُنھوں نے اسکی دوسری جلد چھاپنے کا فیصلہ کیا۔شاید وہ ایڈیشن بھی مارکیٹ میں آ گیا ہو۔اس کامیابی کا سہرا آپ کو ہی جاتا ہے۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں یہاں پر آصف ثاقب صاحب کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ہر مضمون کا مطالعہ کیا اور ہر بار خط لکھ کر میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔غالب عرفان صاحب بھی شروع شروع میں ان مضامین کو پڑھتے تھے اور اپنی آرا سے مستفید کرتے تھے۔اب وہ بھی اوب چکے ہیں۔یہی حال یوگندر بہل تشنہ صاحب کا ہے۔وہ ہر شمارے میں ایک صدی کا قصہ کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتے تھے۔اُنہوں نے بھی کنارہ کرلیا۔

اب جب کہ اس کے دس سال پورے ہو چکے ہیں مجھے جانے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ یہ سلسلہ اب آپ کے قارئین پر گراں گزر رہا ہے۔مجھے ساحر کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔تعلق بوجھ بن جائے تو اُسے توڑنا بہتر۔کیوں نہ ہم بھی اس سلسلے کو خیر باد کہہ دیں۔آپ کی اور آپ کے قارئین کی کیا رائے ہے۔جاننے کے لئے میں بیقرار رہوں گا۔

دیپک کنول (ممبئی)

چہارسو رنگ پیارے گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

تازہ چہارسو کی ''خوش منظری'' مسرت وحیرت کے امتزاج سے بھرپور ہے۔رسالے کا انتظار رہتا ہے۔اس کے مضامین کی گونا گونی اور انفرادی پیش کاری سامانِ لطفِ مطالعہ مہیا کرتی ہے۔''زہریلا انسان'' اب کے بہت رنگیلا سجیلا تھا۔کبھی کبھی لگتا ہے کہ یہ کہانی انجام کے قریب ہے مگر نہیں۔روز بروز اس کی افتاد میں مزید افتاد کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔سلیم خان ابراہیم خان،سلیم شہزاد قرطاسِ اعزاز کے باب میں خوب رہے۔ان کی تحریریں خوب صورت ہیں اور گفتگو دلچسپ ہے۔پاکستان میں ان کو زیادہ پڑھا سنا نہیں گیا۔چہارسو کی وساطت سے ان کا رنگ ضرور جما ہے۔انہوں نے براہِ راست میں آپ کے تحریری سقم کی بات کی ہے۔نانا فی الواقع ناتا ہے ناطہ نہیں۔جیسے دتیرہ،وتیرہ ہے وطیرہ نہیں۔ایک بات کہوں ان کے کلام میں ایک جگہ لفظ حیرانگی راہ پا گیا ہے یہ لفظ حیرانگی نہیں حیرانی ہونا چاہیے(یا پھر حیرت)بالعموم ''ہ'' والے فارسی الفاظ کے آگے کیفیت کا لاحقہ ''گی'' لگتا ہے جیسے دیوانہ سے دیوانگی،تخفہ سے تحفگی،زندہ سے زندگی،بیوہ سے بیوگی،تشنہ سے تشنگی۔لفظ حیران کے آخر میں ہ نہیں ''ن'' ہے۔یہ حیرانی ہوگا جیسے انسان سے انسانی،جان سے جانی،دیوان سے دیوانی وغیرہ۔ہر نوع سلیم شہزاد کی شاعری پائے کی ہے۔خوشی کی بات ہے کہ ان سے تعارف اچھے پیرائے میں ہوا ہے۔پروفیسر غازی علم الدین کا مضمون اضافت مقلوب بعنوانِ اصلاح مختلف رسالوں میں نکل چکا ہے۔اس مضمون میں بہتری کے خاصے مواقع موجود ہیں۔غازی صاحب نے بہت سے اصلاحی مضامین لکھے ہیں۔ان کی کتابیں بھی پڑھنے لکھنے والوں کی رہ نمائی کرتی ہیں۔پروفیسر غازی صاحب کی مصروفیات ادبی اور اصلاحی ہیں اور بے شمار ہیں۔خدا انہیں شاد وآباد رکھے۔

ایک صدی کا قصہ میں دیپک کنول نے ''اوم پرکاش'' کی بابت بہت کچھ بتایا ہے تاہم اس عظیم ادا کار کی ذات اور کام پر پوری روشنی نہیں پڑ سکی۔اوم پرکاش کی کئی پسندیدہ فلموں کا ذکر نہیں ہو سکا۔دیپک کنول نے ''کالکا'' کے مہورت کے ضمن میں دلیپ کمار کی طرف سے مدعو کیے جانے کی بات کی ہے۔اوم پرکاش بیمار تھے وہ ''یوسف نے بلایا ہے یوسف نے بلایا ہے'' ہی کہہ سکے تھے۔فلم ''گوپی'' میں اوم پرکاش نے دلیپ کمار کے بڑے بھائی کا رول بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ان کے رلا دینے والے مکالمے بڑے جاندار تھے۔ایک اور فلم میں ان کا جملہ ''اس زمانے میں جب میں کالج میں پڑھتا تھا'' بہت مقبول ہوا تھا۔

چہارسو کا خطوط کا حصہ خاصا من بھاؤنا ہے۔شکر ہے کہ اس حصے میں کہیں بھی تلخی نہیں ہوتی۔سب احباب جڑے ہوئے ملتے ہیں۔اسی اخلاص مندی سے ''چہارسو'' چہارسو پسند کیا جاتا ہے۔تصور اقبال ایک مدت کے بعد رسالے میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ان کی غیر موجودگی سے پریشانی تھی۔خدا کے فضل وکرم سے اب وہ صحت یاب ہو چکے ہیں۔''چہارسو'' کے دوستوں کے لیے دعا کرتا ہوں۔

آصف ثاقب (بوئی،ہزارہ)

محترمی گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

خدا کرے بخیر ہوں۔چہارسو کا تازہ شمارہ بصورت گوشہ سلیم شہزاد موصول ہوا۔معروف نقاد سلیم شہزاد صاحب پر ایک خوبصورت اور ان کے شایانِ شان ''قرطاس اعزاز'' شائع کرنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔چوالیس صفحات پر مشتمل اس گوشے میں موصوف کی علمی وادبی شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں پر قابل مطالعہ تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔سلیم صاحب ایک بے نیاز قسم کے انسان ہیں۔اس گوشے کی اشاعت سے ان کی کثیر الجہت اور قابل رشک علمی شخصیت کے کئی پہلو ادبی دنیا کے سامنے آئیں گے۔ان قیمتی تحریروں کے درمیان خاکسار کی طالب علمانہ کوشش بعنوان ''شہریار ادب'' شائع کرنے پر حد خوشی ہوئی۔

ناصرالدین انصار (بھارت)

عزیزی گلزار جاوید،سلام مسنون۔

ایسا لگتا ہے جیسے پلک جھپکتے میں چہارسو کا اگلا شمارہ سامنے آ گیا۔کچھ رسالوں نے میرے افسانے شائع کیے لیکن وہ شمارے بھی مجھ تک نہیں پہنچے۔عام شماروں کی کون کہے۔یہ شکایت نہیں حالات کا ذکر ہے اور ساتھ ہی آپ کی پابندیٔ اشاعت اور پھر رسالہ یہاں بھیجتے رہنے کی ہمت کی داد ہے۔جناب سلیم

شہزاد پرخصوصی گوشے والا شمارہ بس ابھی موصول ہوا ہی ہے۔ میں ہر رسالے میں عموماً قارئین کے مراسلے پہلے پڑھتی ہوں۔ محترمہ شہناز عابدی سے کہنا چاہوں گی کہ جن دو افسانوں کا ذکر میں نے اپنے مراسلے میں کیا ہے وہ دونوں پوری توجہ کے ساتھ اور بیک نشست پڑھے تھے۔ افسانہ جستہ جستہ پڑھنے کی چیز ہے بھی نہیں۔ میں نے جو محسوس کیا وہ ایمانداری سے لکھ دیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ادب سائنس کی طرح مکمل طور پہ معروضی نہیں ہوسکتا اس لیے مجھ سے اختلاف کی گنجائش پوری طرح موجود ہے جہاں تک انسانی زندگی میں دکھ درد کا سوال ہے تو میں جذبات سے عاری نہیں ہوں لیکن انسانی دکھ ادب و دوسرے فنونِ لطیفہ کے ذریعے بھی اظہار پاتا ہے اور اخباروں و رسالوں کے مضامین کے ذریعے بھی۔ دونوں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ میں محترمہ شہناز عابدی کے کچھ اور افسانے بھی پڑھنے کی خواہش مند ہوں۔ نشاندہی کریں تو ممنون ہوں گی۔

میں شموئیل احمد صاحب کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایک فاش غلطی کی نشاندہی کی۔ میں اس وقت علیگڑھ سے شائع ہونے والے رسالے امروز کو پڑھ کر کچھ لکھنے والی تھی اس کے اداریے سے خلط ملط کر دیا۔ بہرحال کہیں کچھ کنفیوژن ہوا۔

زیرِ نظر شمارے میں میرا جو مراسلہ شائع ہوا ہے اسکی نوعیت ذاتی تھی۔ شاید میں یہ لکھنا بھول گئی کہ یہ اشاعت کے لیے نہیں ہے۔ ویسے کچھ حرج تو نہیں لیکن وہ مدیر تک محدود رہتا تو بہتر تھا۔ بہرکیف گلزار صاحب آپکی لگن و محنت کی صلاحیت میں اضافہ ہو اور آپ قارئین و مصنفین کو ایک دوسرے کے روبرو کرنے کا قابلِ قدر فریضہ انجام دیتے رہیں۔

ذکیہ مشہدی (پٹنہ)

برادرم گلزار جاوید، سلام گزار ہوں۔

گزشتہ دنوں آپ سے اور آپ کی وساطت و عنایت سے اپنے بہت ہی پسندیدہ قلمکار جناب تابش خان زادہ سے آپ کے درِ دولت پر ملاقات ہوئی، اور اس چنیدہ محفل میں شریک دوسرے دوستوں سمیت میں نے بھی ان کی گفتگو سے جو لطف اٹھایا وہ بیان سے باہر ہے۔ ظاہر ہے کہ میری گفتگو میں تو ان کے قسط وار ناول زہریلا انسان بھی موضوع تھا، مگر دیگر بہت سے حوالوں اور امریکہ میں اردو ادب اور اردو زبان کے حوالے سے بھی ان سے جو حاصل ہوا بڑا اہم تھا۔ امید تو ہے کہ ان کے قیام کے دوران میں ایک اور ملاقات بھی ہوگی، البتہ کل رات میرے ماہرِ امراضِ چشم نے مجھ سے کہا ہے کہ اگلے دو تین دن میں میرا آنکھ کا آپریشن ہونا چاہیے، اب دیکھتے ہیں کیا صورتِ حالات ہوتی ہے۔

آنکھ کی اس خرابی کے باوجود میں نے آپ کا عطا کردہ چارسو کا تازہ شمارہ اور سابقہ شمارہ جو مجھے ڈاک سے مل نہیں سکا تھا، وہ بھی گھر لا کر سب سے پہلے ''زہریلا انسان'' کی دونوں قسطیں پڑھیں اور خوشی ہوئی کہ کہانی بدستور آگے بڑھ رہی ہے۔ کاش جناب تابش خان زادہ صاحب اسے کتابی صورت میں بھی شائع کرنے پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ کتاب کا خریدار تو کوئی ہوتا نہیں۔ بس یہی ہمارا المیہ ہے کہ ہم لوگ کتابیں شائع کرتے اور انہیں مفت بانٹتے رہتے ہیں۔

میں نے چہارسو کے تازہ شمارے کے تین چار افسانے اور مضامین پڑھے ہیں اور خیال تھا ان کے بارے میں بھی کچھ لکھوں گا مگر اب آنکھیں اجازت نہیں دے رہیں۔ البتہ ایک بات آپ کے نوٹس میں ضرور لانا چاہتا ہوں کہ اس مرتبہ کمپوزنگ میں کچھ غلطیاں ہیں، عموماً چہارسو میں ایسا بہت کم ہوتا ہے اس لیے سوچا شاید کمپوزر تبدیل کیا گیا ہو!

نسیم سحر (راولپنڈی)

میرے گلزار، ادب کے باغ و بہار، خوش رہو۔

چہارسو کا سلیم شہزاد نمبر علوم و فنون کا اتنا عمدہ مرقع ہے کہ مطالعہ کے بعد دل و دماغ روشن ہو گئے۔ سلیم صاب سے تعارف زندگی کا نایاب تحفہ ہے افسوس ہے کہ میں عمر کے آخری پڑاؤ میں اُن کے علم کی روشنی سے فیضیاب ہوا۔ آپ اور سلیم شہزاد صاحب کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

یہ جو آپ نے شعری حصہ میں اساتذہ کے کلام کو نمایاں جگہ پر شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے اس سے نوجوان اہلِ قلم کو بہت رہنمائی ملنے کے امکانات ہیں۔ تازہ شمارے میں مجاز کی غزل نے پرانی یادوں کو پھر سے زندہ کر دیا۔ غالب عرفان، آصف ثاقب، اشفاق حسین، واصف حسین واصف اور ہارون الرشید کے کلام میں تازگی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی۔

افسانے سبھی عمدہ ہیں مجھے خاص طور پر شموئل احمد کا ''ریپ سنسکرتی''، رضیہ اسماعیل کا ''ڈائری''، جمیل احمد عدیل کا ''جام شریں'' اور ارشد منیم کے ''خواہش'' نے بہت متاثر کیا۔

زہریلا انسان اور ایک صدی کا قصہ خوب رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ اوم پرکاش اچھے انسان، بڑے اداکار اور ٹھیٹھ لاہوری ہونے کے ناطے اپنی طرز کے خوب انسان تھے۔ ڈاکٹر ریاض احمد شستہ مزاج کے اعلیٰ انسان ہیں جس کا ثبوت رینو بہل کے تازہ ناول ''نجات دہندہ'' پر اُن کے مضمون کا ایک ایک لفظ دے رہا ہے۔ ہرچند میرا سوہنا منڈا اس بار چہارسو میں براہِ راست شامل نہیں مگر اُن کی کتاب کا عکس اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کا بامعنی مضمون نما تبصرہ فیروز عالم کی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے۔

پروفیسر یونس شرر، محمود شام، مشیر طالب، فیصل عظیم اور نصرت بخاری کی کیمبل پوری لہجے کی نظم لاجواب ہیں۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو ایس اے)

محترم گلزار جاوید صاحب' آداب۔

سلیم شہزاد نمبر پڑھا، لطف آ گیا۔ ان کا تنقیدی مضمون ہی اتنا دلچسپ، براہِ راست اور پُرمغز تھا کہ جس نے ان کے گوشے میں گویا جان ڈال

دی۔ پھر اصل ''براہِ راست''، یعنی انٹرویو بھی بہت اچھا تھا، بہت کچھ سوچنے کا موقع ملا۔ اگرچہ ان کی نثر کا ذکر بہت رہا اور یقیناً ''تمثیلچا''، ان کا منظوم ڈرامہ بھی بہت خوب ہے مگر ان کی شاعری بھی بہت توجہ سے پڑھے جانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ مجاز لکھنوی اور عرفان صدیقی صاحبان کا کلام تو خاصے کی چیز ہے۔ یونس شرر صاحب کی نظم بھی خوب ہے۔ ایک بار پھر آپ کا بہت شکریہ۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

کچھ عرصہ ملک سے باہر رہا۔ اس عرصہ میں چہارسو کے گزشتہ دو شماروں میں آپ نے آسمان اردو ادب کے دو درخشندہ ستاروں سے قارئین کو متعارف کرایا جو ملک اور بیرون ملک خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔ جس انداز میں آپ ان نامور شخصیات تک رسائی حاصل کر کے سوال و جواب کی خوبی کے ذریعہ ان سے متعلق تمام معلومات قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں وہ آپ کا مخصوص کمالِ فن ہے جو لائق صد تحسین ہے۔

اختر شمار ماہرِ تعلیم اور خصوصی طور پر غزل کے شاعر اپنے فلسفیانہ شعور، بصیرت اور گہری فکر کے حوالہ سے شہرت رکھتے ہیں جبکہ سلیم شہزاد تنقید و تحقیق، ناول نگاری اور شاعری میں اپنے ہم عصروں سے الگ تھلگ اور نمایاں مقام رکھتے ہیں عالمی شعری اور نثری ادب کا گہرا مطالعہ ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور اس حوالہ سے وہ تقریباً نو عدد زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔

انہی شماروں میں دلچسپ افسانے بھی شامل کیے گئے ہیں مثلاً ''مٹھی میں جگنو'' جس میں فرح کامران نے بڑی خوبی سے معاشرہ میں اس قابلِ افسوس تفریق پر توجہ دلائی ہے جو ایک گھر میں بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان روا رکھی جاتی ہے۔ بیٹیاں لائق با کردار اور بیٹے نالائق اور نکھے ہی کیوں نہ ہوں۔ علاوہ ازیں دفاتر اور تعلیمی اداروں وغیرہ میں خواتین کے ساتھ جنسی ہراسگی کے جو واقعات پیش آتے ہیں ان کی جھلک بھی نمایاں کی گئی ہے۔ کہانی میں سارہ زیدی نامی لڑکی کا کردار جرأت، ذہانت، معاملہ فہمی اور خاندانی اقدار کی پاسداری کی بہترین مثال ہے۔

''کارپوریٹ سیکٹر'' (گلزار جاوید) میں اکثر قارئین اور خصوصاً نئے لکھاریوں کی آگاہی کے لیے دلچسپ معلوماتی تحریر رقم کی گئی ہے جس میں پبلشرز کی غیر سنجیدگی، ناحق منافع خوری اور حیلہ سازی سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔ تاہم کہانی میں پروفیسر حشمت حسین کے قابلِ تحسین کردار کا تذکرہ بھی شامل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سبھی لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ شمع خالد نے ''چھاپے پہ چھاپا'' کے عنوان سے دلچسپ معلوماتی اور تکنیکی انداز میں کہانی تحریر کی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔ مصنفہ نے بڑے موثر طور پر دولت کی ہوس میں مبتلا امیر اور غریب افراد کے رویوں کو اجاگر کیا ہے۔

دوسرے شمارے میں آغا گل صاحب کا دلچسپ مضمون ''تصدیق نامہ'' ذاتی مشاہدہ اور تجربات پر مشتمل جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ کئی دہائیاں گزر چکیں جب متحدہ پاکستان کے اس وقت کے حکمرانوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں توازن قائم رکھنے کے لیے (Parity) مغربی پاکستان کو بھی مشرقی پاکستان کی طرح ایک صوبہ کا درجہ دے دیا تھا تاہم یہ تجربہ کامیاب نہ ہوا اور تقریباً پچاس سال گزر چکے ہیں کہ ''ون یونٹ'' ختم ہو کر چاروں صوبے بحال ہو گئے ہیں اور اب ہر صوبہ پر اُسی کے عوام بشمول گورنر وزیر اعلیٰ حکمرانی کر رہے ہیں جنہیں عوام منتخب کر کے اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں اور عوام کے مسائل کے حل کی خاطر ہر صوبہ کے اپنے عوام کا فرض بنتا ہے کہ وہ صحیح لوگ منتخب کریں۔

''ڈالی۔ سریلزم اور گیلوٹین'' کے عنوان سے نیرّ اقبال علوی صاحب نے بہترین تحریر رقم کی ہے جس میں ہمارے معاشرہ میں بے حس سیاسی رہنماؤں کی اپنے عوام سے دوری اور لاتعلقی روا رکھنے کی بڑے موثر انداز میں تصویر پیش کی گئی ہے جسے پڑھ کر قاری کو ذہن میں اٹھنے والے سوالات کا جواب مل جاتا ہے کہ ہمارے خود غرض اور سیاسی پارٹیاں بدلنے والے بے حس نمائندے اور اقتدار سے ناحق چمٹے رہنے کے خواہشمند لوگوں کی ذہنی کیفیت کیسی ہوتی ہے۔

زین العابدین خان کا افسانہ ''آشنائی کا زخم'' حقیقی دنیا کے افسوسناک مسائل اور نوجوانی کی نادانیوں کی ایک دکھ بھری کہانی ہے جو زندگی بھر ایک تکلیف دہ زخم کی صورت میں ذہن کی گہرائی میں قائم رہتی ہے۔ والدین کی طرف سے ابتدائی زندگی میں ہی بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تربیت کے علاوہ مستقل نگرانی ہی ایسے واقعات کا تدارک کر سکتی ہے۔

شماروں میں بہت اچھا کلام شامل کیا گیا ہے خصوصاً اختر شمار، سلیم شہزاد، نازیہ سحری مراد آباد، رومانہ رومی، غالب عرفان، رؤف خیر، عظیم بخت، ڈاکٹر شگفتہ، نبیل احمد نبیل، محمود شام، مشیر طالب اور یوگیندر بہل تشنہ کا کلام خوب ہے۔ تشنہ صاحب کو اکیانویں (91) سالگرہ پر مبارکباد پیش کرتا ہوں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ اس مرحلہ پر بھی باقاعدگی کے ساتھ شاعری اور دیگر ادبی سرگرمیاں بامعنی اور دلچسپ انداز میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے لیے دعا گو ہیں کہ وہ یونہی عمر بھر لکھتے رہیں اور بقول رؤف خیر صاحب ''زندہ مرحومین ادب'' سے دور رہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی طبی مضامین پر مشتمل کتاب کا ٹائٹل چہارسو کے آخری صفحہ پر دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ''زندگی نایاب ہے'' کے عنوان سے اس کی اشاعت مفاد عامہ کے لیے بہترین کاوش ہے۔ آخر میں آپ کا شکریہ کہ آپ باقاعدگی سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں ''چہارسو'' کی بہار قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

سال نو کا چہارسو صاحبِ علم سلیم شہزاد کے لیے انارکلی کے پروانۂ رہائی کی صورت آیا۔ قرطاسِ اعزاز پر بڑی تعریف کی گئی ہے مگر راقم یا مفتی کا نام

خطِ خفا کی نذر ہو گیا ہے۔سلیم شہزاد نے اساطیر کی جمالیاتی مطالعے کا نچوڑ یہ پیش کیا کہ ''دنیا کی کسی بھی دیو مالا کا کوئی بھی کردار شمہ برابر بھی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتا۔'' شکیل الرحمٰن کی کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ موصوف نے اسلام میں فرشتوں (جبرئیل، میکائیل، عزرائیل اور اسرافیل) کے تصور پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔حضرتِ شکیل الرحمٰن تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔سلیم صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عزرائیل نامی کسی فرشتے کا ذکر نہ قرآن میں کہیں ہے نہ حدیث کی کسی معتبر کتاب ہی میں ہے۔

براہِ راست میں آپ سے مکالمہ کرتے ہوئے سلیم شہزاد کا لہجہ حسب معمول کھردرا ہے مگر آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ نے من وعن اسے قرطاس کے حوالے کر دیا۔آپ کے سوال دونا برابر مصرعوں کے اماموں کی اقتدا مجھ جیسے کم علم کے سر سے گزر جاتی ہے؟ سلیم شہزاد نے جواباً کہا اقتدا کا سر سے گزر جانا یہ کیسی زبان ہے صاحب؟ دونا برابر مصرعے اور ان کے امام سے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ لگتا ہے خود سلیم شہزاد کو میرا مضمون یاد نہیں رہا جو اُن کے گوشے میں شامل ہے۔یہ دونا برابر مصرعوں کا اشارہ آزاد غزل کی طرف ہے جس کی اولیت و امامت کا دعویٰ بہار کے ایک شاعر مظہر امام کیا کرتے تھے۔چہارسو ہی کے گوشۂ سلیم شہزاد میں اپنے مضمون ''ملکِ سخن کا شہزادہ'' میں، میں نے لکھا ہے:

''غزل میں سلیم شہزاد نے دونا برابر مصرعوں کے اماموں کی اقتدا میں صلوٰۃ غزلیہ بھی ادا کی ہے۔۔۔ان کی آزاد غزل دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کوئی سلیم الطبع جس کی تخلیق احسن التقویم کے اصول پر ہوئی ہو۔پولیو کے شکار وجود کی طرح رینگ رہا ہے۔''(صفحہ ۳۴)

شاہد مسعود کے آوارہ گرد اشعار اچھے لگے جو برگِ آوارہ کی طرح ہی بکھر کر بے نام و نشان ہو گئے۔محترم پروفیسر غازی علم الدین کا مضمون ''اضافت مقلوب اور ہماری نافہمی'' خوب ہے۔اس میں ایک لفظ پس خوردہ کا ترجمہ انہوں نے جھوٹا لکھا ہے۔جھوٹا نہیں بلکہ جوٹھا لکھنا چاہیے۔جھوٹا کا مطلب جھوٹ بولنے والا جبکہ پس خوردہ کے معنی میں بچا ہوا یعنی جوٹھا، کسی کا جوٹھا۔

نازیہ سحری کی نظم بہت دل چسپ ہے۔کاش اس میں کمپوزنگ کی غلطیاں نہ ہوتیں۔شاہد مسعود کا آوارہ گرد شعر ہے:

تو پلٹ کر تو دیکھتا کہ تجھے
دور تک دیکھتا رہا ہے کوئی

یکم مئی ۱۹۶۸ء کی کہی ہوئی میری ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر یاد آئے۔

اس ادا پر تو مٹا جاتا ہے طالب کوئی
سننے والا ہے کوئی اور مخاطب کوئی
زندگی تو نے پلٹ کر نہیں دیکھا ورنہ
دور تک دیکھ رہا تھا تری جانب کوئی

اللہ کرے چہارسو ملتا رہے اور بیرونِ ملک کے ادب پاروں سے استفادے کا موقع ملتا رہے۔

رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ جنوری فروری ۲۰۲۰ء اپنی باوقار انفرادیت کے ساتھ نظر نواز ہوا۔منفرد اور جدید فکر کے شاعر، ناول نگار اور جرأت مند نقاد جناب سلیم شہزاد اس بار قرطاسِ اعزاز کے حق دار ٹھہرے۔''براہِ راست'' میں آپ کے مطالعے سے بھرپور سوالات اور سلیم شہزاد کے جوابات نے ایک مباحثے کی صورت اختیار کی۔سلیم شہزاد اپنی تنقید کے حوالے سے انتہائی کھرے معروف ہیں۔ان کی شاعری جہاں پسند کی گئی وہاں سوالات بھی اُٹھے۔اُن کی تحریر ''اساطیر کا جمالیاتی مطالعہ'' خاصے کی چیز ہے۔ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے انہیں ''جن'' درست قرار دیا ہے وہ پڑھنے لکھنے کے جن ہیں۔ڈاکٹر یحییٰ نشیط کا مضمون ''گنجینۂ معنی کا طلسم شکن'' ایک حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ڈاکٹر تحسین سلیم خان کی تحریر بھی دلچسپ ہے دیگر مضامین سلیم شہزاد کی فکر و فن کی تفہیم و تحسین میں ہیں۔قاری شانے اچھا انتخاب کیا ہے۔

محترمہ رخسانہ صولت سلیمی نے ''تھر'' کی بھوک اور محرومی سے پُر زندگی کے ایک رخ کی جھلک دکھائی ہے ''صحرا کی ہچکی'' ایک آئینہ ہے۔بے حسی، انسان کی تذلیل، جھوٹ اور محرومی کا۔''تھر'' کی امداد کے نام پر مختلف سرکاری و غیر سرکاری تنظیموں کے ذمہ داران ارب پتی بن گئے مگر بدنصیب تھر کی ابھی قسمت بدلی بلکہ سیاسی رشوت ''کارڈ'' دے کر انہیں بھکاری بنا دیا۔محترمہ رضیہ اسماعیل کا افسانہ ''ڈائری'' نسوانی احساسات اور مشرقی تہذیب کی یاد دلاتا ہے پیش کش اچھی ہے۔''تصدیق نامہ'' اپنے عنوان کے عین مطابق ہے۔آغا گل کے اکثر افسانوں میں سیاسی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔شموئل احمد اس عہد کے جرأت مند افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔اُن کے افسانے تکنیکی اعتبار سے بھی مضبوط ہیں۔عصری، سماجی، سیاسی اور مذہبی تلخیوں کو بے باکی سے پیش کر رہے ہیں۔وہ جس معاشرے میں رہ کر ایسے افسانے تحریر کر رہے ہیں بڑے حوصلے کی بات ہے۔افسانہ ''ریپ سنسکرتی'' مظلوم، دلت قوم، غربت، ذات پات اور صاحبِ اختیار طبقے کی بے حسی اور بدمعاشی کو بڑی دردمندی اور بے باکی سے بیان کیا ہے۔کچھ جملے تو دہلا دیتے ہیں:

''گوتم کو حیرت ہوئی کہ ایک دلت لڑکی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے''

''دبنگ راجپوتوں نے ایک نابالغ دلت لڑکی کی اجتماعی عصمت دری کی تھی اور خاندان کے تین افراد کا بہیمانہ قتل کیا تھا۔''

''انہیں گوبر کھانے اور پیشاب پینے پر مجبور کیا تھا۔''

''ریپ کا کیا کیجیے گا ریپ تو سنسکرتی میں شامل ہے اندر نے بھی اہلیہ کا ریپ کیا تھا۔''

نیرّ اقبال علوی ایک منفرد افسانہ نگار ہیں ان کے موضوعات اور پھر پیش کش بھی ذرا مختلف ہے۔''ڈالی، سریلزم اور گیلوٹین'' افسانہ بھی ایسا ہی ہے۔
مجاز لکھنوی، آصف ثاقب، اشفاق حسین، پرتپال سنگھ، اشرف جاوید کی غزلیں دل کے قریب محسوس ہوئیں۔شوق انصاری نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔

یہ رعونت جب تنزل کو ہوا دیتی ہے
وقت کے حاکم کو گلیوں میں رلا دیتی ہے
(شوق انصاری)

خالد ندیم شانی کی غزل کے ہر شعر کے لیے، بہت سی داد، بہت خوب۔

اُس کی کچھ خیر خبر ہو تو بتاؤ یارو
ہم کسی اور دلاسے میں نہیں آئیں گے
جس طرح آپ نے بیمار سے رخصت لی ہے
صاف لگتا ہے جنازے میں نہیں آئیں گے
(خالد ندیم شانی)

تصور اقبال، نبیل احمد نبیل اور ابراہیم عدیل کی غزلیں بھی متوجہ کرتی ہیں۔ نازیہ سحری کی تخلیق حصۂ نظم میں ہوتی تو بہتر تھا۔نظموں کا حصہ بڑا جاندار ہے۔محمود شام کی نظم اہلِ ہند کے اہل قلم اور باشعور عوام کو تنبیہ اور اُن کے منہ پر طمانچہ ہے۔ یونس شرر کی نظم میں عصری بے حسی اور بے علمی ہے۔ فیصل عظیم کی نظمیں منفرد ہیں''محبت کے بغیر''ایک محبت کی جداگانہ کیفیت کو پیش کیا۔شگفتہ نازلی اور اقتدار جاوید کی نظمیں پسند آئیں۔ زہریلا انسان نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا ہے سماجی جبر اور خوف کی فضا کو مؤثر انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ ''مستقبل کی اردو شاعری'' صرف مزاح نہیں بلکہ اردو زبان و شاعری کے حوالے سے سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔

نوید سروش (میرپور خاص)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔
''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ جلد ۲۹ بروقت نظر نواز ہوا۔منتخب نگارشاتِ نثر و نظم کے ساتھ یقیناً یہ بھی پڑھنے لکھنے والوں کی دلچسپی کا باعث تھا۔سلیم شہزاد پر قرطاسِ اعزاز کی پیش کش بھی آپ کی کھوج پرکھ کی مثال بن کر ابھی تک ذہن و دل پر چھائی ہے اُن کے بارے میں بہت کچھ مجھ جیسے کم علم کے علم میں آنا بھی ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔حیدر آباد دکن کے باسی ہونے کے ناطے وہ اہلِ زبان بھی ہیں تبھی تو براہِ راست میں کیے گئے چند سوالوں پر اُن کا چٹکی لینا دلچسپ لگا۔ اللہ انہیں ادب کی خدمت اور زبان کی تراش خراش کے لیے عمرِ طویل عطا فرمائے۔آمین۔یوں تو اُن کی ساری غزلیں مشکل ردیفوں کے ساتھ ایک عجیب کیف کی حامل تھیں مگر ''ابن المفر'' کی ردیف بہت مشکل تھی۔واہ، واہ!
افسانے سب پسند آئے مگر رضیہ اسماعیل کی ''ڈائری'' کا ذائقہ ہی نرالہ تھا چہ جائیکہ رخسانہ صولت کی ''آخری ہچکی'' عرفان صدیقی تو یوں بھی ''غزل'' کا منفرد نام (تھے) ہے اُن کے دو شعر:

عجیب حریف تھا میرے ہی ساتھ ڈوب گیا
مرے سفینے کو غرقاب دیکھنے کے لیے

نقشِ پا ڈھونڈنے والوں پہ ہنسی آتی ہے
ہم نے ایسی تو کوئی راہ نکالی ہی نہیں

شبہ طراز اپنی غزل میں ایک جگہ چوک گئی ہیں۔دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے ''دونوں نے آ کے گزر جانا ہے'' میں لفظ ''نے'' اگر استعمال نہ کرتیں تو بھی مصرع وزن میں ہوتا۔

غالب عرفان (کراچی)

گلزار جاوید صاحب، سلام و خلوص!
''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔میں طویل عرصہ (۳۔سال) سے بیماری کی زد میں ہوں لیکن اب قدرے افاقہ ہے۔تازہ شمارہ حسبِ روایت ایک جہانِ معانی کا خزینہ لیے ہوئے ہے۔آپ نے اس شمارے کو منفرد رکھا ہوا ہے۔بارہ مسالے بھی پورے ہیں لیکن تخلیقی تسلسل میں تازہ کاری کا عنصر بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔
اساطیر کا جمالیاتی مطالعہ ایک بھرپور اور جامع مضمون ہے۔سلیم شہزاد کی ہستی کو جس انداز سے کریدا گیا ہے میں نے ایسا کم دیکھا ہے۔ان کی تخلیقات، مضامین، شاعری حتیٰ کے نظمانے تک پر سیر حاصل بات کی گئی ہے۔کسی بھی تخلیق کار کی یہ جامع پذیرائی ہے۔شاعری میں مجاز لکھنوی کا انداز، فصاحت و بلاغت دیدنی ہے:

چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

واصف حسین واصف:

اُس نے احسان اُتارا تو ہے خاموشی کا
نشہ رہ جائے گا اعصاب میں سرگوشی کا

ڈاکٹر قاسم جلال:

نگاہِ شوق مضطر تھی جس کے انتظار میں
اُڑا کے خاکِ اہلِ دل وہ کارواں چلا گیا

آخر میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا مضمون جو ''شاہد مسعود'' کے آوارہ گرد اشعار بھی ایک رومعانی اور زہرِ خند کی کیفیت سے آلودہ ہیں۔ہم تو شاہد مسعود کو صرف ٹی وی اینکر کہتے رہے وہ تو اچھے خاصے شاعر نکل آئے۔ایک عمدہ پرچہ ارسال کرنے کا شکریہ۔

مظہر بخاری (میاں چنوں)

...... یورپ میں 19 دن ......

''یورپ میں 19 دن'' وہ خواب ہے جو شبہ طراز نے مجھے دکھلایا کہ بہت زمانے ہو گئے جب شوقِ آوارگی مجھے بھی سوکھے پتے کی مانند اُڑاتا پھرا، وہی منزلیں، وہی راستے جو شبہ نے دعا اور جزا کے ساتھ طے کیے کبھی میرے نقشِ قدم سے آشنا ہوتے تھے گویا اُس کا سفرنامہ پڑھتے ہوئے میں اُس دھندلے خواب میں چلا گیا جو اوائل جوانی میں میں نے دیکھا تھا۔قمر جمیل کا شعر میرے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے کہ:

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کو دکھانا مشکل ہے

آئینے میں پھول کھلا ہے، ہاتھ لگانا مشکل ہے

شبہ طراز نے آئینے میں پھول کھلا دیا ہے اور مجھے دکھا دیا ہے۔اُس کی تحریر میں شاعری کا مدھم بہاؤ بھی ہے اور نثر کے مدھر کرشمے بھی۔ان دونوں کے امتزاج نے ''یورپ میں ۱۹ دن'' کے خواب کو مزید خوابناک کر دیا ہے۔وہ مجھے اس لیے بھی عزیز ہو گئی کہ اُس نے میرے پیار کے پہلے شہر پیرس میں بھی بسیرا کیا تھا اور وہاں مجھے یاد رکھا تھا۔اُس کی تحریر میں سوچ کی ایک خاص متانت شامل ہے اس لیے ''یورپ میں ۱۹ دن'' ایک معمولی نہیں غیر معمولی سفرنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ **مستنصر حسین تارڑ**

اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: صریر پبلی کیشنز، لاہور

...... تلاشِ جمال میں گمشدہ عورت ......

''احساسِ جمال میں گمشدہ عورت'' اپنے نام ہی سے توجہ مبذول کرا لیتا ہے۔فرخندہ شمیم کا یہ تازہ افسانوی مجموعہ ان کے فکر و اظہار کا نمائندہ ہے۔اس مجموعے کی عورت احساسِ جمال تو رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی سیاسی، سماجی، معاشی صورت حال سے بھی نبرد آزما ہے۔فرخندہ شمیم کے یہاں رشتوں کا تقدس پوری طرح موجود ہے لیکن وہ ان کے ٹوٹ جانے پہ دل گرفتہ بھی ہیں۔ان کا نسوائی مزاج خاندان کی جوڑت کی خواہش رکھتا ہے لیکن ان کے اردگرد جو سماجی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے اس سے کنارہ کشی نہیں کرتا۔اس دکھ کا احساس ان کی کہانیوں میں جگہ جگہ موجود ہے۔فرخندہ شمیم سیاسی منظرنامے پر بھی گہری نظر رکھتی ہیں۔طویل عرصہ تک خبر کی دنیا سے منسلک ہونے کے سبب وہ پورے سیاسی سماجی منظرنامے کو جس گہرے تجزیے کے ساتھ دیکھ رہی ہیں اس کے فکری اثرات ان کی کہانیوں میں بھی موجود ہیں لیکن مباحثے کی سطح پر نہیں بلکہ جمالیاتی تہہ داری کے ساتھ۔فرخندہ شمیم کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔طویل فنی ریاضت نے انہیں حلیہ بنانے اور اسے سنوارنے کا جو سلیقہ سکھایا ہے وہ ان کی کہانیوں میں روانی پیدا کرتا ہے۔ان کا اسلوب اور اظہار قاری کو تادیر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔فرخندہ شمیم کی کہانیاں اپنے عہد کی سرگزشت ہیں، ان میں ہم سب زندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان میں ہمارا عہد نہ صرف اپنے نفسیاتی مسائل، اپنی پیچیدہ صورت حال کے ساتھ اپنی پہچان کراتا ہے بلکہ ہمارے ٹوٹتے رشتوں کا المیہ اور عہد کا مکمل سیاسی سماجی اور معاشرتی منظرنامہ بھی موجود ہے۔ **رشید امجد**

اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، دستیابی: عارف فرہاد پبلی شرز، کمال آباد، راولپنڈی۔

...... سدھارتھ ......

ہرمن ہیسے دے لکھے ہوئے ایس مہان ناول ''سدھارتھ'' دیاں ڈھیر ساریاں صفتاں توں وکھ، ایس ناول نوں مُڈھ توں لے کے اوڑک تائیں پڑھن مگروں جیہڑا تاثر اُبھردا اے اوہ اے رہبانیت نی نفی دا تاثر۔اوس رہبانیت دا جیہڑی اج وی بدھ مت، ہندومت اتے مشرق دے ہور کئی دھرماں چ موجود اے۔جیویں کہ دینِ اسلام ایہدی سختی نال لکھیدی کردا اے۔اوویں ای ایس ناول دے مرکزی کردار سدھارتھ دا ہر عمل ایہدی نکھیدی کردا لگا آ وندا اے۔سدھارتھ جدوں گھر چھڈ کے جنگلاں چ آ وندا اے اتے اوتھوں دے سادھواں نوں جیہڑا علم، جیہڑی سکھشا پراپت کروندا، جدوں اوہ وی اوہدے اندر لی تریہہ نوں گھٹ نئیں کر دا تاں اوہ مہاتما بدھ دے چرناں چ آ وندا اے۔اوس عظیم شخص دی مہان سکھشا وی اوہدی تسلی نہیں کر دی۔اوہ مہاتما بدھ جی نوں وی چھڈ کے اودھر توں ٹُر پیندا اے جدھر منکھاں دا پھیرا ٹورا اے۔ **حنیف باوا**

اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: مثال پبلشرز، امین پور بازار، فیصل آباد۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
باقیاتِ و نادرات
فیض احمد فیض